جلد: ۸ جنوری - دسمبر ۲۰۲۱ء شمارہ: ۱-۲

خصوصی اشاعت

ترجمانِ طب

پروفیسر غفران احمد

(۲۵/دسمبر ۱۹۶۴ - ۳۰/اپریل ۲۰۲۱)

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور

وزارت آیوش، حکومت ہند

ISSN 2454-4507

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

پروفیسر غفران احمد

(۲۵ر دسمبر ۱۹۶۴ - ۳۰ر اپریل ۲۰۲۱)

ترجمان طب

(یونانی طب کا ششماہی تحقیقی اردو مجلہ)

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور

وزارت آیوش، حکومتِ ہند

کوٹیگے پالیہ، ماگڑی مین روڈ، بنگلورو۔560091

فون:+91-80-23584260

ویب سائٹ: http//www.nium.in/tarjumane.html

مجلس ادارت

مدیر اعلیٰ

پروفیسر عبدالودود

مدیر

پروفیسر عبدالحسیب انصاری

نائب مدیران

پروفیسر نسرین جہاں

ڈاکٹر عبدالعزیز

معاون مدیران

ڈاکٹر وسیم احمد، ڈاکٹر محمد ارشد جمال

ڈاکٹر صادق علی، ڈاکٹر عبدالمبین

مجلس مشاورت

پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن	علی گڑھ	پروفیسر کنور محمد یوسف امین	علی گڑھ
پروفیسر الطاف احمد اعظمی	دہلی	حکیم محمد خالد صدیقی	دہلی
پروفیسر سید شاکر جمیل	دہلی	پروفیسر عاصم علی خاں	دہلی
پروفیسر نعیم احمد خاں	علی گڑھ	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	دہلی
حکیم وسیم احمد اعظمی	لکھنؤ	پروفیسر محمد ذوالکفل	بنگلورو
ڈاکٹر مختار احمد قاسمی	دہلی	حکیم عبدالباری	دہلی
ڈاکٹر سہیل احمد	مظفر پور	حکیم محمد رضی الاسلام ندوی	دہلی
پروفیسر عابد علی انصاری	بنگلورو	ڈاکٹر محمد اعظم	بنگلورو
ڈاکٹر اشفاق احمد	حیدرآباد	ڈاکٹر امان اللہ	دہلی
ڈاکٹر معراج الحق	دہلی	ڈاکٹر فخر عالم	علی گڑھ
ڈاکٹر شمیم ارشاد اعظمی	الہٰ آباد	ڈاکٹر محمد محسن	علی گڑھ

©

اس شمارے میں شائع شدہ تمام مقالوں کے جملہ حقوق طبع نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن کے حق میں محفوظ ہیں، اس کے مندرجات کی کسی بھی شکل میں طباعت، مائکروفلم یا کسی بھی الکٹرانک میڈیا میں منتقلی سے قبل تحریری اجازت ضروری ہے۔ مقالے کے کسی بھی جزء کی اشاعت مکمل حوالہ درج کر کے ہی کی جاسکتی ہے۔

ترجمان طب کی مجلس ادارت اور مجلس ناظرین نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اس شمارے کے مشمولات غیر مصدقہ نہ ہوں، تاہم کسی غیر مصدقہ اندراج کی ذمہ داری خالصتاً مقالہ نگاروں پر ہی ہوگی۔ مجلس ادارت حسب ضرورت حذف واضافے کی مجاز ہے۔

صدر دفتر

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن

کوٹیگے پالیہ، ماگڑی مین روڈ

بنگلورو-091 560

فون: +91-80-23584260

ای میل: tarjumanetibnium@gmail.com

ویب سائٹ: http://www.nium.in/tarjumane.html

ناشر

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلورو

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن

کوٹیگے پالیہ، ماگڑی مین روڈ

بنگلورو-091 560

مشمولات

☆ عناوین	مقالہ نگاران	صفحات
☆ اداریہ	مدیر اعلیٰ	۵
☆ پروفیسر غفران احمد کی تحقیق ومطالعہ کے نادر پہلو	پروفیسر کنور محمد یوسف امین	۷
☆ پروفیسر غفران احمد: ایک کثیر الجہات شخصیت	پروفیسر عبدالودود	۱۰
☆ طب یونانی کے نقیب: پروفیسر غفران احمد	پروفیسر حکیم نعیم احمد خان	۱۵
☆ پروفیسر غفران احمد مرحوم: [’موت العالم موت العالَم‘]	حکیم وسیم احمد اعظمی	۲۳
☆ آہ! پروفیسر غفران	پروفیسر سید مستحسن علی جعفری	۲۶
☆ تذکرہ ایک مخلص کا	پروفیسر سہیل احمد	۲۸
☆ اسم با مسمیٰ غفران احمد فلاحی	پروفیسر اشہر قدیر	۳۱
☆ بھلا سکے گی نہ یہ خاکِ عنبریں تجھ کو	ڈاکٹر فضل الرحمٰن	۳۵
☆ تجھ سا کہیں کسے!! آہ! ڈاکٹر غفران احمد	پروفیسر محمد سمیع اختر فلاحی	۳۸
☆ علم الادویہ میں ڈاکٹر غفران کی تحقیقی خدمات	ڈاکٹر سید محمد حسان نگرامی	۴۵
☆ دانائے اصول دواسازی: پروفیسر غفران احمدؒ	ڈاکٹر بلال احمد	۴۸
☆ مرحوم پروفیسر غفران احمد علیگ: ایک دیدہ ور شخصیت	پروفیسر غلام الدین صوفی	۵۸
☆ کسوف نیم روز	ڈاکٹر امان اللہ	۶۱
☆ پیکر صدق وصفا: استاذ مرحوم	ڈاکٹر معراج الحق	۶۴
☆ پروفیسر غفران احمد: ایک استاذ کامل	پروفیسر نسرین جہاں	۶۹
☆ تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی	پروفیسر عبدالحسیب انصاری	۷۲
☆ پروفیسر غفران احمد: یادوں کے دریچے سے	پروفیسر کفیل احمد	۸۰
☆ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور	عبداللہ زکریا	۸۳
☆ وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی	ڈاکٹر احمد سعید	۸۵

☆ پروفیسر غفران احمد کے تحقیقی امتیازات	ڈاکٹر وسیم احمد	۸۹
☆ جس کی کتاب زیست کا ہر اک ورق گلاب تھا	ڈاکٹر وسیم احمد	۹۶
☆ آنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اٹھا	ڈاکٹر محمد ارشد جمال	۱۰۵
☆ میرے استاد میرے محسن: پروفیسر غفران احمد	ڈاکٹر شمیم ارشاد اعظمی	۱۱۸
☆ زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی	ڈاکٹر قاضی زید احمد	۱۲۸
☆ جو نازش چمن تھا وہ مستانہ چل بسا	ڈاکٹر عبدالعزیز خان	۱۳۴
☆ جو رُکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ڈاکٹر ایس ایم فیصل اقبال	۱۳۶
☆ پروفیسر غفران احمد مرحوم کی تقدمہ نگاری	ڈاکٹر محمد ارشد جمال، ڈاکٹر ملک عترت، ڈاکٹر عبدالعزیز فارس، ڈاکٹر صادق علی	۱۳۹
☆ بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی	ڈاکٹر شمشاد عالم	۱۴۵
☆ ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم	ڈاکٹر شبیر احمد پرِّے	۱۵۳
☆ زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر	ڈاکٹر خالد اختر علیگ	۱۶۰
☆ آہ! پروفیسر غفران احمد	ڈاکٹر جاوید احمد خان، ڈاکٹر شگفتہ نکہت	۱۶۴
☆ پروفیسر غفران احمد: طبی دنیا کا ایک سنجیدہ اور مخلص طبیب	ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی	۱۶۷
☆ وہ شخصیت جو مری خاک کو سورج بنا گئی	ڈاکٹر محمد شفاعت کریم	۱۷۱
☆ پروفیسر غفران احمد: ایک ہمہ جہت شخصیت	ڈاکٹر محمد شیراز	۱۷۴
☆ کچھ پروفیسر غفران احمد کے بارے میں	ڈاکٹر محمد دانش غنی	۱۷۸
☆ مقدار خوراک رقدر شربت	پروفیسر غفران احمد	۱۸۰
☆ ماءالشعیر (جو کا پانی)	پروفیسر غفران احمد	۱۸۶
☆ ماءاللحم (گوشت کا پانی)	پروفیسر غفران احمد	۱۸۹
☆ اطباء کی سوانح نگاری: فنی ضرورت اور اہم اصول	ڈاکٹر محمد یاسر	۱۹۴
☆ پروفیسر غفران احمدؒ: نقوشِ حیات	ادارہ	۲۰۱
☆ ظلمتِ شب میں تاروں کا پیکر تھا وہ	پروفیسر عابد علی انصاری عابدؔ	۲۰۴

اداریہ

زمانی ادوار کی تقسیم کی متعدد بنیادیں ہیں۔ تاریخ دانوں نے مختلف حوالوں اور منفرد زاویوں سے اس کی درجہ بندیاں پیش کی ہیں جن کی روشنی میں انسانی تہذیب کا جائزہ فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ تہذیب ہی دراصل وہ معاشرتی ترتیب ہے جو ثقافتی تخلیق کو فروغ دیتی ہے۔ تہذیب سماج و معاشرے کی طرز زندگی اور فکر و احساس کی آئینہ دار ہوتی ہے اور زبان، آلات و اوزار، سماجی رشتے، رہن سہن، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، علم و ادب، حکمت و فلسفہ اور فنونِ لطیفہ کے توسط سے نمو پاتی رہتی ہے۔ تہذیب کی تعیین میں مختلف عوامل اپنا کردار ادا کرتے ہیں جن میں اول ترین عامل ارضیاتی حالات ہوتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ تہذیب برفانی ادوار کا درمیانی وقفہ ہوتی ہے جو کسی بھی وقت یخ بستگی کی لہر سے متاثر ہو کر انسانی کارناموں کو برف کی چادر سے ڈھانپ کر اس کی کارکردگی کو محدود کر سکتی ہے۔ ماضی قریب میں کرونا جیسی مہلک وبا کی ہولناکیوں کے سبب انسانی دنیا جس عظیم ارضیاتی ٹوٹ پھوٹ سے دوچار ہوئی ہے اس کے زخموں کی مہک ابھی بھی ہماری مشام جاں کا حصہ ہے۔ اس تغیر نے نہ صرف یہ کہ زمینی سطح پر عالم انسانیت کو شکست و ریخت سے دوچار کیا ہے بلکہ اس نے جغرافیائی عوامل سمیت، تہذیب کے معاشی، سیاسی، اخلاقی، نفسیاتی اور ذہنی عوامل کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مورخین اب انسانی تہذیب کا ماقبل کورونا اور مابعد کورونا کی عینک سے جائزہ لینے پر مجبور ہیں۔

کورونا کی وبا بظاہر اپنا دم توڑ رہی ہے لیکن اس کی وحشت ابھی بھی ہماری رگوں میں سرگرداں ہے۔ شب کے بعد سحر ضرور نمودار ہوتی دکھ رہی ہے لیکن امید کا سورج ہے کہ اب بھی اپنی ٹھٹھرتی ہوئی سانسوں کو بحال کر پانے میں ناکام ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ انسانیت نے عالمی وبا کی شکل میں ایک ایسے ہوا کے جھونکے کو محسوس کیا ہے جو لہو کو منجمد کر دینے پر قادر تھا۔ کوئی بھی تو ایسا نہ تھا جو اس بلا کے آسیب سے محفوظ رہا ہو۔ کیا مشرق و مغرب، کیا شمال و جنوب جدھر دیکھیے ادھر صف ماتم بچھی ہے، ہر کوئی گریہ کناں ہے، ہر سمت ایک اندوہ نارسائی اور ہر طرف ایک انبوہ غم گساراں۔ زندگی کے دریچوں میں آویزاں کتنے ہی چراغ پلک جھپکتے ہی روشنی سے محروم ہو گئے۔ علوم و فنون کے گہوارے یتیم ہو گئے، ادارے اپنے عمائدین سے خالی ہو گئے۔ کیسے کیسے افسر خوباں اور شاہِ شمشاد قداں آن کی آن میں اپنے متعلقین کو روتا بلکتا چھوڑ کر داعی اجل کا ہاتھ تھام کر رخصت ہو گئے۔ چنانچہ ایسی ہی سرو قد شخصیات میں پروفیسر غفران احمد کی ذات عالی صفات بھی تھی جو کورونا کی انسانیت کش وبا کی زد میں آ کر ہمیں داغ مفارقت دے گئی۔ یقینی طور پر ان کی وفات یونانی طبی دنیا کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے جس کی بھرپائی کا تاحال کوئی امکان نظر نہیں آ رہا ہے۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم وفات کے وقت شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں پروفیسر تھے اور صدر شعبہ کے عہدے پر فائز تھے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ ایک مدت تک یہاں انھوں شعبۂ علم الادویہ میں صدر شعبہ کی ذمہ داری نبھائی، نیز بحیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر بھی انتظام کار کی اعلیٰ مثال پیش کی ہے۔ وہ یہاں کی اکیڈمک کمیٹی کے انچارج ہونے کے ساتھ ساتھ

انسٹی ٹیوشنل اینمل اتھِکس کمیٹی کے چیئر مین بھی تھے۔این آئی یو ایم کی ملازمت کے مختصر دورانیے میں انھوں نے شخصی اور ادارہ جاتی سطح پر ایسی بے مثال کارکردگی پیش کی ہے اور ایسے نمایاں کام سرانجام دیے ہیں کہ آج بھی وہ ہر خاص و عام کی یادداشت کا حصہ ہیں۔ پروفیسر غفران احمد کی ذات حقیقی معنوں میں ایک ہمہ جہت پہلو کی حامل تھی۔ وہ ایک بہترین استاذ، اعلیٰ ترین محقق، خوش بیان مقرر اور صاحب طرز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی کریم النفس وخلیق انسان بھی تھے۔ان کی زندگی کا ہر گوشہ انتہائی تابناک اور ہر پہلو بے حد شفاف تھا۔ان کی ذات علمی اور عملی دونوں سطح پر قابل رشک حد تک خوبصورت تھی۔ان کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی روحانی کشش پائی جاتی تھی جو دلوں کو مسحور کر دیتی تھی۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی ابتدائی تعلیم مدرسے سے ہوئی تھی اس بنیاد پر انھیں اردو، فارسی اور عربی زبان پر قدرت حاصل تھی تاہم ان کا اصل کمال یہ تھا کہ انھوں نے اپنی ذاتی محنت ولگن سے انگریزی ادب کی جملہ باریکیوں سے بھی آشنائی حاصل کر لی تھی جس کی وجہ سے وہ یونانی طب کے قدیم سرمایوں پر نگاہ رکھنے کے ساتھ جدید طب کی ادبیات پر بھی ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔ وہ محاذ قلم کے ایک عظیم شہسوار تھے۔ان کی علمی وادبی شخصیت سے تحقیق وتالیف کے ایسے متعدد نادر و نایاب نمونے منصۂ شہود پر آئے ہیں جو تشنگان علم وفن کی سیرابی کا سامان ہیں۔ وہ جہاں ریسرچ وتحقیق کے جدید پیمانوں کو اختیار کرنے کے موید نظر آتے تھے وہیں وہ طب کے کلیاتی اصول ومباحث سے دامن استوار رکھنے پر بھی اصرار کناں تھے۔ان کی علمی حیثیت کا اندزاہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ یونانی طب سے جڑی ہوئی متعدد ملکی و بین الاقوامی کمیٹیوں کے بنیادی اراکین میں شامل تھے نیز انھیں یونانی طب کی تشہیر کے لیے بیرون ممالک میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے بھی موعو کیا گیا۔

پروفیسر غفران احمد کی علمی مرتبت کا سب سے معتبر حوالہ ریسرچ وتحقیق کے تئیں ان کا جنون تھا جو ان کی رگ وپے میں سرایت تھا۔اس ضمن میں ان کی ذات سے تیس سے زائد طبی تحقیقات اور سو سے زائد تحقیقی مقالات منسوب ہیں جو مختلف ملکی وبین الاقوامی رسالوں کی زینت ہیں۔علم الادویہ وعلم الصیدلہ ان کا خاص میدان کار تھا۔ان کی تالیف کردہ کتاب ''اوصافِ ادویہ--ضمانت سے محاسبہ تک'' اپنی نوعیت کی ایک منفرد اور فقید المثال کتاب ہے۔ان کا ایک اور گراں قدر علمی کارنامہ علم الصیدلہ پر مشتمل ان کی کتاب ''اصولِ دواسازی'' ہے جو فی الواقع ان کی عمر بھر کی کمائی ہے۔ بدقسمتی سے یہ کتاب ان کی زندگی میں زیورطبع سے آراستہ نہ ہوسکی۔ہم امید کرتے ہیں جلد یہ اہم تالیف اشاعت کے مراحل سے گزر کر تشنگان علم طب کے لیے فیض کا سامان ہوگی۔ ادارے نے اس کتاب کے چند اہم اسباق کو بہ اجازت اس خصوصی شمارے میں بھی شامل کیا ہے تاکہ طبی دنیا ان کی فکری اُپج اور تحقیقی نہج سے آشنا ہوسکے۔

ترجمان طب کا یہ خصوصی شمارہ پروفیسر غفران احمد مرحوم کی علمی فتوحات، طبی خدمات اور ان کی اخلاقیات کا ایک ادنیٰ سا اعتراف اور مرحوم کے لیے خراج عقیدت ہے۔ادارہ ان تمام افراد کا شکرگزار ہے جنھوں نے اس کی اشاعت میں اپنا قلمی تعاون پیش کر کے شمارے کی توقیر میں اضافہ کیا ہے۔ ساتھ ہی مجلس ادارت اور ناظرین مجلّہ کا بھی شکرگزار ہے کہ ان کی جہد مسلسل سے اس شمارے کی ظاہری وصوری آب وتاب میں اضافہ ہوسکا، رب کائنات سب کو اجر عظیم کا مستحق بنائے۔آمین!

پروفیسر عبدالودود
مدیر اعلیٰ

ISSN:2454-4507

پروفیسر غفران احمد کی تحقیق ومطالعہ کے نادر پہلو

پروفیسر کنور محمد یوسف امین ☆

پروفیسر غفران احمد پچھلی دہائی میں ہندستان گیر سطح پر یونانی طب کے سب سے نمایاں ترجمان اور محققین میں شامل تھے۔ مزید برآں وہ انتہائی ہر دلعزیز بھی تھے۔ سینئر ترین یونانی اساطین سے لے کر طلبہ تک سب ان سے محبت اور تعلق رکھتے تھے، سینئر اور ہم عصروں کا ان کو بحیثیت یونانی محقق تسلیم کرنا نفسیاتی اور پیشہ ورانہ مسابقت کے لحاظ سے ایک گونہ حیران کن امر تھا لیکن قلبی لحاظ سے تعلق رکھنا مزید غیر معمولی معاملہ تھا۔ گو یہ نفسیاتی اور اخلاقی پہلو بھی اہم اور تجزیہ وتوجہ کا طالب ہے لیکن زیر بحث مضمون سے خارج ہے۔

ان کے بیان وتحقیق کے دو حصے ہیں۔ عام طور پر انجام دیا جانے والا کام، اور منفرد کام جو کہ ان کی شخصیت کے ساتھ خاص تھا۔ مروجہ کام میں بھی وہ بہت سنجیدہ، محنتی اور اعلی صلاحیت کے حامل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ: ع

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

کے مصداق ہر چھوٹے بڑے مختلف النوع علمی، تحقیقی، انتظامی اور ذاتی کاموں کو لے کر لوگ ان کے پاس آتے تھے جس کی وجہ سے ان کو محنت شاقہ انجام دینا ہوتی تھی اور سال کے بارہ مہینہ کبھی فرصت کا ایک لمحہ نہیں ملتا تھا۔

لیکن مروجہ کاموں کو بحسن وخوبی اور صدق واخلاص کے ساتھ انجام دینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے کچھ بالکل منفرد اور حامل ندرت کام بھی انجام دیے۔ اس مضمون میں انہیں منفرد اور نادر کاموں کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ مناہج اور تحقیقات نہ صرف منفرد اور اس لحاظ سے خصوصی دلچسپی کے باعث ہیں بلکہ یونانی کے بہتر اور کامل تر مطالعہ اور تحقیق میں فیصلہ کن اور کلیدی پیش رفت (Advancement) کے ضامن بھی ہیں۔ چنانچہ ان کا مربوط اور جامع شکل میں منظر عام پر آنا ضروری ہے تاکہ وہ نہ صرف درسی اور مراجعاتی کتب میں یونانی طب کے بیان کا جزء بن سکیں بلکہ بیش از بیش مثالوں کی دریافت کے قالب اور پروگرام (Template) کے طور پر استعمال کیے جاسکیں۔ نیز ان میں مضمر مناہج کے اخذ اور ان ماخوذات کی بنیاد پر ان سے مشابہ اور متعلق نئے مطالعاتی اور تحقیقی برناموں (Protocols) کے وضع کیے جانے کی بنیاد بھی بن سکیں۔

پروفیسر غفران کے ان منفرد کاموں اور ان کی مثالوں کے بیان سے پہلے ان کے تعلیمی اور تحقیقی پس منظر کو بھی مختصراً بیان کرنا ضروری ہے تاکہ ان کی پیش کشی کے عقب میں موجود معلومات اور صلاحیتیں بھی سامنے رہیں۔

پروفیسر غفران احمد اپنی مادر علمی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اجمل خان طبیہ کالج کے شعبۂ علم الادویہ میں ۱۹۹۷ء میں لیکچرر، ۲۰۰۶ء میں ریڈر، ۲۰۰۹ء میں اسوسیئٹ پروفیسر، ۲۰۱۲ء سے ۲۰۲۱ء تک پروفیسر رہے اور ۲۰۰۷ء تا ۲۰۰۹ء تک یہاں سے ڈیپوٹیشن پر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن (NIUM)، بنگلور میں شعبۂ علم الادویہ میں پروفیسر رہے، نیز ۲۰۰۸ء سے ۲۰۰۹ء تک وہاں پر انچارج ڈپٹی ڈائریکٹر (ایڈمن) بھی رہے۔ ان کی اولین تعلیم عربی، فارسی اور علوم دینیہ میں انجام پائی جو کہ انھوں نے جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ میں دوران فضیلت حاصل کی۔ انگریزی اور سائنس کی تعلیم مسلم یونیورسٹی میں بی یو ایم ایس کے پری طب میں حاصل کی۔ بعد ازاں ایم ڈی یونانی بھی شعبہ علم الادویہ، مسلم یونیورسٹی میں حاصل کی۔ انھوں نے بتایا تھا کہ انہیں دیگر مضامین میں ایم ڈی یونانی کا موقع حاصل تھا لیکن علم الادویہ میں ایم ڈی کا انتخاب اپنی پسند کی بنیاد پر کیا۔ لیکن اس کے متوازی معالجات میں بھی ان کو دلچسپی رہی جس کی غیر رسمی تکمیل وہ اجمل خان طبیہ کالج کے مشاہیر معالجین مثلاً حکیم سید علی حیدر جعفری وغیرہ کی سرپرستی میں کرتے رہے۔ اس طرح پروفیسر غفران نے روایتی اسلامی کلاسیکی زبانوں یعنی عربی فارسی

☆ ایم بی بی ایس، ایم ڈی (فارمیکولوجی)، پروفیسر ان فارمیکولوجی (ریٹائرڈ)، شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش۔ ڈائریکٹر فلاسفی سائنس فورم، ڈائریکٹر
E-mail:kmya55@yahoo.com،Mob.#9837025995۔f.com-www.fika

میں دسترس حاصل کی اور یونانی طب کے ایک ہزار سالہ مصادر تک راست رسائی حاصل کی جو کہ کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے نیز روایتی علوم کے مزاج اور منطق وفلسفہ سے بھی مَس حاصل کیا جو کہ یونانی طب کے کردار اور مزاج اور اصولوں کی تشکیل میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن جن سے واقفیت اور اتصال تقریباً مفقود ہے۔ دوسری جانب انہوں نے انگریزی اور جدید سائنس نیز تحقیق میں خصوصیت سے کام آنے والے Statistics پر بھی بہت اچھی گرفت حاصل کی۔ اس طرح وہ یونانی کے مزاج و کردار کو اچھی طرح سمجھنے کی پوزیشن میں آ گئے اور جدید سائنس سے بیجا مرعوبیت کے بغیر اس کے یونانی سے مناسب ارتباط انجام دینے پر بھی قادر ہو گئے۔

بعد ازاں پروفیسر غفران نے یونانی کلیات کی غلط تعبیر سے نکلنے پر توجہ مرکوز کی (جو کہ بدقسمتی سے قانون عصری اور کلیات عصری وغیرہ کی بدولت بیسویں صدی کے اول سے ہی یونانی طب پر مسلط ہوگئی تھی) اور صحیح تعبیر اختیار کرنے نیز یونانی کی تفہیم اور عملی استعمال کو اس صحیح تعبیر کی بنیاد پر انجام دینے کی جانب راغب ہو گئے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بنی کہ راقم السطور کو بیک وقت روایتی اسلامی فلسفہ اور یونانی کلیات کے مطالعہ اور نتیجتاً کلیات کی مروجہ جدید تفہیم کی غلطی اور صحیح تعبیر کو سمجھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ راقم السطور نے ۲۰۱۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں ایک نیا رخ پیدا کرنے والی ورکشاپ ''فیکا'' کا انعقاد کر کے روایتی فلسفہ کے عصری زبان میں تعارف اور اس کی بنیاد پر یونانی کلیات کی صحیح تعبیر ہی نہیں بلکہ مختلف جدید مضامین مثلاً Physics، Psychology، Law، Literary Theology کا بھی ایک نیا تجزیہ اور نقد نیز ضروری اصلاح و تدبیر کا بیانیہ تیار کیا جس کا بنیادی مصدر ''فیکا قرارداد'' کے نام سے سامنے آیا۔ پروفیسر غفران نے چونکہ راقم السطور کی رہنمائی میں ایم ڈی کا تھیسس ورک کیا اور راقم سے ایک طویل قربت حاصل کی، اس بنا پر انھوں نے یونانی کلیات کی صحیح تعبیر کی بازیافت اور اسی بنیاد پر یونانی کا مطالعہ اور عملی استعمال کیا۔

پروفیسر غفران کا نادر اور جداگانہ کام

۱-ان کے امتیازی کام کا پہلا دائرہ یونانی کلیات کی جدید سوء تعبیر کا نقد و ازالہ اور صحیح تعبیر کی بازیافت پر مشتمل تھا۔ جیسا کہ سطور بالا میں واضح کیا گیا انھوں نے اس دائرہ میں بذات خود تو حصہ نہیں لیا لیکن اس کی تاریخی اہمیت اور یونانی طب کے صحیح فہم اور طبی خزانوں پر کامل دسترس حاصل کرنے کی کلیدی شرط ہونے کو اچھی طرح سمجھا اور راقم السطور کے یونانی کلیات کی صحیح تعبیر کی بازیافت کے کام میں پروف ریڈنگ اور املاء کی درستگی کے جگر سوز کام میں کلیدی کردار ادا کیا، بلکہ اس کام کی تاریخی اہمیت کو سمجھا (جس کا ذکر آگے آ رہا ہے) اور اس اہمیت کے پیش نظر راقم السطور کو مشورہ دیا کہ ڈاکٹر احسان اللہ کے کلیاتی نقد کی تنقید کے علاوہ کلیات کی سوء تعبیر انجام دینے والی اصل اہم کتب مثلاً قانون عصری اور کلیات عصری پر بھی نقد کیا جائے تاکہ مستقبل کا طالب علم کلیات کی سوء تعبیر کے کامل پھیلاؤ سے واقف اور آزاد ہو سکے۔ چنانچہ راقم السطور نے ایسا ہی کیا جو کہ ''نوائے طب وصحت'' الہٰ آباد میں شائع ہونے والے تاریخی مضمون بعنوان ''کلیاتِ طب کی تنقید نہیں بازیافت، بیانِ نو اور تنفیذ درکار ہے'' سے عیاں ہے۔

۲-پروفیسر غفران احمد کے منفرد کام کا دوسرا اہم دائرہ تجرباتی/سریریاتی تحقیق (Clinical/ Experimental Research) کے نتائج (Findings) کی جدید سالماتی (Molecular) توجیہ (Discussion) کے ساتھ یونانی کلیات اور نظریات کی بنیاد پر بھی متوازی توجیہ (Discussion) انجام دینا ہے۔ اس معاملے میں بھی انھوں نے راقم السطور کے وضع کردہ منہج جس کو Dual Protocol کا نام دیا گیا یعنی ایک ہی تحقیق کو مغربی طب اور یونانی طب دونوں کے جداگانہ Parameters کی بنیاد پر بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن پروفیسر غفران احمد نے اس منہج کے نئے نئے اطلاقات (Applications) کیے جس کے کثیر الجہت اور متنوع نمونے پیش کرنے کا موقع ان کو این آئی یو ایم، بنگلور میں ملا جہاں وہ کثیر التعداد ایم ڈی اسکالرس کے سپروائزر بنائے گئے اور ان ایم ڈی اسٹڈیز کو انھوں نے Dual Protocol کی بنیاد پر لکھوایا۔ یہی منہج انھوں نے مسلم یونیورسٹی واپس آنے کے بعد برقرار رکھا۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالرحمان کی Rheumatoid Arthritis میں ''حبِ گلِ آک'' کے اثرات پر انجام دی جانے والی ایم ڈی اسٹڈی بعنوان "Clinical study of Habb-e-Gul-e-Aak preceded by Munzij and Mushil therapy in the management of rheumatoid arthritis" (فروری ۲۰۱۲ء) میں سامنے آنے والے گراں قدر فائدے کے Discussion میں ایک جانب مغربی طب کے سالماتی منہج

کی بنیاد پر اس مرکب میں موجود سالمات کے Pharmacological actions کو نتائج کی توجیہ کی بنیاد بنایا اور دوسری جانب یونانی طب کے کلیات اور اصولوں کو استعمال کیا مثلاً Rhematoid Arthritis میں صبح کے وقت درد میں زیادتی کو برودت کا نتیجہ مانتے ہوئے حب گل آک کے فائدے کو اس مرکب میں موجود حار ادویہ کا نتیجہ قرار دیا گیا نیز اس کے بعض اجزاء کے مسکن الم ہونے اور بعض (مثلاً زنجبیل) کے مخرج بلغم ہونے کو بھی اس دوا کے فائدے کا سبب قرار دیا گیا۔

۳-ان کے منفرد کام کا ایک تیسرا دائرہ بھی ہے جس کی اہمیت علمی اور توجیہی ہونے کے ساتھ ساتھ گراں قدر معالجاتی فائدہ بھی رکھتی ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے اس اہم لیکن دور حاضر میں تقریباً متروک اصول کو زندہ کیا یعنی کہ ایک ہی مفرد یا مرکب جو متعدد اور مختلف النوع امراض میں استعمال کیا جاتا ہے اس کا فائدہ ہر ہر مرض میں ایک خاص انداز سے استعمال کیے جانے پر ہوتا ہے۔ مثلاً اسطوخودوس، صرع میں تین سے پانچ گرام کی مقدار خوراک میں شحم حنظل کے ہمراہ دیے جانے پر بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ یہی اسطوخودوس رعشہ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن وہاں اس کا پورا فائدہ اسی مقدار خوراک میں ایارج فیقراء کے ہمراہ دینے سے ہوتا ہے۔ عملی فائدے سے متعلق اس انتہائی اہم اصول کو دور حاضر میں تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ درسی کتابوں میں مختلف امراض میں دی جانے والی دواؤں کو صرف ایک ہی ترکیب استعمال کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ پروفیسر غفران احمد کا اس اصول کو زندہ کرنا اور اس کی سینکڑوں نہیں تو درجنوں مثالوں کو بیان کرنا یونانی طب کی مؤثریت کو بحال کرنے میں بہت بڑا دخل رکھتا ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر اور اقتداء کی جانی چاہیے۔ نہ صرف ان مثالوں کو جنھیں پروفیسر غفران احمد نے صریحاً بیان کیا ہے تدریسی کتابوں میں شامل کیا جانا چاہیے بلکہ ان کے پیچھے موجود اصول کی روشنی میں مستند مراجع سے ایسی بیش از بیش تفصیلات اخذ کرنے کو ایک اہم تالیفی سرگرمی کے طور پر اختیار کرنا چاہیے۔ اس کام میں سی سی آر یو ایم کو بھی حصہ لینا چاہیے اور ان تمام طبیہ کالجس کو بھی جہاں اعلی تحقیقی اور علمی رجحان موجود ہو۔ خود پروفیسر غفران احمد کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف میں اس دائرے کی تفصیلات کو تلاش کر کے مستقل متن کے طور پر اور تحقیقی مجلوں میں تحقیقی مقالوں کی شکل میں سامنے لایا جانا چاہیے۔ اس نوعیت کے تحقیقی مقالوں کو تیار اور شائع کروانا بہت ہی آسان ہے اور ایک فرد واحد کی دسترس میں آجاتا ہے۔ ان کے اس انتہائی اہم اور منفرد کام کی چند اور مثالیں بھی پیش کرنا دلچسپ ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے واضح کیا ہے کہ بادرنجبویہ کو Mood elevation اور Memory enhancement کے لیے ۳۰۰ ملی گرام کی مقدار میں استعمال کروانا چاہیے لیکن بطور منوم ۹۰۰ ملی گرام کا استعمال کروانا ہوگا۔ انجار بطور حابس ۵ سے ۷ گرام کی مقدار میں استعمال کیا جانا چاہیے لیکن Irritable Bowel Syndrome(IBS) میں اس کی تقریباً نصف مقدار یعنی ۳ گرام استعمال کی جانی چاہیے۔ نیلا تھوتھا، افیون یا جوز ماثل کی overdose میں ۶۰۰ ملی گرام دیا جانا چاہیے لیکن صرع میں صرف ۱۵ سے ۲۰ ملی گرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تفصیلات ان کے شاگرد ڈاکٹر حماد کے پوسٹ گریجویٹ مفردات کی کلاس نوٹس سے لی گئی ہیں جو ۲۰۱۹ء اور ۲۰۲۰ء میں انھوں نے دوران درس طبیہ کالج علی گڑھ میں محفوظ کی تھی۔ اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ پروفیسر غفران احمد کے گراں قدر کام کی بنیاد پر کتابیں اور مقالے تیار کرنے کے لیے ان کے کلاس نوٹس کو بھی استعمال کیا جانا چاہیے۔ البتہ ایسے تمام مندرجات کی مستند مآخذ سے تخریج اور تصدیق کی جانی ضروری ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں پروفیسر غفران احمد کی شخصیت، مقام، مرتبہ اور تعلیم و تربیت کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس مضمون کا اصل حصہ ان کے منفرد کام (جو کہ انتہائی علمی اور معالجاتی اہمیت کے حامل ہیں) کے تین دائروں کو اہم مثالوں کے ساتھ سامنے لانا ہے۔ نیز یہ سفارش بھی پیش کرنا کہ ان دائروں کی باقی ماندہ مثالوں کو بھی تلاش اور شائع کیا جائے اور ان کو تحقیقی مقالوں، کتابچوں اور اہم تدریسی کتابوں کے مشمولات کے طور پر سامنے لایا جانا چاہیے۔ مزید برآں اس نوعیت کی دیگر تفاصیل جن کا احاطہ انھوں نے نہیں کیا انھیں دریافت کرنے کے لیے نئی تحقیقات انجام دی جانی چاہیے۔ نیز اس انداز کے دیگر منفرد اور اہم دائروں کے انکشاف کی کوشش بھی کی جانی چاہیے جو یونانی طب کی مضمحل اور فراموش شدہ عظمتوں کو بحال کر سکیں اور ان نئی عظمتوں کو بھی وجود بخش سکیں جو یونانی طب میں پنہاں تو ہیں لیکن ہنوز عیاں نہیں ہیں۔

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

پروفیسر غفران احمد
ایک کثیر الجہات شخصیت

پروفیسر عبدالودود ☆

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر شے کو ایک دن فنا ہو جانا ہے۔ ہر نفس جس نے سانس کی ڈور سے رشتہ استوار کیا ہے کسی نہ کسی دن اسے زندگی کے بندھن سے آزاد ہو جانا ہے۔ حیات و ممات کا یہ سلسلہ تا قیامت یوں ہی جاری وساری رہے گا۔ انسان اس ازلی صداقت سے واقفیت کے باوجود بعض اوقات ایسی صورت حال سے دوچار ہو جاتا ہے جب وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مدت دراز تک کائنات کی اس سچائی کو جھٹلاتا رہتا ہے اور داعی اجل کو لبیک کہنے والے کے غم کو سینے کا زخم بنا کر پل پل تڑپتا رہتا ہے۔ چنانچہ ماضی قریب میں مجھے بھی اس صورت حال کا سامنا رہا ہے۔ گذشتہ سالوں میں میرے تین دوست پروفیسر غفران احمد، پروفیسر جلیس احمد اور پروفیسر محمد آصف کی یکے بعد دیگرے ناگہانی اموات آج بھی مجھے لرزہ براندام کر دیتی ہیں۔ ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

کووڈ-۱۹ کی عالمی وباء نے انسانی جانوں کے ضیاع کی ایک تاریخ مرتب کی ہے۔ اس کی پے بہ پے متعدد لہروں نے پورے عالم کو تقریباً ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی وجہ سے تہذیب و ثقافت اور معاشرت و معیشت ہر سطح پر انحطاط کی ایک ناقابل بیان داستان رقم کی گئی۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا خطہ ہو جسے اس نے اپنی ہلاکت خیزی سے متاثر نہ کیا ہو۔ کم ہی ایسے خاندان ہوں گے جس کے افراد اس کی زد میں آنے سے محفوظ رہ سکے ہوں۔ ہر فرد کسی نہ کسی سطح پر اس کی مضرت رسانیوں کا شکار ضرور ہوا۔ اس نے علوم وفنون سے جڑی ہوئی بے شمار شخصیات کو جام فنا پینے پر مجبور کر دیا۔ تعلیمی درسگاہوں اور اداروں سے جڑے ہوئے سیکڑوں اساتذہ و ذمہ داران چشم زدن میں پیوند خاک ہو گئے۔ خود میرے ضلع کی کئی اہم علمی شخصیات جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ تھیں کورونا کی دوسری لہر میں دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ اس مہلک وبا نے جہاں متعدد علمی و ادبی شخصیتوں کو لقمہ اجل بنایا وہیں یونانی طب کے کئی اہم ستون بھی اس کی نذر ہو گئے۔ پروفیسر غفران احمد بھی ان میں سے ایک تھے۔ ع

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی ذات پر جب میں نے اس مضمون کو سپرد قلم کرنے کا ارادہ کیا تو درجنوں عناوین میری آنکھوں کے سامنے رقص کناں تھے۔ عام طور سے شخصی تذکرہ نگاری کے لیے کچھ مخصوص سرخیوں جیسے ایک مثالی شخصیت، ایک معروف شخصیت، ایک گوناں گوں شخصیت، علم کی شمع فروزاں وغیرہ کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ چونکہ مرحوم کی شخصیت متنوع اور کثیر الجہات اوصاف کی حامل تھی اور ایسی شخصیتوں کی زندگی کے کسی ایک پہلو کا انتخاب نہیں کیا جا سکتا، اس لیے میں نے بہت غور وخوض کے بعد درج بالا عنوان کا انتخاب کیا ہے۔ یہ عنوان ان کی ہمہ گیر شخصیت کو اجاگر کرتا ہے۔

سوانحی ادب کا ایک ذیلی عنوان تذکرہ نگاری بھی ہے جس میں مذکور کے معائب ومحاسن دونوں کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے لیکن علی العموم منفی خیالات سے پہلو

☆ ڈائریکٹر، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور، کرناٹک۔ E-mail:drwadud87@gmail.com، Mob.No:9916608881

تہی کی جاتی ہے، البتہ کچھ تذکرہ نگار غلو کا شکار ہو جاتے ہیں اور حد سے زیادہ مبالغہ آرائی پر اتر آتے ہیں جس سے عبارت میں تصنع پیدا ہو جاتا ہے، راقم الحروف نے پوری کوشش کی ہے کہ یہ مضمون کسی بھی تصنع، مصلحت پسندی، مبالغہ آرائی اور غلو سے معریٰ و مبرا رہے، یہ خالص ذاتی قسم کے احساسات پر مبنی ہے۔ علامہ اقبال سہیل اعظمی کی ایک مشہور غزل سے ماخوذ یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

اس شعر میں اقبال سہیل نے اعظم گڑھ ضلع میں شامل قصبات اور قرب وجوار کے مضافات میں پیدا ہونے والے بے شمار علماء، محدثین، مفسرین، مؤرخین، ناقدین ادب، شعراء، سائنس داں اور اعلیٰ افسران اور ان کے کارناموں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پروفیسر غفران دراصل اسی ضلع کی تحصیل محمد آباد میں ۱۹۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ بعد ازاں ۱۹۸۸ء میں اعظم گڑھ سے الگ ایک نئے ضلع مئو کی تشکیل کی گئی اور پروفیسر غفران احمد کا آبائی وطن مئو میں آ گیا۔ بایں وجہ مجھے فخر ہے کہ ان کا تعلق میرے ضلع سے تھا۔ جیسا کہ اس مضمون کے عنوان سے ظاہر ہے کہ موصوف کثیر الجہات شخصیت کے حامل تھے لہٰذا ان کے نمایاں اوصاف میں کسی ایک کا انتخاب قدرے دشوار کن ہے۔ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاں اینجا است

لہٰذا یہ طے پایا کہ ان کی زندگی کے منتخب پہلو جیسے عادات و اطوار، ادبی ذوق، علمی کارنامے اور محققانہ ذہن وغیرہ پر مختصراً تبصرہ کیا جائے تا کہ طوالت سے بھی بچا جا سکے۔ پروفیسر غفران احمد کی طبیعت میں بہت سارے اوصاف کی مساویانہ آمیزش تھی جس کی وجہ سے ان کا مزاج ہمیشہ معتدل رہتا تھا۔ ع

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو

نخوت، طمع، حرص، خود پسندی، خودستائی اور اس جیسے اوصاف قبیحہ سے ان کی حیات کبھی بھی عبارت نہیں رہی۔ ان کی پوری زندگی تمام تر خارجی مصنوعی عوامل سے مبریٰ تھی، شعبہ کی صدارت سے انکار خواہ استاد کے لیے ہی ہو، اس کی زندہ مثال ہے۔ جادہ و منزل کے تعین میں ان کے اوصاف حمیدہ اور ہمہ گیر شخصیت نے ان کا تعاون کیا۔ طبی دنیا میں ایسی شخصیات عنقا ہیں جن کے گہرے نقوش اتنی کم عمری میں لوگوں کے دلوں پر ثبت ہوئے ہوں۔ ؎

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

پروفیسر غفران صاحب کی شخصیت کا ایک بڑا حوالہ ان کی منکسر المزاجی ہے۔ یہ قول کہ 'بڑے لوگ زمین پر اکڑ کر نہیں چلتے' کی تمام امکانی صورتیں ان کی ذات میں موجود تھیں۔ وضع داری اور پاسداری کا یہ عالم تھا کہ وہ کبھی ظاہر ہی نہیں ہونے دیتے کہ کسی سے ان کو تکلیف بھی ہوئی ہے۔ پروفیسر موصوف اور راقم الحروف تادمِ حیات یہ طے نہیں کر پائے کہ ہم دونوں میں کون سینئر ہے، ہم دونوں ایک ہی سن میں پیدا ہوئے، ایک ہی ضلع کے رہنے والے تھے، ایک ہی یونیورسٹی اور ایک ہی کالج میں زیر تعلیم تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ یونیورسٹی میں مجھ سے سینئر تھے اور میں کالج میں، اس لیے ہم دونوں ''تو مرا حاجی بگو، من ترا حاجی بگویم'' سے کام چلاتے رہے۔ ہم دونوں کا تقرر بھی نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں ایک ساتھ ہوا، وہ پروفیسر بنے اور میں ریڈر، اس طرح وہ میرے صدر شعبہ بھی قرار پائے۔ حالانکہ بہت جلد ہی ان کو جز وقتی ڈپٹی ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ اس طرح شعبہ کی کئی ذمہ داریاں انھوں نے میرے حوالے کر دیں۔ انھیں کے دور میں شعبہ میں بڑی بڑی مشینیں جیسے HPLC، AAS وغیرہ خریدی گئیں اور CIFL کا وجود عمل میں آیا۔ تقرری کے بعد ہم دونوں ہاسٹل کے ایک کمرے میں ایک ماہ تک رہے لیکن ناگفتہ بہ وجوہات کی بنا پر انھوں نے ایک مکان کرائے پر لے لیا اور ہم دونوں اس مکان میں شفٹ ہو گئے۔ تقریباً نصف سال تک ہم اسی مکان میں رہے لیکن ان کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کبھی مجھے نصف کرایہ نہیں دینے دیا، کہتے تھے میں اکیلا ہوتا تب بھی اتنا ہی کرایہ دیتا۔ بڑی مشکل سے اشیائے خورد ونوش میں میری نصف حصہ داری قبول کی۔ میں کھانا بنانے میں سہولت محسوس کرتا تھا اور وہ باورچی خانہ کی چیزوں کو ان کے مناسب مقام پر رکھنے میں مہارت رکھتے تھے، انھوں نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ میرے صدر شعبہ ہیں۔ جس

مکان میں ہم دونوں رہتے تھے اس میں دو کمرے تھے لیکن میں انھیں کے کمرے میں دوسرے گوشے میں سوتا تھا۔ مجھے نیند میں زور دار خراٹے آتے ہیں جو اکثر لوگوں کے لیے نا قابل برداشت ہوتے ہیں لیکن قربان جایئے پروفیسر موصوف پر انھوں نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میری یہ غیر دانستہ عادت ان پر گراں گزرتی ہے، کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ آپ دوسرے کمرے میں سوئیں۔

کبھی کبھی ان کی بے حد خودداری مجھے اچھی نہیں لگتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ وہ بنگلور میں طویل قیام کے تعلق سے تذبذب کا شکار رہتے تھے اور توشۂ سفر کم کر رکھا تھا اس لیے انھوں نے کچھ ضروری سامان مجھ سے لے لیا تھا لیکن بنگلور سے جاتے وقت وہ تمام سامان نیا خرید کر مجھے دے گئے۔ مجھے اچھا نہیں لگا لیکن میں نے قبول کرلیا کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے، ایک بار اچانک کسی نے ان سے ایک لاکھ مستعار مانگے، کہنے لگے کہ میرے پاس پچاس ہزار ہیں اگر آپ کے پاس ہیں تو آپ دے دیں، میں نے دے دیا، دریں اثنا میں نے ایک موبائل خریدا جس کی قیمت انھوں نے ادا کردی کیونکہ اس وقت میرے پاس پیسے نہیں تھے، جب میرا پیسہ واپس کرنے کا وقت آیا تو انھوں نے مجھے پچاس ہزار لوٹا دئے، میں نے کہا کہ صرف ۴۵/ ہزار واپس کریں، میں نے واقعہ بیان کیا تو کہنے لگے کہ اچھی طرح یاد کرلیں کہ موبائل کی قیمت میں نے ادا کی تھی۔ ایسے اور بھی کئی واقعات ہیں لیکن طوالت کے سبب ان سے گریز کیا جارہا ہے۔

بچوں سے انھیں بہت شفقت تھی، ہمارے فلیٹ کے عقب میں اسی بلڈنگ میں پروفیسر عبدالحسیب انصاری اور محترمہ پروفیسر عصمت شمیم رہتے تھے، جیسے ہی ہم دونوں بلڈنگ میں داخل ہوتے عبدالحسیب کی صاحب زادی علینہ اور عصمت میڈم کے بیٹے حمزہ یہ کہتے ہوئے کہ بڑے ابو آگئے ہمارے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوجاتے، غفران صاحب باہر سے ہی ان کے لیے نمکین اور ٹافی خرید لیتے تھے۔ میں آج تک تذبذب میں ہوں کہ ''بڑے ابو'' صرف غفران صاحب تھے یا ہم دونوں۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش ونگار طاق نسیاں ہوگئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہوگئیں

موصوف کو اردو، عربی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا، ان کا ادبی ذوق بہت عمدہ اور بے مثال تھا۔ عربی زبان کا تو مجھے علم نہیں البتہ اردو اور انگریزی زبانوں میں یکساں بولتے اور لکھتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ علم اندوزی کو زر اندوزی پر فوقیت دی۔ وہ اکثر شاکی رہتے تھے اور مجھ سے کہا کرتے تھے کہ کتنا عجیب دور آگیا ہے کہ علیگ برادران بھی ادبی ذوق سے نا آشنا ہوتے جارہے ہیں۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور سے رخصت ہوتے وقت الوداعی تقریب میں انھوں نے جو کلیدی خطبہ دیا تھا، ادب سے آشنا آج بھی اس سے محظوظ ہورہے ہیں، کچھ لوگ آج بھی اس ظرافت آمیز استعاراتی زبان کو سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں، کاش! کہ ان کی یہ تقریر ریکارڈ ہوئی ہوتی تو اس کے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے۔ لسانی جمالیات کا ایسا بے مثال انداز میں نے ہم عصروں میں نہیں دیکھا۔ ان کی خوش بیانی صرف دم گفتگو ہی اپنا پرتو نہیں دکھاتی تھی بلکہ وہ قلم وقرطاس کے بھی سالار تھے۔ ان کے اسلوب نگارش میں بڑی جاذبیت پائی جاتی ہے، زبان کی شگفتگی، جملوں کے دروبست ان کے ادبی ذوق کے غماز ہیں، جس میں حقیقت پسندی بھی ہے، لطیف طنز اور بے باکانہ انداز بھی شامل ہے اور مبہم اشارے بھی۔ نفس مضمون کی دل پذیری، الفاظ میں تنوع، استعارہ وکنایہ کے تناظر میں بات کرنا ان کی تحریروں کو مزید خوبصورت بنادیتے ہیں۔ 'رازیٔ ہند' مؤلفہ حکیم فخر عالم سے ماخوذ کچھ اقتباسات یہاں بطور حوالہ پیش کیے جارہے ہیں جن میں پروفیسر موصوف استادِ محترم حکیم محمد طیب صاحب مرحوم پر اپنے مضمون ''پروفیسر حکیم محمد طیب'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''جب میرا داخلہ ایم۔ڈی (علم الادویہ) میں ہوا تو مجھے دیکھ کر یہ حیرت ہوئی کہ فائنل ایئر کی کلاس چار اسٹوڈنٹس کے بجائے صرف ایک طالبہ

(شہلا قمر انصاری) کرتی ہیں۔ شہلا بہت ہی ذہین اور با اخلاق خاتون تھیں۔ میں نے ان سے 'لاشریک' ہونے کا راز جاننا چاہا تو انھوں نے بتایا کہ ایڈمیشن ٹیسٹ میں qualifying marks صرف میرے ہی آئے تھے، اس لیے میں 'وحدانیت' سے سرفراز ہوں۔ میں ان پر فی الفور ایمان تو نہیں لا سکا تھا کہ نصف گواہی (بلکہ دعویٰ) فقہی تقاضوں کی تکمیل سے قاصر تھی لیکن جب باریش مفتیوں نے بھی ان کے دعوے کی توثیق و تصدیق کر دی تو یقین آ گیا۔''

شکر ہے یہ جملے تنگ نظر مفتیوں کے ہتھے نہیں چڑھے ورنہ موصوف خود بھی فتوے کا شکار ہو سکتے تھے۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''ہمارے سینئر بیچ (یو جی) میں ایک بار صف اول سے چار طلبہ غائب تھے، یہ چاروں بہت ریگولر، ذہین اور سوال و جواب میں پیش پیش رہتے تھے، پوچھا کہ 'چہار درویش' کہاں ہیں، کسی شوخ نے کہا کہ چائے پینے گئے ہیں، حکیم صاحب کرسی پر بیٹھ گئے (کلاس میں عموماً وہ بیٹھتے نہیں تھے)، حکم دیا کہ بلا کر لاؤ، چاروں طلبہ ڈرے سہمے کلاس میں پہنچے تو حکیم صاحب نے جگر کے مشہور مصرعہ 'جو تم ہی نہ ہوگے تو کیا رنگ محفل' سے ان کا استقبال کیا اور تدریس شروع کر دی۔''

''چہار درویش'' استاد محترم پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کا دیا ہوا نام ہے جو چار طلبہ کی طرف اشارہ ہے جن میں بشمول احقر ڈاکٹر سہیل احمد، ڈاکٹر محمد اکبر فریدی اور ڈاکٹر افضال احمد شامل ہیں۔

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:

''کوئی الوداعی تقریب ہوئی اور نہ ہی ڈپارٹمنٹ کا کوئی فرد ان کی مشایعت کو آیا، جب وہ اپنی کار میں بیٹھے تو انھوں نے بھی شعبہ کے در و دیوار پر ایک آخری نظر ڈالنا مناسب نہ سمجھا، ان کی کار اٹھلاتی ہوئی قدرے سرعت کے ساتھ کالج کے حدود سے باہر چلی گئی، ہم کار کے بنائے ہوئے نیم مدور نشانات کو دیکھتے رہ گئے، ہمیں لگا کہ گل کترنے کا کام خرام یار ہی نہیں راہوار کار بھی کر سکتا ہے۔''

طالب علمی کے زمانے میں احقر کو ایک واہمہ لاحق ہو گیا تھا، وہ یہ کہ ہم عصر اطباء اور ماضی قریب کے فارغین طب میں میری انگریزی بہت بہتر ہے، لیکن جب اونٹ پہاڑ کے نیچے آتا ہے اور مینڈک کنوئیں سے باہر آتا ہے تب اسے حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ چونکہ پروفیسر غفران صاحب طبیہ کالج میں مجھ سے ایک سال جونیر تھے اس لیے ان کے علمی پس منظر کا زیادہ علم نہیں تھا البتہ جب این آئی یو ایم میں بہ شمول پروفیسر موصوف چند اور لوگوں سے سابقہ ہوا تو پتہ چلا کہ ''میاں آپ کون اور آپ کے منہ میں کتنے دانت''، ''کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی؟''۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد
ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی است شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

غیر طبی حلقوں میں یونانی طب کی ترسیل و ابلاغ بعینہٖ نہیں کیے جا سکتے، اس کے لیے رابطۂ عامہ کی عالمی زبان انگریزی کا کماحقہٗ علم ہونا ضروری ہے۔ بالعموم طبی حلقوں میں 'بہ استثنائے چند' یہ فقدان عام ہے۔ جن اطباء نے غیر طبی حلقوں میں اپنا مقام بنایا اس میں ان کی انگریزی دانی کا کافی داخل رہا ہے۔ پروفیسر طیب صاحب کی علمی و معالجانہ صلاحیتیں طلبہ اور عوام کے لیے نفع بخش ضرور تھیں لیکن غیر طبی حلقوں میں ان کی جگہ انگریزی کی وجہ سے بنی۔ پروفیسر غفران صاحب کی بین الاقوامی سطح پر پذیرائی میں جہاں ان کی فنی مہارت کا حصہ ہے وہیں اس میں انگریزی شناسی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ سفر موریشس اس کی بیّن دلیل ہے۔

عام طور پر شخصی تذکرہ نگاری پر ہم عصر یا طلبہ قلم رانی کرتے ہیں لیکن غفران صاحب پر اساتذہ نے بھی لکھا اور خوب لکھا، ہم عصروں میں انھیں سب سے زیادہ شہرت ملی۔

بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال
تونگری بہ دل است نہ بہ مال

غفران صاحب ان دونوں خواص سے متصف تھے۔ گو کہ وہ کبھی بھی سائنس کے طالب علم نہیں رہے لیکن جدید طرز تحقیق اور تجزیاتی جزئیات پر نظر عمیق رکھتے تھے اور بحر ذخار سے در ہائے آبدار تلاش کر کے لاتے تھے۔ علم الادویہ جدیدہ میں وہ پروفیسر کنور محمد یوسف امین صاحب کے علمی وفنی جانشین تھے۔ پروفیسر امین کے تمام شاگردوں میں غفران صاحب نے ہی ان سے سب سے زیادہ استفادہ کیا۔ علم الادویہ کے تحقیقی مناہج میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا، انھوں نے ایک بڑے طبی جمود پر ضرب لگائی۔ اگر گردش ایام کو بہت پیچھے کی طرف نہ لوٹایا جائے تو طب میں دو گروہ اکثر متصادم نظر آتے ہیں اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ یہ دونوں ہی اپنی انتہا پر ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک یونانی طب میں کسی بھی قسم کی جدید تحقیق نہ صرف بے معنیٰ ہے بلکہ طب کے شاکلہ کے لیے نقصان دہ بھی ہے، دوسرا گروہ جدید طبی تحقیق سے یونانی کو اوج ثریا پر مقیم دیکھنا چاہتا ہے۔ پروفیسر غفران صاحب نے ان دونوں کے درمیان حائل خلیج کو پر کرنے کی کوشش کی۔ پروفیسر یوسف امین صاحب اس قسم کی تحقیق کی ستائش کیا کرتے۔ غفران صاحب تحقیقی پیپر کو تصنیف وتالیف پر فوقیت دیتے تھے۔ میں نے کئی بار اصرار کیا کہ طلبہ کے لیے ایسی کتابیں لکھیں جو اُن کی عملی ضروریات کی تکمیل کر سکیں، اگر آپ جیسے لوگ ایسا نہیں کریں گے تو بازار میں غیر معیاری کتابیں آتی رہیں گی، کہتے تھے کہ مجھے کتابیں لکھنے سے ڈر لگتا ہے کیونکہ میں دوسروں کی کتابوں پر تنقید کرتا ہوں، کہیں میں ہدف تنقید نہ بن جاؤں اور میں کہتا تھا کہ اچھا لکھنے والوں نے اس لیے گوشۂ عافیت اختیار کر لیا ہے تا کہ نفرت کے کرب سے بچ سکیں۔ البتہ ان کی کتاب ''اصول دواسازی'' جس کے کچھ حصوں کی پروف ریڈنگ میں نے بھی کی ہے، جو ان کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے، ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی، اگر یہ کتاب شائع ہو جائے تو طلبہ کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کر سکے گی۔

اللہ سے دعا ہے کہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین!

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

☆☆☆☆☆

تعزیتی پیغام

''پروفیسر غفران کو ان کی نفیس شخصیت، سخت نظم وضبط، طلبہ کی نگرانی اور سب سے بڑھ کر ایک پُر جوش استاد کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کے انتقال سے یونیورسٹی برادری ایک ممتاز استاد سے محروم ہوگئی ہے جن کا یونانی طب کی تدریس کے میدان میں خاص حصہ تھا۔ پروفیسر غفران کا انتقال میرا ذاتی نقصان ہے۔''

(پروفیسر طارق منصور، شیخ الجامعہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

ISSN:2454-4507

یونانی طب کے نقیب

پروفیسر غفران احمد

پروفیسر حکیم نعیم احمد خان ☆

یونانی طب کے نقیب، بے شمار اوصاف حمیدہ کے مالک اور کثیر الجہات صفات کے علَم بردار پروفیسر غفران احمد کی پیدائش ضلع اعظم گڑھ کے ایک علمی اور مذہبی خانوادہ میں ۲۵ر دسمبر ۱۹۶۴ء کو ہوئی ان کا آبائی وطن محمد آباد گوہنہ ہے جو کہ اُس وقت اعظم گڑھ ضلع میں تھا لیکن اب ضلع مئو میں آ گیا ہے۔ آپ کا ننہال بلریا گنج کے پاس ہی ایک گاؤں نصیر پور میں ہے آپ کے والد ماجد جناب مسعود احمد صاحب مرحوم ایک نہایت شریف النفس اور خوش طبع شخص تھے ان کا شمار علاقہ کی چند معروف شخصیات میں ہوتا تھا والد محترم کے اعلیٰ اوصاف کافی حد تک ان میں موجود تھے۔ والد محترم جماعت اسلامی کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے تحریک کا کام بھی بہت تندہی سے کیا کرتے تھے۔ غفران احمد کی ابتدائی تعلیم و تربیت دینی ماحول میں گھر پر ہی ہوئی اور باقاعدہ تعلیمی سلسلہ کا آغاز جامعۃ الفلاح سے ہوا اور ۲۵ر نومبر ۱۹۷۴ء میں آپ نے درجۂ چہارم میں داخلہ لیا۔ آپ نے ابتدا سے ہی پورے جذبے اور محنت کے ساتھ اپنی تعلیمی سفر کو آگے بڑھایا اور ہمیشہ امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوتے رہے، آپ شروع سے ہی اپنے اخلاق حسنہ کی وجہ سے اور ایک محنتی طالب علم کی حیثیت سے اساتذہ اور رفقاء کے درمیان بے حد مقبول تھے، اپنے اساتذہ کا احترام اور ان سے عقیدت ان کے اخلاق کا حصہ تھی جس کا میں خود معترف ہوں۔ اپنے ہم عصر طلبہ ساتھیوں کے ساتھ مشفقانہ رویہ رکھتے تھے لہٰذا ان کے درمیان بھی یکساں مقبول تھے، پڑھنے لکھنے میں دلچسپی ان کی فطری عادت تھی لہٰذا آپ کو درسی کتب کے ساتھ ساتھ غیر درسی کتابوں کے مطالعہ کا بھی کافی شوق تھا۔ جن اساتذہ سے آپ نے ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ان کی فہرست تو کافی طویل ہے مگر ان میں سے چند نمایاں قابل ذکر اساتذہ کے نام اس طرح ہیں۔ مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ، مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ، مولانا صغیر حسن اصلاحیؒ، مولانا نظام الدین اصلاحیؒ اور ماسٹر عبداللہ صاحب۔ ان اساتذہ نے آپ کو دینی و عصری تعلیم سے مزین کیا اور آپ کی بہترین آبیاری کی۔

اس طرح سے آپ کی ابتدائی، ثانوی اور پھر اعلیٰ تعلیم کا سفر ۲۳ر فروری ۱۹۸۳ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا اور پھر آپ نے عالمیت کی سند کے ساتھ مزید اعلیٰ تعلیم کی جستجو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رُخ کیا۔

پروفیسر غفران احمد جامعۃ الفلاح سے عالمیت سے فراغت کے بعد علی گڑھ آ گئے اور اس وقت چونکہ مدارس کے طلبہ بی اے کے دیگر مضامین میں بھی میرٹ کے اعتبار سے براہ راست داخلے کے اہل ہوتے تھے چنانچہ ۱۹۸۳ء میں آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پہلے بی اے (اکنامکس) میں داخلہ لیا اور امتیازی نمبرات سے گریجویشن مکمل کیا۔ دوران طالب علمی آپ کا قیام وقار الملک (وی ایم ہال) کے جوبلی ہوسٹل میں تھا۔ اکنامکس سے بی اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۸۵ء میں آپ کا داخلہ پری طب (بی یو ایم ایس) کورس میں ہو گیا اور پھر وہیں سے آپ نے اپنی پوری زندگی طب کی خدمت کے لیے وقف کر دی اور طب کے افق پر ابھی پوری طرح سے روشنی بکھیر بھی نہیں پائے تھے کہ ربِّ کائنات کی طرف

☆ سابق ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، سابق صدر شعبۂ علم الادویہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اتر پردیش۔ Email:hkmnaeemkhan@gmail.com،Mob.No:9412509832

سے بلاوا آ گیا اور آپ نے اچانک اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ دوران طالب علمی آپ کا شمار ایک ہونہار اور سنجیدہ طالب علم کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں حد درجہ دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ بیشتر اوقات آپ درسی کتب کے ساتھ ساتھ دوسری غیر درسی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے تھے یہی وجہ تھی کہ آپ کو اپنے طب کے مضامین میں تو دسترس حاصل تھی ہی ساتھ ہی دوسرے مضامین میں بھی آپ گہری صلاحیت رکھتے تھے چنانچہ کسی بھی عنوان پر اگر آپ سے علمی بحث ہوتی تو آپ سامنے والے کو مطمئن کر دیتے تھے خواہ وہ ادب سے متعلق ہو سیاسیات، معاشیات سے یا پھر جدید سائنس سے گویا آپ ہر میدان میں خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔ کتابوں کے مطالعہ کے علاوہ آپ کی تحریری صلاحیتیں بھی کمال درجہ کی تھیں چنانچہ آپ کے مضامین دوران طالب علمی میں بھی مختلف عالمی اور قومی جرائد اور میگزین میں شائع ہوتے تھے۔ آپ اپنے حسن کردار اور بذلہ سنجی کی وجہ سے اپنے ہم عصر طلبہ ساتھیوں اور اساتذہ کے درمیان بے حد پسندیدہ تھے تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ اپنی صحت کے لیے بھی کافی حسّاس تھے چنانچہ آپ مختلف کھیلوں میں بھی مستعدی کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ آپ نے ۱۹۹۲ء میں بی یو ایم ایس کا کورس بھی بحسن وخوبی مکمل کر لیا۔ بی یو ایم ایس کے دوران طالب علمی آپ کے قریبی ساتھیوں میں ڈاکٹر مظفر الاسلام، ڈاکٹر شعیب احمد، پروفیسر بدر الدجیٰ خان، پروفیسر تنزیل احمد، پروفیسر تفسیر علی، پروفیسر جلیس احمد، ڈاکٹر حافظ صباح الدین، ڈاکٹر محمد عارف اصلاحی، ڈاکٹر ظفر الحق، ڈاکٹر مرغوب احمد انصاری، پروفیسر عابد علی انصاری اور ڈاکٹر حافظ ارشاد (سابق ایم ایل اے) قابل ذکر نام ہیں۔ اس کے بعد آپ نے ایم ڈی میں داخلہ کے لیے مسابقتی امتحان میں حصہ لیا اور پہلی ہی کوشش میں آپ نے کامیابی حاصل کر لی اور پھر آپ نے اپنی پسندیدہ شاخ یعنی شعبۂ علم الادویہ میں داخلہ لیا ایم ڈی کے دوران تعلیم آپ نے یونانی طب میں قابل قدر ریسرچ وتحقیق کا کام کیا اور آپ نے مشہور یونانی مرکب جواہر مہرہ کی اہمیت اور مختلف قلبی امراض میں اس کی افادیت پر ایک اہم تحقیقی کام کیا۔ ریسرچ وتحقیق پر مشتمل یہ تین سالہ کورس بھی الحمدللہ ۱۹۹۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا اور آپ نے علم الادویہ میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔ ایم ڈی کے دورانِ طالب علمی شعبۂ علم الادویہ میں آپ کے علاوہ دیگر رفقاء میں پروفیسر طارق احسن، پروفیسر جلیس احمد اور ڈاکٹر محمد تقی کا نام قابل ذکر ہے ان میں پروفیسر طارق احسن اس وقت ممبئی کے انجمن اسلام طبیہ کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی وتحقیقی خدمات انجام دے رہے ہیں جب کہ پروفیسر جلیس احمد زیڈ وی ایم طبیہ کالج، پونہ میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں، پروفیسر جلیس احمد کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ حسن اتفاق سے وہ پروفیسر غفران کے ابتدائی تعلیم یعنی جامعۃ الفلاح سے ہی آپ کے ہم جماعت رہے ہیں اس کے بعد بی یو ایم ایس اور پھر ایم ڈی کی تعلیم بھی دونوں نے ایک ساتھ مکمل کی۔ اس طرح سے آپ دونوں پورے تعلیمی سفر کے ساتھی تھے۔ قسمت دیکھیے کہ آخرت کے سفر پر بھی دونوں ایک ساتھ (تھوڑے سے زمانی فرق کے ساتھ) روانہ ہوئے۔ اساتذہ کی فہرست میں حسن اتفاق سے مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے آپ کو یو جی سطح پر اور اس کے بعد پھر ایم ڈی میں بھی پڑھایا ہے اور ان کے تحقیقی مقالہ میں بحیثیت معاون سرپرست کے بھی میرا براہ راست تعلق تھا۔ لہٰذا میں نے ان کی تعلیمی صلاحیتوں کا مشاہدہ تو پہلے ہی کر لیا تھا لیکن ان کی تحقیقی و تخلیقی لیاقت نے بعد میں مجھے مزید متاثر کیا، دیگر اساتذہ میں حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب، حکیم سید ایوب علی قاسمی صاحب، پروفیسر محمد آصف صاحب، پروفیسر سعد الحسن آفاق صاحب اور پروفیسر کنور محمد یوسف امین صاحب بھی قابل ذکر ہیں جن سے آپ نے طب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تہذیبی اقدار وآداب بھی سیکھا جو ان کی عملی زندگی میں ان کے عادات واوصاف پر منعکس تھیں۔

۱۹۹۵ء میں جب آپ نے اپنی ایم ڈی کی تعلیم مکمل کر لی تو ۲۷/اکتوبر ۱۹۹۵ء کو آپ رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو گئے اور آپ کا عقد آپ کے رشتہ ہی میں محترمہ صوفیہ خاتون سے ہوا اس طرح سے آپ کی ازدواجی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ آپ کی اہلیہ بھی ایک علمی خانوادہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ پروفیسر غفران کے وارثین میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹوں میں سب سے بڑے بیٹے کا نام فارض امان (نصران) ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی

تعلیم مکمل کرنے کے بعد فی الحال الٰہ آباد کے ایک مینجمنٹ انسٹی ٹیوٹ سے ایم بی اے (سال اول) کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دوسرے نمبر پر ریان احمد ہیں جنھوں نے حال ہی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے 2+10 کے مسابقتی امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے اور سائنس اسٹریم (بائیولوجی) میں داخلہ لیا ہے۔ اس سے پہلے ریاّن نے اوایل ایف علی گڑھ سے دسویں جماعت تک کی تعلیم حاصل کی۔ سب سے چھوٹی اولاد کے طور پر ایک بیٹی ہے جس کا نام ہبہ رمّان ہے ہبہ فی الحال اوایل ایف علی گڑھ میں ہی نویں جماعت کی طالبہ ہیں۔

عملی زندگی

پروفیسر غفران احمد کی پہچان ابتداءِ تعلیم سے ہی ایک ذہین اور محنتی طالب علم کی حیثیت سے تھی چنانچہ آپ کی صلاحیت اور یونانی طب کے میدان میں آپ کی لیاقت کو اس وقت ایک مستحکم حیثیت حاصل ہوگئی جب آپ کے تعلیم مکمل کرتے ہی جہاں آپ کے بہت سے رُفقاء ذریعۂ معاش کی تلاش میں ملک و بیرون ملک کے طول وعرض میں پھیل گئے وہیں آپ کا مادرِ علمی میں ہی پہلے عارضی طور پر پھر ۲۷رجنوری ۱۹۹۷ء کو مستقل طور پر شعبۂ علم الادویہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر کے تقرر عمل میں آیا۔ جس انتخابی کمیٹی میں آپ کا لیکچرر کے عہدہ پر تقرر ہوا تھا اس وقت ڈاکٹر محمود الرحمٰن صاحب جیسا غیر متعصب اور غیر جانب دار شخص علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ کے عہدہ پر فائز تھا اور اتفاق سے میں فیکلٹی آف یونانی میڈیسن کے ڈین اور شعبۂ علم الادویہ کے صدر کی حیثیت سے اس سلیکشن کمیٹی میں شریک تھا۔ مجھے دوران تدریس ہی غفران کی ذہانت اور ان کی مدبرانہ صلاحیتوں کا احساس ہوگیا تھا۔ اس کے بعد پوسٹ گریجویشن میں تو پھر ان کی فکری اور تحقیقی صلاحیتوں کو بہت ہی قریب سے میں نے مشاہدہ کیا لہٰذا میں نے سوچا کہ اگر غفران کا تقرر شعبہ میں بحیثیت استاد کے ہوجائے تو شعبہ اور فیکلٹی کے حق میں بہتر ہوگا چنانچہ پروفیسر غفران کے انٹرویو اور ان کی صلاحیت سے خود شیخ الجامعہ کافی متأثر ہوئے اور مجھے بھی ڈین وصدر شعبہ کی حیثیت سے اس سلیکشن کمیٹی کا ممبر ہونے کا شرف حاصل تھا اور اس پر مجھے فخر ہے کہ یہ میری زندگی کا ایک اچھا اور صحیح فیصلہ ثابت ہوا جس کی بدولت آپ کا تقرر اور حسن انتخاب عمل میں آیا۔ جسے بعد میں آپ نے اپنی صلاحیتوں سے ثابت بھی کر دیا کہ آپ کا انتخاب آپ سے توقع اور امید کے عین مطابق بلکہ اس سے بھی کہیں بہتر ثابت ہوا۔ چونکہ پروفیسر غفران دوران طالب علمی سے ہی پڑھنے لکھنے کے بیحد شوقین تھے چنانچہ طب کے تمام مضامین کا بہت ہی سنجیدگی اور پورے جذبے وانہماک کے ساتھ مطالعہ کیا تھا یہی وجہ تھی کہ طب کے تعلق سے آپ کی معلومات کافی وسیع تھیں لہٰذا اس کا عکس آپ کی تدریس پر نمایاں طور پر ظاہر ہوتا تھا، آپ بی یو ایم ایس کی سطح پر صیدلہ (یونانی فارمیسی) پڑھاتے تھے جب کہ پوسٹ گریجویشن یعنی ایم ڈی میں آپ ریسرچ میتھوڈولوجی اور صیدلہ وتکلیس کے ساتھ ساتھ ادویہ مفردہ مع جدید اضافات خصوصیت کے ساتھ پڑھاتے تھے، طلبہ سے اکثر سننے میں آتا تھا کہ پروفیسر غفران کی تدریس سے طلبہ کافی متأثر تھے جب آپ کلاس میں داخل ہوتے تو پوری کلاس پر ایک سکوت طاری ہوجاتا اور ہر طالب علم آپ کے لکچر کو پوری مستعدی اور خاموش ہوکر سنتا اور طلبہ کی یہ خواہش ہوتی کہ آپ کے لکچر کو حرف بہ حرف قلم بند کرلیا جائے۔ ہر ایک مضمون کو آپ بہت ہی سلیس اور مؤثر انداز میں پڑھاتے تھے یونانی نظریہ کے ساتھ ساتھ آپ سبجیکٹ کو جدید سائنسی پہلوؤں سے ہم آہنگ کر کے اسے بہت وسیع اور دلچسپ بنا کر طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جلد ہی آپ نے اپنے شاگردوں اور معاصرین میں ایک قابل قدر مقام بنالیا اور ان کے درمیان یکساں محبوب اور پسندیدہ بن گئے تھے۔ شعبہ میں لیکچررشپ کے بعد کا میرا اور غفران احمد کا سفر ۲۴رسال پر مشتمل ہے یہ میرے ہمنوا ہونے کے ساتھ ساتھ میرے معتمد بھی تھے، اے ایم یو ٹیچرس ایسوسی ایشن کی صدارت کے الیکشن میں پروفیسر غفران نے جس جذبے اور دلچسپی کے ساتھ میرے الیکشن میں حصہ لیا اس سے میرے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے جب کہ وہ یونیورسٹی کی سیاسی سرگرمیوں میں کم ہی دلچسپی لیتے تھے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں بحیثیت پروفیسر تقرر

پروفیسر غفران شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

میں لیکچرر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے تھے کہ اسی دوران ۲۶ رنومبر ۲۰۰۷ء میں ایک مرتبہ پھر آپ کی تدریسی لیاقت اور محققانہ و مدبرانہ صلاحیت کے اعتراف میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن (NIUM)، بنگلور میں براہ راست لیکچرر سے پروفیسر کے عہدہ پر آپ کا تقرر ہوگیا چنانچہ آپ مادر علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فرائض سے رخصت لے کر بنگلور چلے گئے اور وہاں پروفیسر کی حیثیت سے اپنی خدمات شروع کیں۔ بنگلور میں بھی آپ نے اسی جذبے اور محنت سے ریسرچ و تحقیق کے میدان میں کام کیا اور اپنے معاصرین کو اپنی صلاحیت اور کام سے کافی متاثر کیا۔ بنگلور میں قیام کے دوران ہی مادر علمی علی گڑھ میں ایک انتخابی کمیٹی کے ذریعہ آپ کے سابقہ تدریسی و تحقیقی تجربات کو تسلیم کرتے ہوئے، ۲۷ رجنوری ۲۰۰۶ء سے آپ کی ریڈر کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ بنگلور میں آپ کا قیام بہت مختصر رہا اور تقریباً دو سال وہاں گزارنے کے بعد کچھ گھریلو وجوہات اور پنشن کے تحفظ کی وجہ سے آپ نے ۲۹ رنومبر ۲۰۰۹ء میں پروفیسر شپ سے مستعفی ہوکر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دوبارہ واپس آگئے اور اسوشیئٹ پروفیسر کے عہدہ پر اپنی تدریسی اور تحقیقی خدمات کو آگے بڑھایا۔ مختصر سے قیام میں آپ نے بنگلور میں بہت سارے یادگاری کارنامے انجام دیے، نیشنل انسٹی ٹیوٹ میں شعبہ کی سربراہی کے ساتھ ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدہ پر بھی فائز رہے اور دیگر بہت ساری مقامی اور بیرونی کمیٹیوں کے ممبر کی حیثیت سے بھی آپ نے انسٹی ٹیوٹ کی خدمت کی۔ غرضیکہ آپ نے ایک مختصر وقفہ میں ادارہ اور وہاں کے طلبہ کے لیے بہت سارے مثبت کارہائے نمایاں انجام دیے اور کئی سارے یادگاری نقوش چھوڑ آئے جو بعد والوں کے لیے ایک مثال اور مشعل راہ ثابت ہوئے۔ چنانچہ جب آپ نے وہاں سے آنے کا قصد کیا تو وہاں کے طلبہ اور آپ کے معاصرین کے درمیان ایک بے چینی سی پیدا ہوگئی اور ان لوگوں نے آپ کو بہت روکنا چاہا اور طرح طرح کے واسطے دیے کہ آپ کے اس مختصر دورانیہ میں انسٹی ٹیوٹ نے کافی ترقی کی اور مختلف جہات میں بے شمار کام ہوا ہے۔ اگر آپ مزید اپنی خدمات جاری رکھیں گے تو بلاشبہ یہ ادارہ ایک نمایاں اور اعلیٰ مقام حاصل کرے گا۔ مگر دو وجوہات کی بنا پر مجبوراً آپ نے بنگلور چھوڑنے کا ارادہ کیا حالانکہ آپ بارہا تذکرہ کیا کرتے تھے کہ بنگلور میں کام کرنے اور ریسرچ و تحقیق کے بہت مواقع ہیں اور وہاں کا ماحول اور موسم بھی کافی موزوں اور سازگار ہے لیکن میں نے صرف دو وجہوں سے بنگلور چھوڑا ایک فیملی کی وجہ سے کیونکہ بچے چھوٹے تھے اور وہ لوگ علی گڑھ میں ہی مقیم تھے اور دوسری وجہ پنشن سے جڑی تھی۔ بنگلور میں آپ کا تقرر نئی پنشن (NPS) کے حساب سے ہوا تھا جب کہ علی گڑھ میں آپ پرانی پنشن کے زمرے میں آتے تھے۔ بہرحال انسان کے اندر اگر صلاحیت ہو اور اسے کچھ کرنے کا حوصلہ اور جذبہ ہو تو اس کے لیے پھر زمان و مکان کی قید و بند معنی نہیں رکھتی ہیں۔

علی گڑھ واپسی

آپ نے بنگلور سے واپس آنے کے بعد مادر علمی میں اپنے تدریسی و تحقیقی امور کو مزید رفتار دی۔ آپ کو حکومت ہند کے کئی پروجیکٹ حاصل تھے، کئی پروجیکٹ میں تو آپ نے میرے ساتھ بھی کام کیا ہے جو یونانی ادویہ کی معیار بندی اور ان کی اصلیت کو جدید سائنسی معیار پر مطالعہ کرنے سے متعلق تھے اس مطالعہ کا مقصد ادویہ کو مؤثر بنانے نیز دواؤں کی افادیت کو مختلف امراض میں جدید سائنسی معیار پر ثابت کر کے ان کو عوام کے سامنے پیش کرنا تھا۔ چنانچہ آپ نے اس میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی اور آپ نے حکومت کے زیر انتظام منصوبوں کو کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ جنوری ۲۰۱۲ء میں آپ کا اپنی ترقی کی آخری منزل یعنی پروفیسر شپ کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ آپ نے اپنے ۲۴ رسالہ تدریسی و تحقیقی تجربات میں لاتعداد اور اپنی نوعیت کے نت نئے کام انجام دیے۔ اس کے علاوہ آپ کے زیر نگرانی بہت سارے طلبہ نے اپنے تحقیقی کام انجام دیئے۔ تقریباً ۳۸ رطلبہ نے آپ کے زیر نگرانی طب کے مختلف موضوعات پر ریسرچ و تحقیق کا کام انجام دیا۔ آپ کی ایک اہم کتاب اور مختلف کتابی ابواب عالمی معیار کے پبلشر کے ذریعہ شائع ہوئے ہیں، اس کے علاوہ ۱۰۰ سے زائد آپ کے ریسرچ پیپر اور مقالے مختلف عالمی اور قومی اعلیٰ معیاری جرائد اور میگزین میں شائع ہوئے ہیں۔ لاتعداد عالمی اور ملکی کانفرنسز اور سمینارس میں آپ نے شعبہ اور یونیورسٹی کی نمائندگی کی

ہے۔سیکڑوں کانفرنسز اور علمی نشستوں میں آپ نے سائنٹفک اجلاس کی صدارت کی ہے، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) سے حاصل شدہ ایک اہم پروجیکٹ ڈی آر ایس۔۲(DRS-II) کے کوآرڈینیٹر کا شرف بھی آپ کو حاصل تھا جو شاید ہی کسی یونانی طب کے ادارہ کو نصیب ہو۔ یہ اسکیم پوری یونیورسٹی میں صرف دو یا تین شعبہ جات کو حاصل ہے۔اس کے ساتھ ہی آپ متعدد اہم کمیٹیوں کے ممبر بھی تھے مثلاً

☆ وزارت آیوش، حکومت ہند کے ماتحت فارما کوپیا کمیٹی کے ممبر

☆ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں یونانی میڈیسن کی ابتداء کیے جانے سے متعلق کمیٹی کے ممبر

☆ جامعہ ہمدرد، نئی دہلی، بورڈ آف ریسرچ اسٹڈیز کے ممبر

☆ NIUM بنگلور، میں ادارہ جاتی تحقیقی اخلاقیات کمیٹی کے ممبر

☆ NIUM بنگلور، میں حیوانی تحقیق کے اخلاقیات کمیٹی کے صدر

☆ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں حیوانی تحقیق کے اخلاقیات کمیٹی کے ممبر

☆ انڈین فارماکولوجیکل سوسائٹی کے ممبر

☆ سی ایس آئی آر، ٹی کے ڈی ایل، نئی دہلی، ٹاسک فورس ممبر

☆ فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ریسرچ کوآرڈینیشن کمیٹی کے ممبر

☆ وزارت آیوش، حکومت ہند کے ذریعہ آیورویدا اور یونانی امراض کی بین الاقوامی درجہ بندی کیے جانے سے متعلق کمیٹی (کمیٹی برائے روایتی طب) کے ممبر

☆ عالمی ادارۂ صحت (WHO) کے ذریعہ تشکیل دی گئی ایک ڈرافٹ کمیٹی جو کہ بنیادی طور پر یونانی طب کی اصطلاحات مرتب کرنے کے لیے بنائی گئی ہے اس میں ایک Expert Member کی حیثیت سے آپ کا نام شامل ہے۔

غرض یہ کہ یونانی طب سے متعلق بیشتر اہم کمیٹیوں کے ممبر تھے۔

متعدد اہم قومی و بین الاقوامی جرائد اور میگزین کے ایڈیٹر، اسوشئیٹ ایڈیٹر اور ممبر مجلس ادارت کی حیثیت سے بھی آپ کی خدمات حاصل تھیں۔ اسی طرح بہت سارے عالمی اور قومی معیار کے جرائد اور رسالہ جات کے ریویور کی حیثیت سے بھی آپ کا نام سرِ فہرست ہے۔آپ فیکلٹی آف یونانی میڈیسن کی جانب سے شائع ہونے والے عالمی جرنل یونانی میڈیکس کے اسوشئیٹ ایڈیٹر بھی تھے جسے اچھے اور معیاری مضامین کے ساتھ پابندی سے شائع کرنا ایک اہم فریضہ تھا جس کو آپ نے دیگر معاونین کے ساتھ مل کر بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رکھا۔

۲۰۱۵ء میں جب میں دوبارہ فیکلٹی کے ڈین کے عہدہ پر فائز ہوا تو پروفیسر غفران نے مجھے ایک بہت ہی قیمتی اور موزوں مشورہ دیا کہ سراب تک فیکلٹی کے تمام شعبہ جات میں جو تحقیقی کام ہوئے ہیں انھیں یکجا کر کے اگر ایک کتابی شکل دے دی جائے تو میرے خیال سے یہ مستقبل کے لیے بہت مفید اور کارآمد مسودہ ثابت ہوگا۔ چنانچہ مجھے ان کی یہ تجویز کافی پسند آئی میں نے ان کی اس تجویز کو تسلیم کرلیا اور اس کام کو ان کے حوالہ کردیا کہ آپ سے بہتر اور موزوں کون ہوسکتا ہے چنانچہ ان ہی کی کاوشوں کی بدولت آج ہم لوگوں کے سامنے فیکلٹی کے تمام شعبہ جات میں اب تک کے ایم ڈی کے دوران جتنے تجرباتی اور مشاہداتی کام ہوئے ہیں ان تمام مطالعات وتحقیقات کو یونانی میڈیکس ۲۰۱۵، جلد دوم (اسپیشل کمپینڈیم) کی شکل میں ایک نایاب تحفہ کی شکل میں محفوظ ہے۔۳۰/دسمبر ۲۰۱۵ء کو یونانی میڈیکس کے اسپیشل ایشو یعنی کمپینڈیم کی رسم اجراء کی تقریب میری ڈین شپ میں منعقد ہوئی، اس تقریب میں ابن سعید خان آف چھتاری، پروچانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر حبیب الرحمٰن، اعزازی خازن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ڈائریکٹر، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ اور ڈاکٹر محمد خالد صدیقی، سابق ڈائریکٹر جنرل، سی سی آر یو ایم مہمانان کی حیثیت سے موجود تھے اور پروفیسر غفران احمد بھی اپنے ایڈیٹوریل بورڈ کے تمام اراکین کے ساتھ اس پروگرام میں شریک تھے۔

بیرونی ممالک میں نمائندگی

آپ کی یونانی طب میں جو گرفت اور عمیق معلومات تھیں اس کو صرف ملکی سطح

پر ہی نہیں سراہا گیا بلکہ طب کے میدان میں آپ کی صلاحیت اور تبحر علمی کو عالمی شہرت حاصل ہوئی چنانچہ دوسرے ملکوں نے بھی آپ سے یونانی اور روایتی طب کی اہم اور بیشتر مفید معلومات سے استفادہ کیا اس طرح سے عالمی سطح پر بھی آپ نے یونانی طب کی بہترین نمائندگی کی اور یونانی طب کو عالمی پیمانہ پر روشناس کرایا۔ جن ملکوں کا آپ نے دورہ کیا یا وہاں یونانی طب سے متعلق اپنی خدمات بہم پہنچائیں ان میں سے کچھ اہم درج ذیل ہیں۔

☆سری لنکا (کولمبو) کا سفر

سری لنکا کی دارالحکومت کولمبو میں ۲۶-۲۹/اکتوبر ۲۰۱۷ء میں آیوروید، یونانی، سدھ اور دیگر روایتی طب کی ترویج وترقی اور عالمی سطح پر روایتی طبوں کی اہمیت اور مقبولیت سے عوام کو روشناس کرانے کے لیے ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پروفیسر غفران احمد نے یونانی طب اور دیگر روایتی طبوں کی اہمیت اوران کے محفوظ اور کارگر طریقۂ علاج پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ چنانچہ آپ نے یونانی طب کو عالمی پلیٹ فارم پر دوسرے لوگوں کو بھی اس کی اہمیت کا احساس کرایا یہی عالمی احساس اب دوسرے علاقوں اور خطوں میں بھی روایتی طبوں کے پھیلاؤ کا محرک بن رہا ہے اور یہ جدید دنیا میں ایک بازیافت کی صورت میں متعارف ہورہی ہیں۔ عالمی سطح پر جنم لینے والی یہی فکر یونانی طب کی توسیع کا بھی سبب بن رہی ہے۔ یقیناً پروفیسر غفران کی طب کے فروغ اور اس کی ترویج واشاعت میں جہد مسلسل کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

☆موریشس کا دورہ

پروفیسر غفران احمد نے یونانی طب کو متعارف کرنے کے لیے ۱۰-۱۷/فروری ۲۰۱۹ء موریشس کا ہفت روزہ دورہ کیا تھا۔ اس کا اہتمام امریکی ادارہ انٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ (IIIT,USA) کے تعاون سے مشترکہ طور پر موریشس کی دو معروف سماجی تنظیموں ہیومن ویلفیر لیگ (HWL) اور اسلامک میڈیکل اینڈ الائڈ ہیلتھ پروفیشنل ایسوایشن (IMAHPA) نے کیا تھا۔ موریشس میں پروفیسر غفران احمد کو مدعو کرنے کا منشا تھا کہ وہ یہاں کے لوگوں کو یونانی طب سے متعارف کرنے کے علاوہ وہاں اِس کے فروغ کے امکانات کا جائزہ لیں اور اسے عملی شکل میں لانے کے لیے جامع لائحۂ عمل پیش کریں۔ چنانچہ سماج کے ہر طبقے سے ارتباط اور ان سے تبادلۂ خیال کے لیے ایک وسیع پروگرام کا نظم کیا گیا تھا۔ پروفیسر غفران احمد نے موریشس کے عوام وخواص، حکومت کے اہلکاروں، میڈیکل پروفیشنلز، اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ واساتذہ کو یونانی طریقۂ علاج کی واقفیت بہم پہنچائی اور ضروری معلومات فراہم کیں۔ اپنے دورے کے دوران انھوں نے ۷/لکچرس دیے، ۳/راؤنڈ ٹیبل ٹاک میں حصہ لیا اور ۴/اسکولوں میں خطاب کے علاوہ میڈیا سے روبرو ہوئے اور مختلف اخبارات کو انٹرویوز دیے۔

پروفیسر غفران احمد کے دورہ سے موریشس اور وطن عزیز کے درمیان رشتوں کو مزید تقویت ملی ہے اور اُن کے دورہ کے نتائج بے حد حوصلہ افزا رہے ہیں۔ ہند موریشس کے درمیان مفاہمتی قرارداد کے تحت جلد ہی وہاں سرکاری سطح پر ایک آیوش اسپتال شروع ہونے کی امید ہے۔ پروفیسر غفران احمد کے دورہ کا یہ پہلو بڑا ہی نتیجہ خیز رہا کہ اب اس اسپتال میں یونانی طب کی خاطر خواہ حصہ داری کی توقع ہے، ورنہ بعض سیاسی تعصّبات کی وجہ سے اس کے جائز حصص میں خرد برد کا اندیشہ تھا۔ پروفیسر غفران احمد نے موریشس میں یونانی طب کے تعارف اور ترجمانی کا بھرپور فریضہ انجام دیا۔ اُن کے ذریعہ موریشس کے لوگوں کے لیے یہ جانکاری ایک خوشگوار حیرت جیسی تھی کہ یونانی طب سائنسی اور عقلی بنیاد کا حامل معالجاتی سسٹم ہے، اس لیے کہ اب تک وہ محض اسے روایتی انداز کا ایک طریقۂ علاج سمجھتے تھے۔ یونانی طب سے صحیح واقفیت کے بعد موریشس کے دوسرے میڈیکل پروفیشنلز نے بھی اس کے تئیں دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ رفاہی طور پر کام کرنے والے کئی سماجی اداروں نے بھی اپنے وسائل سے یونانی مطب ومعالجہ کے قیام کے سلسلے میں عزائم کی یقین دہانی کی ہے۔ نوجوان طلبہ میں بھی یونانی طب کے تئیں دھیرے دھیرے دلچسپی پیدا ہونے لگی ہے اور وہ طبی تعلیم کی طرف مائل ہوتے نظر آرہے ہیں۔ آپ کے انتہائی کامیاب دورے کی وجہ سے یہ خبر بڑی خوش آئند ہے کہ اب یونانی اور دوسری روایتی طبوں کو عالمی توجہ حاصل ہورہی ہے۔ چنانچہ انہیں محفوظ اور کارگر طریقۂ علاج کی صورت میں دیکھا جانے لگا ہے، جو نظریاتی سطح پر ایک قسم کے بدلاؤ کا عندیہ ہے۔ موریشس کی یونانی طب سے دلچسپی، اس طریقۂ

علاج کی طرف بڑھتے عالمی رجحان کا ایک مظہر ہے۔اس طرح پروفیسر غفران احمد کے دورہ کی یہ بڑی حصولیابی سمجھی جارہی ہے کہ اس سے موریشس میں یونانی طب کے لیے امکانات کے نئے دروازے کھلے ہیں اور یہ ملک یونانی طب کی ایک نئی زمین کی صورت میں ابھر رہا ہے۔حسبِ توقع اگر اس دورہ کے نتائج برآمد ہوتے ہیں تو موریشس میں یونانی طب کے حوالہ سے پروفیسر غفران احمد کی کوششوں کو یاد رکھا جائے گا۔

☆البلاغ اکیڈمی،لندن (آن لائن) لکچر سیریز

ابھی حال ہی میں البلاغ اکیڈمی،لندن کے ذریعہ یونانی میڈیسن کو عالمی سطح پر متعارف کرنے کے لیے ایک آن لائن سرٹیفکٹ کورس کا انعقاد کیا گیا تھا اس میں آپ نے یونانی طب پر ایک لکچر سیریز دیا۔اس اکیڈمی کا مقصد یہ ہے کہ عالمی پیمانہ پر یونانی دانشوروں اور ماہرین کے ذریعہ یونانی طب کی اہمیت اور اس کی بنیادی تعلیمات سے دوسرے طب کے مجتہدین کو روشناس کرانا تاکہ وہ یونانی اور دیگر روایتی طبوں اور ان کے طریقۂ کار کو سمجھ سکیں۔ پروفیسر غفران نے اس سیریز میں یونانی طب کے بنیادی اصول، طب کے کلیاتی مباحث، فلاسفی اصول نیز بہت ساری بیش قیمتی اور اہم معلومات سے طلبہ کے علم میں اضافہ کیا۔ پروفیسر غفران کے لکچر اور آپ کے طریقۂ تدریس سے طلبہ حد درجہ متأثر تھے چنانچہ ان کے اندر یونانی طب سے متعلق ایک خاص دلچسپی پیدا ہوئی اور طب کے مزید بنیادی ماخذ اور اس کے رموز ونکات کو جاننے کی ان کے اندر ایک جستجو پائی گئی جس کا اندازہ ان کے تعزیتی پیغامات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ظاہر ہے یونانی طب کی ترویج وترقی میں پروفیسر غفران کی ان کاوشوں کو سنہری حروف سے لکھا جائے گا اور اس عظیم کارنامہ کو گراں باب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اہم مناصب

پروفیسر غفران احمد کی شخصیت بالکل منفرد قسم کی تھی عام طور پر یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان عہدہ اور منصب کے لیے خواہش مند رہتا ہے اور اس کے لیے کوشاں بھی رہتا ہے لیکن یہاں پر بھی پروفیسر غفران اپنی مثال آپ ہیں آپ کو متعدد بار مختلف عہدوں اور اہم مناصب کی پیش کش کی گئی مگر آپ نے بہت ہی انکساری سے کنارہ کشی اختیار کرلی،کبھی عہدہ اور منصب کی خواہش تو دور اگر آپ کو کوئی عہدہ بطور ضابطے اور قانون کے بھی ملتا یا اس کا پتہ چلتا تو آپ کے چہرہ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوجاتی اور آپ اس سے حتیٰ الامکان بچنے کی کوشش کرتے مثال کے طور پر پہلی مرتبہ جب آپ کا نمبر شعبہ کے صدر کے لیے آیا تو آپ نے شعبہ کے عہدۂ صدارت قبول کرنے سے معذرت کرلی تھی لیکن دوبارہ مجبوراً آپ کو قبول کرنا پڑا،اسی طرح جب آپ NIUM بنگلور سے واپس علی گڑھ آگئے تو اس کے کچھ عرصہ بعد آپ کے انتظامی امور اور صلاحیتوں کے اعتراف میں حکومت ہند کی طرف سے آپ کے پاس انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹرشپ کے لیے براہ راست تقرر نامہ آیا لیکن یہاں پر بھی آپ نے بہت ہی خاموشی سے اس خط کا جواب منفی میں لکھ کر مرسل کے پاس بھیج دیا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں لگی، منع کرنے کے بعد پھر دیگر لوگوں کو اس سلسلہ میں بتایا، ایسے ہی ایک دفعہ آیوش ایکسپرٹ کی حیثیت سے آپ کو WHO کے ہیڈکوارٹر جینیوا میں طب کی خدمت کا سنہرا موقع حاصل تھا جہاں تمام مراعات پورے حکومتی اعزاز کے ساتھ حاصل تھیں مگر اسے بھی آپ نے بہت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ منع کردیا اسی طرح بیرون ممالک جیسے جنوبی افریقہ، بنگلہ دیش وغیرہ ملکوں میں یونانی طب کی اشاعت وترقی کے لیے یونانی چیئر کی حیثیت سے آپ کو آفر تھا مگر یہاں بھی پروفیسر غفران نے کسی لالچ میں آئے بغیر منع کردیا،اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں نکالا جاسکتا کہ آپ ذمہ داریوں سے راہ فرار چاہتے تھے بلکہ آپ کے اندر وہ تمام صلاحیتیں اور مہارت وحذاقت بدرجۂ اتم موجود تھیں جو انتظامی امور کے لیے لازم ہوتی ہیں وجہ بس احساس ذمہ داری اور پوری دیانت داری سے اس کی انجام دہی کا تھا۔اس کے علاوہ اور بہت سی مثالیں ہیں جو آپ کی شخصیت سے جڑی ہوئی ہیں۔ بہرحال ان سب کے باوجود آپ درج ذیل اہم امور اور مناصب پر فائز رہے۔

☆ موجودہ صدر،شعبۂ علم الادویہ،اجمل خان طبیہ کالج،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

☆ کوارڈینیٹر،ڈی آر ایس-۲،یونیورسٹی گرانٹس کمیشن۔نئی دہلی

☆ سابق صدر، شعبۂ علم الادویہ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۷ء-۲۰۰۹ء)

☆ ڈپٹی ڈائریکٹر، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۸ء-۲۰۰۹ء)

☆ انچارج اکیڈمکس، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۷ء-۲۰۰۹ء)

☆ سابق صدر، ادارہ جاتی اخلاقیات کمیٹی، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۷ء-۲۰۰۹ء)

☆ نوڈل آفیسر برائے نیک (NAAC) فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

☆ جوائنٹ ڈائریکٹر، مرکز برائے ترقی سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (جولائی، ۲۰۱۹ء)

☆ صدر، انوویشن اینڈ پیٹینٹ سیل، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۲۰۲۱ء)

☆ صدر، اِنکوبیشن سینٹر، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۲۰۲۱ء)

اعزازات

آپ کی صلاحیت اور یونانی طب میں آپ کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں آپ کو بہت سارے باوقار اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ان میں سے کچھ اہم اعزازات درج ذیل ہیں:

☆ حکیم احمد اشرف میموریل قومی ایوارڈ۔۲۰۰۹ء

☆ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (ایمس) کے عالمی کانفرنس میں آپ کو انسٹی ٹیوشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔۲۰۱۴ء

☆ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں آپ کو بہترین یونانی اسکالر ایوارڈ دیا گیا۔۲۰۱۶ء

☆ وزارتِ آیوش، حکومت ہند، نئی دہلی کے ذریعہ یونانی طب میں ڈرگ ریسرچ زمرہ میں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ دیا گیا۔۲۰۱۷ء

☆ وزارتِ آیوش، حکومت ہند، نئی دہلی کے ذریعہ یونانی ادویہ میں ریسرچ اور تحقیق کے لیے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ (بیسٹ ریسرچر) سے بھی نوازا جاچکا ہے۔۲۰۱۸ء

پروفیسر غفران احمد مختلف الجہت اور آفاقی شخصیت کے مالک تھے، وہ بیک وقت مرجع تقلید طب، ماہر کلام، عظیم عارف اور بلند پایہ محقق تھے اور ساتھ ہی بااخلاق اور تہذیب وتمدن کے عظیم پیکر تھے، ان کی ذات صبر، حلم، انکسار، علم، اخلاق، تواضع اور مجاہدت سے آراستہ تھی۔اتنی خصوصیات بیک وقت کسی انسان میں جلدی یکجا نہیں ہوتی ہیں لیکن پروفیسر غفران کی ذات بلا مبالغہ مختلف اور متضاد صفات کی حامل تھی۔یہی وجہ تھی کہ دوران علالت آپ کی طبیعت اور صحت کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے لیے محبین کی ایک لمبی قطار تھی، سبھی لوگ متفکر اور تشویش میں تھے اور ہر کوئی آپ کی شفایابی کے لیے مستقل اللہ رب العزت سے دعائیں کرتا تھا، لیکن کووڈ-۱۹ کی ہولنا کی اور کورونا کی پُر آشوب لہر سے آپ کو بھی بچایا نہیں جاسکا چنانچہ رحلت کی خبر پر پہلے تو کسی کو یقین ہی نہیں آرہا تھا لیکن آپ بھی تو آخر انسان ہی تھے، موت تو ایک نا ایک دن آنی ہی تھی انتقال کی خبر عام ہوتے ہی جیسے محسوس ہوا دنیا ٹھہر گئی، اعزاء واقارب اور احباب ومتعلقین پر ایک سکوت طاری ہوگیا۔۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء بروز جمعہ بمطابق ۱۷/رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ کو آپ اس دنیائے فانی سے دنیائے جاودانی کی طرف کوچ کر گئے اور اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔انا للہ و انا الیہ راجعون۔اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے سایۂ عاطفت میں رکھے، آپ کو غریقِ رحمت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔آمین

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

پروفیسر غفران احمد مرحوم

[’موت العالِم موت العالَم‘]

حکیم وسیم احمد اعظمی ☆

پروفیسر غفران احمد مرحوم [۱۹۶۴ء-۲۰۲۱ء] کی وفات میرا ذاتی غم ہے اور طبّی تدریس وتحقیق کا بہت بڑا نقصان، جس کی تلافی کے امکانات بہ ظاہر مستقبل قریب میں مجھے تو نظر نہیں آتے۔ وہ شخصی طور پر بے حد خلیق اور ملنسار تھے۔ جو بھی اُن سے ایک بار مل لیتا، اُنھی کا ہو جاتا۔ گفتگو میں نرمی، لہجہ میں شیرینی، چہرے پر بشاشت کے ساتھ زیرلب تبسم اور مخاطب پر مکمل وجود کے ساتھ توجہ، اُن کے اِن اوصافِ حمیدہ سے مخاطب اُن کی شخصیت کے حصار میں آجاتا تھا۔ پروفیسر غفران احمد مرحوم دانشور تھے، لیکن وہ اپنے مخاطب پر اپنے علم اور رُتبہ کا ذرا بھی احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہ اُن کے مخاطب کی فہم وفراست پر منحصر ہوتا کہ وہ کیا اور کیسا محسوس کر رہا ہے۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم علم ودانائی میں بہت بڑے تھے، مگر مجھ سے جب بھی ملتے، اصاغر کے انداز میں ملتے، یہ اُن کے بڑوں کی تربیت تھی۔ میری اُن سے بہت زیادہ ملاقاتیں نہیں رہی ہیں، درجن بھر سے زیادہ تو قطعی نہیں، لیکن ہر ملاقات اپنے اَدھورے ہونے کا احساس دلاتی اور تشنگی بڑھاتی۔ یہ ملاقات خواہ ایک گھنٹے کی ہو یا پانچ چھ گھنٹے کی، تشنگی ضرور رہتی اور اس کا احساس کبھی نہ مرتا۔ میرا جب بھی علی گڑھ جانا ہوتا، شعبہ میں اُن سے ملاقات ضرور کرتا، اور اگر اُنھیں کسی اور ذریعہ سے میرے علی گڑھ میں ہونے کی خبر ملتی تو بے چین ہو جاتے اور ملنے کی تدبیریں کرتے اور پھر دونوں شاد کام ہوتے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ مجھے کسی سے ملنا ہے اور انھیں یقیناً اُن سے نہیں ملنا ہے، تو بھی وہ مجھے اُن کے درِ دولت کے آس پاس تک پہنچا دیتے، میں منع کرتا تو کہتے! اسی بہانے کچھ دیر اور ساتھ رہ لیں گے۔ آپ کے ساتھ رہ کر اچھا لگتا ہے۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم کثیر المطالعہ تھے، اسلامی ادب، اردو ادب اور طبّی ادبِ عالیہ پر اُن کی گہری نظر تھی۔ ان کا مطالعہ تجزیاتی نوعیت کا ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے طب، طبّی ادب اور طبّی مسائل پر خوب باتیں کرتے، طرزِ تدریس پر بھی اور تحقیق کے نہج اور منہج پر بھی، بلاشبہ وہ طبّی تحقیق کے نہج اور منہج پر اپنے معاصر اطبّاء میں ممتاز اور بلند مقام پر فائز تھے، وسیع الذہن، روشن ضمیر اور روشن فکر رکھتے تھے۔ طب کی روح، اس کی صالح روایت کے احترام کے ساتھ وہ طبّی تحقیق میں بقراطی فکر کو معاصر نظامہائے علاج کے دوش بدوش بلکہ اور آگے لے جانا چاہتے تھے۔ عالمی سطح پر جدید نہج اور منہج کے ساتھ اس کا تعارف کرانا چاہتے تھے اور انھوں نے اس راہ میں کچھ پیش رفت بھی کی تھی۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا، ظاہری جمال سے بھی، باطنی صدق وصفا سے بھی، پاکیزہ کردار اور اخلاقی محاسن سے بھی۔ وہ حسن معاملہ کی روشن مثال تھے، احباب اور رفقاء کار کے تئیں بے حد مخلص اور فن کے تئیں غیر معمولی طور پر حساس تھے۔ طب کی ہمہ جہت ترقی اُن کی زندگی کا نصب العین تھی۔ وہ مشاورت کی خوبیوں اور اس میں مضمر خیر وبرکت میں یقین رکھتے تھے اور وہ اپنے خردوں سے بھی مشورہ کرنے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کا ذوقِ مطالعہ بہت بالیدہ تھا۔ منتخب ادب پڑھتے تھے، اور منتخب کتابیں ہی اپنے ذخیرہ میں رکھتے تھے۔ وہ بقراطی طب کے نقیب تھے اور اس فکر کو عام کرنے اور اس کی توسیع میں جدید اسلوب اور انگریزی زبان کو بہ طور خاص اظہار خیال کا وسیلہ بناتے تھے۔ اپنے نظریات وفکریات کی توسیع کے لیے وہ اردو میں بھی لکھتے تھے اور انگریزی میں بھی، مگر انگریزی میں زیادہ لکھتے تھے کہ شاید وہ

☆ سابق ڈپٹی ڈائریکٹر، سینٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ، اتر پردیش۔ سابق مدیر، جہان طب، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی۔ E-mail:waazmi@yahoo.com، Mob.No:9451970477۔

طب کی باتیں معاصر نظامہائے علاج کے حاملین تک پہنچانا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی اردو تحریروں کو پڑھ کر مجھے بارہا احساس ہوا کہ وہ انگریزی میں سوچ کر اردو میں لکھتے ہیں، ہماری اکثریت اگر انگریزی میں کچھ لکھنا چاہتی ہے تو پہلے اس کا مضمون اردو میں باندھتی اور پھر اسے انگریزی زبان کا قالب دیتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اُن ایک تالیف 'اوصافِ ادویہ: ضمانت سے محاسبہ تک'، جو حکیم سعود الظفر علی کے علمی اشتراک سے ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی تھی، میں نے اُسے بالاستیعاب، ذہنی ارتکاز سے پڑھا تھا۔ علی گڑھ کے ایک سفر میں جب اُن سے ملاقات ہوئی تو اس کتاب کی تالیف پر اُنھیں مبارکباد دی اور کہا کہ آپ کی یہ کتاب پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ اس کے مباحث کو انگریزی میں سوچ کر اردو قالب دیا گیا ہے، یہ سن کر وہ زیرلب مسکرائے تھے۔ اور پھر ایک علمی منصوبہ کے تحت کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اُس کتاب کے بارے میں میں نے لکھا تھا:

''اردو طبّی ادب میں اب تک اِس فکر، اِس اسلوب اور اِس نہج کی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ مطالعہ کے بیشتر مراحل میں یہ احساس ہوتا ہے کہ کتاب کے مؤلفین نے انگریزی میں سوچا ہے اور اردو میں لکھا ہے۔''

پروفیسر غفران احمد اور سعود الظفر علی کی اس کتاب میں کئی صحت مند انحرافات بھی تھے۔ یہ کتاب تقدمہ وتقریظ کی روایتی تحریروں سے بھی بے نیاز ایک خوش گوار احساس دلاتی ہے۔ اِس کتاب کی غرض وغایت کے بارے میں مؤلفین لکھتے ہیں:

''کتابِ ہٰذا 'اوصافِ ادویہ: ضمانت سے محاسبہ تک' دراصل اوصافِ ادویہ کی ضمانت کے لیے ذمہ دار دوائی نباتات کی کاشتِ محمودہ، ان کے حصول اور صنعتی پیمانے پر ان دواؤں کی تیاری کے رہنما اصول وضوابط کی جمع وتدوین ہے۔ اس کتاب میں قدیم حکماء، جدید علوم کے ماہرین اور دورِ حاضر کے قانونی اداروں کے بیان کردہ احکام وقوانین کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضمانتِ اوصافِ ادویہ سے متعلق معروف اوصاف کی جانچ پڑتال اور ان کے احتساب کے طریقہ پر ایک عمومی مگر جامع گفتگو کی گئی ہے۔''

مؤلفینِ کتاب یہ لکھنے میں حق بجانب ہیں کہ:

''اردو زبان میں اپنی نوعیت کی غالباً یہ پہلی کاوش ہے جسے طبِ یونانی کے طلبہ، محققین و ریسرچ اسکالر اور صنعتِ دواسازی سے وابستہ افراد کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ زبان قدرے تکنیکی ہے لیکن موضوع کے بیان اور مشمولات کے احاطے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ کوشش کی گئی ہے کہ موضوع سے متعلق جو معلومات دستیاب ہیں ان کو یکجا کر دیا جائے لیکن علوم وفنون میں چونکہ ترقی کی رفتار تیز ہے اور ہر آن اضافات سامنے آتے رہتے ہیں اس لیے اس بات کا امکان بہرحال موجود ہے کہ بعض امور شاملِ کتاب ہونے سے رہ گئے ہوں۔''

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی دوسری طبّی علمی اور [اطلاعات کے مطابق] اپنی نوعیت کی منفرد تالیف 'اصولِ دواسازی' ہے، جو اُن کے بایوڈاٹا کے تناظر میں 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی' میں زیرطبع ہے۔ میرے علم میں اردو زبان میں ان کی یہی دو تالیفات ہیں، لیکن موضوع، لوازمے اور اسلوبِ نگارش کے اعتبار سے اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا شاید نہج اور منہج متعین کریں گی۔ پروفیسر غفران احمد مرحوم نے اردو زبان میں تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں، ہمیں علم نہیں کہ وہ کمیّت کے اعتبار سے کہاں تک پہنچتے ہیں مگر ان کی کیفیت کی تو ضمانت دی جاسکتی ہے، ان مضامین کی جمع وترتیب کے بعد اشاعت یقیناً ایک بڑا علمی کام ہوگا، یہی معاملہ ان کی انگریزی تحریروں کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔ آج یہ کام زیادہ مشکل نہیں، مگر کل بے حد مشکل ہوجائے گا۔ میں اُن کے بہت سے شاگردوں سے واقف ہوں، وہ اس کام کو انجام دینے کی وافر صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھیں یہ کام ترجیحی بنیاد پر کرنا چاہیے۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی شخصیت محبت، رأفت اور ایثار سے عبارت تھی۔ ایثار تو اس قدر تھا کہ متعدد مواقع پر انھوں نے مجھے آگے کیا تھا۔ حکومت ہند کی ایک سلکشن کمیٹی کا مجھے چیرمین بنایا گیا، معلوم ہوا کہ اس کے پس پردہ غفران صاحب ہیں، میں نے ان کے ایثار سے سبق سیکھا اور اپنے استاد، جو اُس کمیٹی کے رکن تھے، ذمہ داروں سے اُنھیں چیرمین بنانے کی درخواست کی، جو منظور ہوئی۔ بعد میں اس ادارہ کے ایک ذمہ دار نے بتایا کہ ہم لوگ حیرت زدہ رہے کہ اس مادی اور مسابقتی دور میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں، جو ایثار کا ایسا جذبہ رکھتے ہیں، بلکہ اس پرشدت سے عمل بھی کرتے ہیں۔ غفران صاحب مرحوم کا یہ حسنِ سلوک صرف میرے ساتھ ہی نہیں تھا۔ اس طرح کا معاملہ بہت سے لوگوں کے ساتھ تھا۔ اپنے تلامذہ کے ساتھ، اساتذہ کے ساتھ، رفقاء کار کے ساتھ، جس کے شاہدِ عینی بہت سے لوگ ہیں۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم نے فروری ۲۰۲۰ء کے اواخر میں علی گڑھ میں ایک

سمینار کرایا تھا، اس میں ازرہِ لطف وکرم مجھے بھی یاد کیا تھا اور ابن بیطار اور اس کی الجامع لمفردات الادویۃ والاغذیۃ پر گفتگو کے لیے کہا تھا۔ یہ موضوع میری علمی ترجیحات کا بھی تھا، اس لیے مجھے ذرا بھی تردد نہیں ہوا۔ میں نے اس کا اختصار یہ بھیجا تو بے حد پسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ بھائی! اس میں کچھ اطلاعات میرے لیے بالکل نئی ہیں۔ میں اُن کی اس بات کو اُن کی نیک نفسی اور ان کے خاندانی پس منظر میں دیکھتا ہوں، کیوں کہ مجھے طبّی ادبیات عالیہ پر اُن کی نظر کا بخوبی علم ہے۔ سوئے اتفاق میں اس سمینار میں شرکت نہ کرسکا، جس کا افسوس انھیں بھی تھا اور مجھے بھی۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم نے میری ایک کتاب کے لیے انگریزی میں ایک 'فلیپ' لکھا تھا، جس کو چھپوانے میں شاید وہ متردد ہوئے تھے، پھر بعد میں اس کی اشاعت کے لیے مجھ سے تقاضا بھی کیا تھا۔ وہ بے حد رقیق القلب تھے۔ ہر کسی کے ساتھ مواخاۃ کا معاملہ کرتے، خوشی وغم میں اُس کے ساتھ ہوتے۔ وہ ایسا آبشار تھے، جس میں جسمانی سکون اور ذہنی وفکری صحت کا مداوا تھا۔ اُن سے ہر شخص بقدر ظرف استفادہ کرسکتا تھا۔ وہ علم دوست تھے اور ایک وسیع حلقہ رکھتے تھے، ان کے اساتذہ ان پر ناز کرتے تھے اور ان کے تلامذہ اپنے اس استاذ پر فخر کرتے تھے۔ ان کی علمی شخصیت کی تشکیل میں پروفیسر یوسف امین صاحب کا بڑا اہم کردار تھا۔ اُنھوں نے اپنے اس بے حد عزیز شاگرد کو کچھ ڈھب سے ڈھالا تھا کہ وہ صرف سچ لکھتے اور حق کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔

'کووڈ-۱۹' نے دنیا کے بیشتر ممالک کو اپنی ہلاکت خیزیوں سے متأثر کیا تھا۔ ہندستان میں اس کی ۲۰۲۰ء کی ہلاکت خیزیوں کو ۲۰۲۱ء کی ہلاکت خیزیوں نے شکست دے دی تھی۔ اموات کا سلسلہ جاری تھا، میں نے بھی اپنے کئی احباب کھوئے تھے، میرے حقیقی بڑے بھائی ایس جی پی جی آئی، لکھنؤ کے انتہائی نگہداشت والے 'کووڈ وارڈ' میں بھرتی تھے۔ حالات بہتر نہ تھے، ان کے فرزند وہاں اسسٹنٹ پروفیسر تھے اور اتفاق سے اسی وارڈ کے ذمہ دار بھی تھے، دونوں کو ایک دوسرے سے تقویت اور حوصلہ ملتا تھا۔ پروفیسر غفران احمد بھی اُن دنوں بیمار تھے۔ جب مجھے اُن کی علالت کی خبر ملی تو ان سے رابطہ قائم کیا انھوں نے اپنی بیماری کا کچھ اس انداز میں ذکر کیا کہ گویا یہ بیماری سی بھی کوئی بیماری ہے اور بہ جلد اپنی صحتیابی کا پیشگی مژدہ بھی سُنا دیا، کہ شاید وہ مجھے فکرمند نہیں دیکھنا چاہ رہے تھے۔ پھر میں بھی نزلہ، زکام، کھانسی اور شدید بدن درد سے دوچار ہوا، کچھ دن بعد تنگیٔ تنفس نے بھی آن گھیرا۔ بیٹے ڈاکٹر کامران نے سوشل میڈیا کے بیشتر وسائل اور روابط سے مجھے بے وسیلہ اور بے رابطہ کردیا۔ احباب کو بتادیا گیا کہ پاپا کی طبیعت کچھ خراب ہے، مگر اتنی بھی نہیں کہ کسی سے ذکر کیا جائے، اور انھیں بھی کوئی ناخوشگوار اطلاع نہ دی جائے۔ کیونکہ میں احباب کی علالت کی خبریں سن کر بہت مضطرب ہوجاتا تھا، پھر اطلاع ملی کہ پروفیسر کوثر عثمان صاحب [لکھنؤ] کی والدہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔ وہ عرصہ سے درازیٔ عمر کے عوارض کا سامنا کررہی تھیں۔ چند دن بعد پروفیسر ارشد علی [اسٹیٹ تکمیل الطب کالج لکھنؤ] نے اطلاع دی کہ استاد محترم حکیم خواجہ ساجد حسن صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انھوں نے 'کووڈ-۱۹' سے محفوظ اور طبعی عمر کو پہنچ کر رختِ سفر باندھا تھا۔ اس خبر کے بعد انھوں نے پروفیسر غفران احمد صاحب کی لکھنؤ میں وفات کی اطلاع دی اور یہ بھی کہا کہ اُن کی تدفین یہیں، لکھنؤ میں ہوگی۔ اس سناونی سے میرے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ جب میں نے غفران صاحب کی علالت کی خبر سن کر اُنھیں فون کیا تھا، تو انھوں نے یقین دلایا تھا کہ اِن شاء اللہ لکھنؤ میں ملاقات ہوگی اور ڈھیر ساری باتیں ہوں گی۔ اب میں نے سوچا کہ انھوں نے لکھنؤ آکر اپنا وعدہ پورا کیا اور میں ایسا بدنصیب کہ اُن تک پہنچ نہ سکا۔ میں نے اس سناونی کے بعد کچھ مشترک احباب کو واٹس ایپ میسج بھی کیا تھا کہ تنگیٔ تنفس کی وجہ سے بات نہیں کرسکتا تھا۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ نجابت، شرافت، مروّت، حلم اور علم ودانائی کا ایک حصّۂ وافر اُنھیں اپنے بڑوں سے ورثہ میں ملا تھا اور پھر یہی ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گیا تھا۔ دراصل وہ اخلاق میں ہمالیہ کی طرح بلند اور فکر ودانائی میں سمندر کی طرح گہرے اور پرسکون تھے۔ سچ تو یہ ہے طب میں آج اُن جیسا شاید کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو انوار سے بھردے اور طب کے لیے اُن ہی جیسا کوئی دوسرا پیدا کردے۔ آمین یارب العالمین۔

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

آہ! پروفیسر غفران

پروفیسر سید مستحسن علی جعفری☆

کسی ساتھی اور وہ بھی ایک دیرینہ دوست کی شخصیت پر کچھ لکھنا بظاہر تو بہت آسان نظر آتا ہے مگر پروفیسر غفران احمد پر قلم اٹھانا اتنا آسان اس لیے نہیں ہے کیونکہ موصوف کی شخصیت بیک وقت بہت سارے پہلوؤں کی حامل تھی۔ جب بھی کبھی میرے ذہن میں ان کا خاکہ آتا ہے تو وہی خاموش سا پر اعتماد چہرہ جس میں بردباری تو خوب تھی مگر کبھی کبھی ظرافت آمیز شوخی و مسکراہٹ بھی نظر آتی تھی جس سے ان کی شخصیت اور بھی پُرکشش ہوجاتی تھی، موصوف کسی موضوع پر محوِ گفتگو ہوتے تو وسیع مطالعہ کا عکس نظر آتا۔ کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں ان کا نصب العین اور لائحہ عمل بالکل عیاں اور متعین ہوتا تھا۔ اعتماد ایسا کہ جیسے کسی نے کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہو۔ قدیم اور جدید سائنسی علوم پر ایسی پکڑ جوان کے ہم عصروں میں کم ہی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ بھی ان کا غیر معمولی و عمیق مطالعہ اور اچھی تربیت ہی ہوسکتی ہے۔ ان کے رکھ رکھاؤ سے ان کے خاندانی قدروں کی بھی عکاسی ہوتی تھی۔ بڑوں کی عزت کرنا اور سبھی سے خندہ پیشانی سے پیش آنا ان کا شیوہ تھا، غالباً اسی لیے وہ ہر دلعزیز تھے۔ مدرسہ بیک گراؤنڈ سے ہونے کے باعث اردو عربی و فارسی زبان پر اچھی دسترس ہونا تو فطری بات ہوسکتی ہے، مگر انھیں انگریزی زبان پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔ غالباً اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ موصوف کی بنیادی تعلیم مدرسہ جامعۃ الفلاح سے ہوئی۔ اس مدرسہ میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم پر بھی خاصی توجہ دی جاتی ہے۔ اس کا مشاہدہ مجھے ایک مرتبہ بہ نفسِ نفیس جامعۃ الفلاح میں حاضری دے کر ہو چکا ہے، لیکن دوسری اور غالباً اس سے زیادہ مضبوط وجہ یہ ہے کہ انھوں نے بذات خود انگریزی، ریاضیات اور دیگر عصری مضامین پر بہت زیادہ محنت کی، خاص طور سے اس وقت جب انھوں نے اجمل خان طبیہ کالج میں داخلہ لینے سے قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی اے اکنامکس کی تعلیم حاصل کی اور اسی وجہ سے وہ ملک کے معاشیاتی مسائل پر بھی خوب نگاہ رکھتے تھے۔ جہاں تک یونانی طب اور اس سے متعلق مضامین کا تعلق ہے تو میں عرض کر چکا ہوں کہ اس سے وابستہ عربی و فارسی مآخذ اور ایسی نادر تصانیف بھی ان کے زیرِ مطالعہ تھیں جن پر دیگر طبی فارغین کی عام طور سے دسترس نہیں ہوتی۔ دوسری جانب وہ ادویہ پر ریسرچ و تحقیق کے تعلق سے سائنٹفک ٹیکنالوجی سے بھرپور آشنا تھے، نہ صرف آشنا بلکہ جدید Experimental Parameters اور Equipments کے استعمال پر بھی معلومات ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

موصوف کی ان صفات کا اندازہ تو مجھے عرصہ دراز سے تھا کیونکہ گاہے بگاہے مجھے شعبہ علم الادویہ، طبیہ کالج علی گڑھ جہاں کا میں بھی طالب علم رہا ہوں، جانے اور ان سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا، لیکن نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں ان کی تقرری کے بعد یہ سلسلہ روزمرہ کا معمول بن گیا۔ یہاں پر اپنی ڈائریکٹر شپ کے دوران مجھے یہ شرف حاصل ہوا کہ میں ان کا تقرر بحیثیت پروفیسر اس انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ علم الادویہ میں کرا سکا۔ کچھ ہی عرصہ میں ان کی تدریسی و تحقیقی صلاحیتوں کے علاوہ بھی ان کی بہت سی خوبیاں سامنے آنے لگیں۔ کبھی کسی فنکشن میں تقریر کرتے تو تقریر خاصی طویل ہونے کے باوجود بہت ہی پُر لطف اور دلکش ہوتی اور ایسا لگتا کہ موصوف کی زبان سے الفاظ نہیں بلکہ موتی بکھر رہے ہوں، مجال کہ کوئی طالب علم یا ساتھی ٹیچر بیچ میں اٹھنے کی کوشش کرے۔ تقریباً ہر روز شام کو ہم لوگ کچھ اساتذہ اور کچھ اسٹوڈنٹس کے ساتھ اِنڈور گیمس ہال میں بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے، یہاں بھی موصوف کا شارٹ لگانے کا انداز بہت ہی

☆ سابق وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی، سابق ڈائریکٹر، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور، کرناٹک۔ Email:majafridelhi@yahoo.com،Mob.No:9999344184

پُرسکون اور نرالا تھا، مجھے یہ کہنے میں کوئی تأمل نہیں کہ تمام کوششوں کے باوجود میں ان کو بیڈمنٹن میں کبھی ہرا نہیں پایا۔

موصوف کی NIUM کی سروس کے دوران ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جب اس وقت کے ڈپٹی ڈائریکٹر برائے ایڈمنسٹریشن نے استعفیٰ دے دیا تو چونکہ اس خالی آسامی کو بیک وقت پُر کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے پروفیسر اور صدر شعبۂ علم الادویہ کے ساتھ ساتھ کچھ عرصہ کے لیے یہ اضافی ذمہ داری بھی ان کے سپرد کردی جسے انھوں نے نئے ڈپٹی ڈائریکٹر کے جوائن کرنے تک بخوبی انجام دیا اور انسٹی ٹیوٹ کا نظام چلانے میں میری بھرپور مدد کی، دراصل میری خواہش تھی کہ انسٹی ٹیوٹ سے میری سبکدوشی کے بعد ڈائریکٹرشپ کی ذمہ داری پروفیسر غفران ہی سنبھالیں اس لیے میں انھیں وقتاً فوقتاً مختلف ذمہ داریاں دے کر طرح طرح کے مواقع فراہم کررہا تھا مگر جہاں ایک طرف NIUM میں ان کا رول مجاہدانہ تھا وہیں وہ ایک کشمکش میں بھی مبتلا رہتے تھے کیونکہ بنگلور میں ان کی فیملی ساتھ نہیں رہتی تھی بلکہ بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ میں ہی قیام پذیر تھی، بچے ابھی کمسن تھے اور علی گڑھ میں ابتدائی اسکولی تعلیم میں مشغول تھے۔

ویسے بھی علی گڑھ یونیورسٹی کی باقاعدہ سروس کو چھوڑنا کوئی عقلمندی نہیں تھی، حالانکہ انسٹی ٹیوٹ کے مستقبل کی خاطر میں ان سے یہی اصرار کرتا رہا کہ وہ علی گڑھ کو خیرباد کہہ کر فیملی کو بنگلور شفٹ کرلیں، پہلے تو وہ کچھ تذبذب میں نظر آئے پھر میرے مزید اصرار پر کچھ اکھڑے اکھڑے سے رہنے لگے، پھر ایک دن انھوں نے واضح کردیا کہ NIUM کی سروس ان کے لیے اب مزید ممکن نہیں اور پھر وہ دن بھی آیا کہ میری لاکھ کوششوں کے باوجود بڑے بھاری من سے مجھے انھیں ریلیو کرنا پڑا۔ چونکہ NIUM کی سروس بطور پروفیسر جوائن کرتے وقت وہ اے ایم یو علی گڑھ میں لیکچرر کے عہدے پر فائز تھے اور وہ وہاں سے دوسال کی چھٹی لے کر آئے تھے لیکن اسی دوران ایک وقت وہ بھی آیا کہ جب وہ علی گڑھ میں ریڈر کی پوسٹ پر پروموشن کے لیے تشریف لے گئے، اس میں بھی بحیثیت ایکسٹرنل ایکسپرٹ مجھ ناچیز کا اچھا خاصا دخل رہا، اس وقت میں نے ان کو بنگلور میں باقاعدہ بسانے کی خواہش کو بالائے طاق رکھ کر ان کے ذاتی مفاد میں ان کا ساتھ دینا مناسب سمجھا۔ اب اس مقام پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی سلیکشن کمیٹی کے دوران ہوئے Discussion کو قلمبند کرنا مناسب تو نہیں لیکن چونکہ بات بہت پرانی ہوچکی ہے اور اب متعلقین میں سے کوئی بھی کسی عہدے پر فائز نہیں ہے، اس لیے تھوڑی آزادئ قلم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تحریر کررہا ہوں کہ اس وقت جب سلیکشن کمیٹی کے چیئرمین قبلہ وائس چانسلر صاحب نے موصوف کا بایوڈاٹا دیکھا تو فوراً مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے کہ جناب ہماری یونیورسٹی میں ابھی صرف لیکچرر ہیں اور آج یہاں ریڈر کی پوسٹ پر پروموشن کے لیے آئے ہوئے ہیں اور آپ نے انھیں نیشنل انسٹی ٹیوٹ میں پہلے ہی پروفیسر بنا رکھا ہے، اس وقت ان کے اس اچانک سوال پر میرا جواب بہت ہی مختصر تھا وہ یہ کہ جناب NIUM میں پروفیسر کی پوسٹ پر تقرری کے وقت نا صرف ضروری استعداد رکھتے تھے بلکہ وہاں سلیکشن کمیٹی کے وقت دوسرے تمام افراد کے مقابلے یہ سب سے بہتر امیدوار تھے اور اب بھی میں انھیں مجبوری میں ہی چھوڑوں گا۔ موصوف کے NIUM چھوڑنے کے بعد ہمارے درمیان دوستانہ روابط مزید بڑھتے گئے اور وقتاً فوقتاً میں انھیں انسٹی ٹیوٹ سے متعلق پروگراموں میں شامل کرتا رہا۔ ۲۰۱۲ء میں NIUM سے میری جامعہ ہمدرد میں واپسی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، وہاں بھی میں انھیں کبھی بطور ممتحن اور کبھی بطور ایکسپرٹ، کبھی بورڈ آف اسٹڈیز اور کبھی فیکلٹی میٹنگس میں نامزد کرکے بلاتا رہا، اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود انھوں نے ہمیشہ میرا بھرم رکھا اور کبھی میری درخواست کو مسترد نہیں کیا۔ مختلف شہروں میں رہنے کی باوجود ہم لوگ اکثر و بیشتر فون پر رابطہ قائم رکھتے تھے اور میرا تو یہ معمول تھا کہ کسی بھی تحقیق طلب طبی مسئلے پر غور وخوض کے درمیان موصوف کو بلاجھجک فون کرلیتا تھا وہ یا تو فوراً کوئی حل پیش کردیتے یا پھر ایک دو دن کے بعد خود ہی ریفرینس کے ساتھ مواد فراہم کردیتے۔ موصوف کے جانے کے بعد یہ وہ خلا ہے جو کسی طرح پُر ہوتا دکھائی نہیں دیتا، اللہ انھیں جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

تذکرہ ایک مخلص کا

پروفیسر سہیل احمد ☆

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی، مئے ناب و سفینہ غزل است

افسانہ لکھنا نسبتاً آسان ہے لیکن واقعہ کو اسی طرح لکھنا جیسا کہ گزرا ہو اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ افسانہ میں کردار بنانے کے بعد تمام خوبصورت الفاظ کا تاج محل تعمیر کیا جاتا ہے لیکن واقعہ میں ایسا ممکن نہیں تاہم عام مزاج ہے کہ آدمی مترادفات کا پورا دسترخوان لگا دیتا ہے جو بلا مبالغہ مبالغہ ہی ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو اس سے جھوٹ کی بو بھی آنے لگتی ہے۔

میرے دل میں بار بار یہ خیال آیا کہ میں ڈاکٹر غفران مرحوم کے تذکرہ نویسوں میں شامل ہو جاؤں لیکن اسی ڈر سے کہ واقعہ افسانہ نہ بن جائے اور تذکرہ مبالغہ نہ بن جائے، ایک سطر بھی لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر بھی کوشش کرتا ہوں۔

یہ کوئی ۱۹۸۶ء کے قریب کی بات ہے، ہال میگزین میں ایک افسانہ شائع ہوا، جس کا عنوان تھا ''چاندنی''۔ میں نے بھی پڑھا۔ افسانہ بہت اچھا لگا۔ افسانہ نگار کا نام تھا ''غفران احمد، بی یو ایم ایس''۔ اسی وقت افسانہ نگار سے ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی۔ کالج میں رسمی طور پر ملاقات ہوئی اور میں نے خوبصورت افسانہ نگاری پر مبارکباد دی۔ ڈاکٹر مرحوم نے اپنی سنجیدہ مسکراہٹ سے مبارکباد قبول کی اور شکریہ ادا کیا۔ بس یہیں سے ڈاکٹر مرحوم سے ملاقات کا سلسلہ چل پڑا۔ علی گڑھ کے لمبے قیام میں مختلف مواقع پر ملاقات و گفتگو رہی پھر بھی بہت زیادہ قربت نہ ہو سکی کیونکہ کلاس بھی الگ تھا اور رہائش بھی۔

حسن اتفاق ایم ڈی علم الادویہ میں داخلہ ہونے کے بعد ایک دوسرے کو سمجھنے اور ملنے جلنے کا وقت زیادہ ملا۔ خاص طور سے Animal experiment کے دوران ایک دوسرے سے باہم تبادلہ خیال اور وقتاً فوقتاً باہمی تعاون کی ضرورت بھی پیش آئی۔ اسی وقت یہ اندازہ ہوا کہ یہ بندہ کم گو ہے لیکن سنجیدہ اور پختہ رائے کا مالک ضرور ہے۔

ایم ڈی مکمل ہونے کے بعد میں اپنے گھر پر کلینک میں مشغول ہو گیا اور ڈاکٹر مرحوم کا اجمل خان طبیہ کالج میں تقرر ہو گیا جس کی وجہ سے آپس میں رابطہ تقریباً ختم سا ہو گیا۔

ایک لمبی مدت کے بعد ۲۰۰۵ء میں اپنے بھتیجے محمد احسن کے داخلہ کے لیے علی گڑھ میری حاضری ہوئی۔ داخلہ کی تکمیل کے بعد میں رکشہ سے کالج کی طرف گمشدہ یاروں کی تلاش میں جا رہا تھا۔ ابھی رکشہ کالج کے گیٹ پر رکنے بھی نہ پایا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی: سہیل بھائی! السلام علیکم۔ مڑ کر دیکھا تو ڈاکٹر مرحوم ہیں۔ خوشی ہوئی کہ محبت، مروت اور یاد سب زندہ ہے۔ کالج پہنچ گئے، چیمبر میں مختصر ملاقات کے بعد فرمایا شام کا کھانا گھر پر کھائیں گے، سو شام کا کھانا ان کے گھر پر کھایا۔ ملاقات اور دعوت دونوں پر تکلف اور پر خلوص رہی۔ کھانے کے بعد میں اپنی قیام گاہ واپس آ گیا۔

اس کے بعد پھر ایک لمبے وقفے تک کوئی رابطہ نہ ہو سکا۔ ۲۰۱۲ء یا ۲۰۱۳ء کی بات ہوگی، اس وقت میں برہان پور طبیہ کالج سے منسلک تھا۔ ڈاکٹر مرحوم کا فون آیا کہ اپنا بایوڈاٹا بھیج دیں؛ فلاں کالج میں اساتذہ کی تقرری ہونی ہے، جہاں اس سے بہتر مستقبل کی امید ہے۔ یہیں سے ٹیلی فون پر رابطہ کا سلسلہ مستقل ہو گیا پھر

☆ پرنسپل، صوفیہ یونانی میڈیکل کالج، ہاسپٹل اینڈ ریسرچ سینٹر، مشرقی چمپارن، بہار۔ Mob.No:8817916464، Email:suhailfarqaleet@gmail.com۔

مجھے جب بھی کسی طبی مسئلہ میں مشکل پیش آتی تو میں بلاتکلف ڈاکٹر غفران مرحوم یا ڈاکٹر عبدالودود (موجودہ ڈائریکٹر، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور) کو کال کر لیتا تھا اور میری مشکل آسان ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر مرحوم کے دنیا سے چلے جانے کے بعد میرے لیے سب سے بڑا غم یہ ہے میری علمی ضرورت کو پورا کرنے والا ایک دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا، جو اَب کبھی بھی نہیں کھلے گا۔ میرے اس درد کو میں ہی محسوس کر سکتا ہوں یا وہ لوگ جو اس طرح کی مشکل سے گزر رہے ہوں۔

اللہ تعالی نے انسانوں کو خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ دنیا میں پیدا فرمایا ہے۔ مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے تین صفات سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا:

(۱) تواضع، خاکساری اور انکساری

(۲) امانت داری اور ایمان داری

(۳) خیر خواہی اور ہمدردی

انسانی کمزوریوں میں سے ایک عام بات یہ ہے کہ پیشہ اور عہدہ ملنے کے بعد آدمی کے لب ولہجہ اور انداز گفتگو میں تبدیلی آ ہی جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ تبدیلی اتنی بڑی ہوتی ہے کہ بندہ اپنے سے کم پیسہ اور چھوٹے عہدہ والوں کو کمتر اور ذلیل سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتا ہے اور بسا اوقات یہ رویہ اپنے قریبی احباب اور ماں باپ تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ جہاں تک میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر مرحوم اس بڑی اور مہلک بیماری سے بہت حد تک محفوظ رہے چنانچہ میرے ساتھ بھی ان کا رویہ ہمیشہ برادرانہ اور مخلصانہ رہا۔

ڈاکٹر مرحوم اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کو ذاتی طور پر بھی پوری کرتے تھے اور اپنے ملنے جلنے والوں کو بھی اس کا احساس دلاتے رہتے تھے کہ ہمارا تقرر جس کام کے لیے ہوا ہے اس میں وقت کی پابندی اور معیار کا خیال رکھنا ہماری اولین ذمہ داریوں میں سے ہے۔ ڈاکٹر مرحوم وقت کی پابندی بھی کرتے تھے اور پابندی سے کلاس بھی لیتے تھے۔ لکچر اتنا پر مغز ہوتا تھا کہ طلبہ مطمئن ہو جاتے تھے۔ کئی بار مجھ سے دوران گفتگو انھوں نے اپنے اس درد وغم کا اظہار کیا کہ بعض اساتذہ نہ تو وقت کی پابندی کرتے ہیں اور نہ ہی پابندی سے کلاس لیتے ہیں۔ بعض حضرات کالج آنے کے بعد فوراً کسی نہ کسی بہانے باہر نکل جاتے ہیں اور اپنی گھریلو ضروریات پوری فرمانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کالج میں اپنے ماتحت ملازمین اور وہ تمام لوگ جو ان کی ہمدردی اور خیر خواہی کے حقدار ہوتے، ان کا پورا خیال رکھتے اور کسی پر بھی حاکمانہ غرور استعمال نہیں کرتے۔ اپنی استطاعت کے مطابق طلبہ کی جیسی ضرورت ہوتی تھی ضرور پورا کرتے تھے۔

۱۶/اور ۱۷/جولائی ۲۰۱۱ء کو زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج، پونے، مہاراشٹر میں صیدلہ پر ایک یونانی ورکشاپ منعقد ہوئی تھی، جس میں میری شرکت Participant کی حیثیت سے ہوئی تھی جب کہ ڈاکٹر غفران مرحوم Resource Person کے طور پر تشریف لائے تھے۔ چائے کی میز پر ڈاکٹر غفران اور کالج کے (اُس وقت کے) پرنسپل ڈاکٹر جلیس احمد مرحوم اکٹھا تھے، علیگ کی نسبت سے ان لوگوں نے مجھے بھی بلا لیا۔ دورانِ گفتگو پرنسپل صاحب نے کہا کہ اگلے سیشن میں جن صاحب کا لکچر ہے وہ ابھی تک تشریف نہیں لائے ہیں اور نہ ان کی آمد کے سلسلے میں کوئی اطلاع ہے۔ ڈاکٹر غفران نے کہا آپ اس سلسلے میں پریشان نہ ہوں، اگر وہ وقت پر تشریف نہیں لاتے ہیں تو مجھے آدھا گھنٹہ پہلے مطلع کر دیں، میں ان شاء اللہ لکچر دے دوں گا۔ اور ہوا بھی یہی کہ وہ صاحب تشریف نہیں لائے چنانچہ ڈاکٹر غفران مرحوم نے ہی اس سیشن میں لکچر دیا۔ لکچر سننے کے بعد ایسا محسوس نہیں ہوا کہ یہ لکچر بغیر تیاری کے عجلت میں دیا گیا ہے۔

۲۰۱۵ء میں ایم ڈی کے Viva کے سلسلے میں محمدیہ طبیہ کالج، منصورہ مالیگاؤں میں حاضری ہوئی۔ میں ممتحن ثانی تھا اور ڈاکٹر غفران مرحوم ممتحن اول۔ Examinee ان کے متعلقین میں سے تھا، اس کے باوجود انھوں نے امتحان کے تئیں ضابطہ کا پورا اہتمام کیا اور ممتحن کا فریضہ امانت داری کے ساتھ انجام دیا۔ درمیان میں میں نے اشارہ بھی کیا کہ Viva مختصر کر دیں لیکن انھوں نے اس کی کوئی رعایت نہیں کی۔ ان کے اس رویہ سے محسوس ہوا کہ تعلقات فریضہ کی ادائیگی میں حائل نہیں ہونے چاہئیں۔ یہ Viva میرے لیے قابل ذکر اس لیے بھی ہے

کہ بعض سوالات ایسے تھے جن کے جواب خود مجھے بھی معلوم نہیں تھے۔

ڈاکٹر غفران مرحوم کا طبی دنیا میں ایک معتبر نام تھا۔ان کی استعداد وصلاحیت پر ڈاکٹر نسیم الحسن کا یہ شعر بالکل موزوں معلوم ہوتا ہے۔ ؎

لمس اس کے حسن کا پتّہ ہے اونچی ڈال کا
ہاتھ پہنچے تک تو موسم دوسرا آجائے گا

یہ جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے، اپنی یادداشت سے لکھا ہے اور یہ میرے ذاتی تأثرات ہیں۔ میں اس مضمون کا اختتام اللہ کے نبی ﷺ کے ان دعائیہ کلمات پر کررہا ہوں جو آپ ﷺ نے ایک صحابیؓ کی وفات کی خبر ملنے پر پڑھی تھی۔

"اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّهِ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَأَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِنْ دَارِهِ وَأَهْلاً خَيْرًا مِنْ أَهْلِهِ وَزَوْجًا خَيْرًا مِنْ زَوْجِهِ وَأَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَأَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ أَوْ مِنْ عَذَابِ النَّارِ۔"

ترجمہ: ''اے اللہ! اس (میت) کو بخش دے، اس پر رحم فرما، اسے عافیت دے اور اس کو درگزر فرما، اس کی باعزت مہمانی فرما، اس کی قبر کو وسیع کردے، اس کو پانی، برف اور اولوں سے دھو ڈال، اس کو گناہوں اور غلطیوں سے پاک صاف کردے جس طرح تو سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کرتا ہے۔ اے اللہ! اس کے (دنیاوی) گھر سے بڑھ کر گھر عطا کر، اہل وعیال سے بہتر اہل وعیال عطا کر، اس کو جنت میں داخل کر، جہنم اور قبر کے عذاب سے اسے محفوظ رکھ۔'' (صحیح مسلم:۹۶۳)

یا اللہ! اس دعا کو مرحوم اور ہم سب کے حق میں قبول فرما۔ آمین یارب العالمین!

☆☆☆☆☆

تعزیتی پیغام

پروفیسر غفران کا اچانک انتقال بہت ہی تکلیف دہ ہے، یہ ایسا غم ہے کہ آسانی سے بھلایا نہیں جاسکتا۔ پروفیسر غفران چونکہ میرے شاگرد تھے لہٰذا ان سے میرا ذاتی لگاؤ تھا، میں بہت قریب سے انھیں جانتا تھا، وہ ایک انتہائی پڑھے لکھے اور قابل شخص تھے، ان کے چلے جانے سے یونانی طب میں اور خصوصاً شعبۂ علم الادویہ میں ایک ناقابل تلافی خلا پیدا ہوگیا ہے۔ ان کی ابھی سسٹم کو ضرورت تھی۔ ان کے انتقال سے پوری طبی برادری ایک ممتاز محقق اور استاد سے محروم ہوگئی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے، جنت میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور احباب ومتعلقین کو اس دکھ بھری گھڑی میں صبر دے اور ان کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین!

(پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، اعزازی خازن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

ISSN:2454-4507

اسم بامسمیٰ غفران احمد فلاحی

پروفیسر اشہر قدیر☆

میرے ہم جماعت، دوست، ہمدرد، خیرخواہ، مشیر اور بہت کچھ پروفیسر غفران احمد کا انتقال پُر ملال بتاریخ ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء بروز جمعہ لکھنؤ میں اس وقت ہوا کہ جب 'کووڈ' کی وبا اپنے شباب پر تھی، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان دنوں میں بھی اس موذی عارضہ کا شکار اور قرنطینہ کے حصار میں تھا۔ غفران مجھ سے ایک ہفتہ قبل غالباً ۹/یا ۱۰/اپریل کو بیمار ہوئے تھے۔ ۱۶/اپریل جمعہ کی شام سے میں بھی بخار میں مبتلا ہو گیا۔ ان کا گھر میرے گھر سے کچھ ہی دور ہے لیکن اس وقت کسی کے گھر آنا جانا ممنوع تھا، وہ بے چارگی کا عالم تھا کہ دو لاچار بس فون پر ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے رہتے تھے۔ ہماری آخری گفتگو ۲۰/اپریل کو ہوئی میں نے خیریت معلوم کی، حسب عادت انتہائی پرسکون اور پرامید انداز میں بولے، ''میں ٹھیک ہوں، بس معمولی کھانسی اور بخار ہے، اور تم کیسے ہو؟'' میں نے جواب دیا، مجھے کھانسی تو نہیں ہے، صرف بخار ہے لیکن سوچ رہا ہوں کورونا کا ٹیسٹ کروالوں۔ ادھر سے آواز آئی، ''زیادہ فکر مت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس آخری گفتگو میں غفران کے آخری الفاظ یہ تھے۔ ''ان شاء اللہ جلد ملاقات ہوگی۔''

اس ملاقات کا ابھی تک انتظار ہے، ہائے ہائے زندہ رہتے تو کیا، میں تو مرحوم کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ موصوف کا جب بھی خیال آتا ہے تو یہی آتا ہے، کتنا پیارا انسان تھا، اسم بامسمیٰ۔ موصوف کی جملہ صفات کو سامنے رکھ کر بات کی جائے تو سرورؔ بارہ بنکوی کا یہ شعر صادق آتا ہے:۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور سے شائع ہونے والے طبی مجلّہ 'ترجمان طب' کے مدیران پروفیسر غفران احمد کی حیات و خدمات سے منسوب ایک خصوصی شمارہ شائع کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ ماضی قریب میں مجلّہ کے مدیر پروفیسر عبدالحسیب انصاری ایک علمی سرگرمی کے تحت علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ مجھے بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا دوران گفتگو محترم نے احقر سے بھی یہ خواہش ظاہر کی کہ میں بھی اس موضوع پر کچھ سپرد قلم کردوں۔ معاملہ دیرینہ دوست کا ہے، لہٰذا اس خدمت کو میں نے اپنے لیے باعث سعادت سمجھا اور سر تسلیم خم کر دیا۔ جانتا ہوں مجھ سے یہ فریضہ کماحقہٗ ادا نہ ہو سکے گا، بہرحال کوشش ضرور کروں گا کہ مرحوم کی صحبت سے جس طرح میں بہرہ ور ہوا قارئین بھی بہرہ یاب ہوں۔

۱۹۹۲ء کہ جب میرا داخلہ اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شعبۂ کلیات میں جاری پوسٹ گریجویٹ کورس 'ماہر طب، کلیات وعلم الامراض' میں ہوا تھا، اس وقت کالج کے صرف تین شعبہ جات کلیات، علم الادویہ اور معالجات میں ہی پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا اہتمام تھا۔ ہر سال ایک شعبہ میں چار طلبہ کو اور کل بارہ طلبہ کو داخلہ ملتا تھا۔ اس وقت تین سالہ کورس کے پہلے سال میں تمام شعبہ جات میں نصاب تعلیم اور درس وتدریس مشترک تھے اس لیے تمام طلبہ ہم جماعت ہوا کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ غفران 'ماہر طب، علم الادویہ' کے طالب علم ہونے کے باوجود میرے ہم جماعت تھے۔ جماعت میں ہم جماعت تو سبھی ہوتے ہیں لیکن سبھی ہم مزاج نہیں ہوتے۔ ہم مزاجی ہی دوستی کا ابتدائی مرحلہ ہے جس کی

☆صدر شعبۂ کلیات، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش۔ Mob.No:9891918622، E-mail:ashhar.kulliyat@gmail.com۔

بنا پر دوستی پروان چڑھتی ہے۔ میں اور غفران نہ تو ہم وطن تھے نہ ہی ہمارے مابین کوئی اور سابقہ تعلق تھا۔ اس لیے ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے میں نصف سال گزر گیا۔ وہ مہذب، خوش اخلاق، نرم خو ہونے کے علاوہ ذہین اور حصول علم کی بابت مخلص اور سنجیدہ بھی تھے۔ لہٰذا میں اور غفران پہلے ہم مزاج اور بعد میں دیرپا دوست ثابت ہوئے۔

۱۹۹۵ء کے اختتام تک ہم ماہر طب سے فارغ التحصیل ہوگئے، الحمد للہ جلد ہی میرا تقرر بحیثیت لیکچرر شعبۂ کلیات، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، جامعہ ہمدرد، دہلی میں اور غفران کا تقرر بطور لیکچرر شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوگیا۔ ملازمت میں وقت کے ساتھ رتبہ میں ترقی و توسیع عام بات ہے لیکن پیشہ ورانہ مہارت اور غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر صاحب امتیاز ہونا عام نہیں، غفران کو یہ اعزاز حاصل تھا۔ وہ جدید پیرائے میں علم الادویہ کی تحقیق و ترویج پر مہارت تامہ رکھتے تھے حتیٰ کہ اس ضمن میں سینئر اساتذہ اور اسکالرس کو بھی ان سے رجوع کرنے میں عار نہ تھا۔

انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور نکھارنے میں سازگار ماحول اور سہولیات کی فراہمی اہم ہیں۔ یہ غفران کی خوش بختی تھی کہ وہ بحیثیت متعلم اور معلم پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے حامل شعبوں سے منسلک رہے۔ اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ کے علاوہ ۲۰۰۷ء تا ۲۰۰۹ء نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں بھی بطور پروفیسر کارفرما رہے اور اپنے شعبہ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

مطلوبہ سہولیات سے محرومی کیا ہوتی ہے اور فکر و فن کو کس درجہ متاثر کرتی ہے، راقم السطور کو اس کا اندازہ ہے۔ میں نے جامعہ ہمدرد، نئی دہلی کے شعبۂ کلیات میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے آغاز کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس بابت ۲۰۰۲ء تا ۲۰۱۰ء مسلسل مصروف عمل رہا مگر بعض ناگفتہ بہ اسباب کی بنا پر کامیابی نہیں ملی اور ۲۰۱۰ء میں یہ اندازہ ہوگیا کہ جامعہ ہمدرد میں فی الحال اس پروگرام کا انعقاد ممکن نہیں۔ ایک سال بعد یعنی ۲۰۱۱ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور سے خبر آئی کہ وہاں شعبۂ کلیات میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کی بنیاد ڈال دی گئی ہے جس کے لیے معلمین درکار ہیں پھر جلد ہی لیکچرر اور پروفیسر کی پوسٹ بھی ایڈورٹائز ہوگئیں۔ چونکہ غفران پوسٹ گریجویٹ شعبہ سے منسلک ہونے کے واسطے میری جستجو سے بخوبی واقف تھے اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ میں خود بھی رہ چکے تھے اس لیے انھوں نے مجھے یہ ترغیب دی کہ میں موقع کو غنیمت جان کر پروفیسر کی پوسٹ کے لیے درخواست بھیجوں۔ میں نے درخواست بھیج دی، انٹرویو بھی دیا لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ غفران یہ جان کر کبیدہ خاطر ہوئے۔

۲۰۱۳ء کے اواخر میں اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ کلیات میں کہ جہاں ۱۹۸۶ء سے پوسٹ گریجویٹ تعلیم جاری ہے، پروفیسر کی تقرری کے لیے کیڈر پوسٹ ایڈورٹائز ہوئی۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ سے جو تجربہ حاصل ہوا تھا اس کی بنا پر پوسٹ گریجویٹ شعبہ سے رغبت کے باوجود میں تذبذب کا شکار تھا کہ یہاں کے اربابِ اقتدار کے لائحہ میں مخل ہونا جائز ہے بھی کہ نہیں؟ اس وقت جن رفقاء نے احقر کو اس جرأت پر آمادہ کیا ان میں بھی غفران سرِ فہرست تھے۔ وہ نہ صرف میرے تعلق سے مخلص تھے بلکہ انھیں یونانی طب کو درپیش مسائل سے بھی سروکار تھا۔ ۱۹۹۷ء میں شائع ہونے والی میری پہلی تصنیف 'طب یونانی اور چیلنجز' سے وہ متاثر ہوئے تھے۔ وہ کلیات ادویہ سے معمور علم الادویہ میں طاق تھے اور اسی بنا پر میرے ہم خیال و ہم نوا بھی تھے۔ وہ اتفاق رکھتے تھے کہ دور جدید میں یونانی طب کی بقا اور فروغ طب کے بنیادی نظریات و قواعد کے استحکام پر منحصر ہے۔ لہٰذا کلیاتِ طب کے جملہ موضوعات کو جدید میڈیکل سائنس کے مطابق استوار کرنا وقت کا تقاضہ ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، شعبۂ کلیات کو جتنا بے وقعت اب سمجھا جاتا ہے کبھی نہیں سمجھا گیا۔ خواہ وہ طبی درس گاہ ہو یا کوئی اور طبی ادارہ ہر جگہ شعبۂ کلیات بے رغبتی اور سطحیت سے دوچار نظر آتا ہے۔ لہٰذا غفران کلیاتِ طب سے میری رغبت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ خواہش رکھتے تھے کہ میں سابقہ تجربہ کو درگزر کرتے ہوئے مذکورہ پوسٹ کے لیے درخواست دوں۔ بالآخر میں یہ کام کر گزرا اور اللہ کے فضل و کرم سے کامیاب رہا۔

انٹرویو تاخیر سے ہوئے تھے اس لیے یکم نومبر ۲۰۱۶ء کو میں نے جامعہ ہمدرد سے رخصت لی اور ۲ر نومبر ۲۰۱۶ء کو بحیثیت پروفیسر اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ کلیات کو جوائن کیا۔ اوّل روز سے غفران میرے مددگار اور راہ نما ثابت ہوئے۔ حسنِ اتفاق سے ان کا شعبہ میرے شعبہ سے اور ان کا گھر میرے گھر سے قریب تھا، گویا کہ ہمہ وقت مجھے ان کی ہم سائیگی میسر تھی۔ ہم جب بھی ایک ساتھ ہوتے تو بیشتر گفتگو اپنے اپنے شعبہ جات میں جاری طبی سرگرمیوں پر ہوتی جس میں درس وتدریس اور تحقیق وتجدید کے مطلوبہ خواص زیرِ بحث رہتے اور مستقبل کا خاکہ تیار ہوتا۔ ہم دونوں اس بات پر متفق تھے کہ ہمارا نصاب تعلیم قدیم وجدید مضامین پر مشتمل ہے لیکن ہم قدیم وجدید کے درمیان مطابقت قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ گزشتہ چار دہائیوں سے ہم پوسٹ گریجویٹ سطح پر یا دیگر دستیاب ذرائع سے جو تحقیقی کام کر رہے ہیں اس کا پرتو نصابی کتابوں میں نظر نہیں آتا۔ یونانی طب کے بنیادی مضامین مثلاً امورِ طبیعیہ، علم الامراض، نبض بول و براز، کلیات ادویہ، مفردات، مرکبات، صیدلہ وغیرہ کی درسی کتابوں میں کوئی واضح تبدیلی دکھائی نہیں دیتی۔

میری اور غفران کی گفتگو کا سب سے اہم اور نتیجہ خیز پہلو وہ ہوتا تھا کہ جب ہم ایک دوسرے کے شعبوں میں ہونے والی تحقیقی سرگرمیوں پر تنقیدی تبصرہ کرتے تھے۔ وہ کہتے کہ تحقیق وتجدید کے تعلق سے شعبۂ علم الادویہ کا معیار سب سے بلند ہے اور اس معاملہ میں سب سے پست شعبۂ کلیات ہے۔ وہ دلیل دیتے کہ تحقیق کا معیار وہ تحقیقی جرائد طے کرتے ہیں کہ جن میں تحقیقی مقالات شائع ہوتے ہیں۔ جس قدر اعلیٰ اِمپیکٹ فیکٹر کے حامل سائنسی جریدوں میں وافر سائٹیشن کے ساتھ علم الادویہ کی تحقیق منظر عام پر آئی ہیں اور کسی شعبہ نے یہ مثال قائم نہیں کی۔ میں ان کی بات کو کسی حد تک تسلیم کرتا اور کہتا جناب عالی! آپ ٹھیک فرما رہے ہیں، شعبۂ کلیات جدید مطالبات کے مطابق تحقیق کا حق ادا نہیں کر پایا لیکن آپ کی بھی بیشتر تحقیقات کا انحصار ماڈرن فارماکولوجی پر ہے جس کا طریقۂ کار اور ماخوذ نتائج موالید ثلاثہ کی طبی منفعت تو ثابت کرتے ہیں لیکن علم الادویہ کے فقہی مضمون کلیات ادویہ کی ترجمانی نہیں کرتے۔ دوا، غذا، غذائے دوائی، دوائے غذائی، دوائے معتدل، مزاجِ ادویہ، درجاتِ ادویہ، علاج بالمثل، علاج بالضد جیسے موضوعات پر کیا تحقیق ہوئی جو یونانی دوا اور علاج کے بنیادی خواص ہیں۔ غرض کہ ہم دونوں کے مابین ہونے والے بحث ومباحثہ میں صرف تائید ہی نہیں تنقید بھی پائی جاتی لیکن حقیقت پر مبنی صاف گوئی نہ تو سماعتوں پر گراں ہوتی اور نہ ہی دلوں پر شاق، اور یہی دوستی ہے ورنہ بقول انور شعورؔ:

صاف گو دوستوں کو لوگ اپنے
دشمنوں میں شمار کرتے ہیں

خیر! غفران اگر یہ بات نہ بھی کہتے کہ شعبۂ کلیات میں تحقیق وتجدید کا موجودہ معیار اطمنان بخش نہیں ہے تب بھی میں نہ صرف اس کوتاہی کا معترف ہوں بلکہ اس کے موجبات سے بھی واقف ہوں۔ اس ضمن میں محض دو اسباب پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔ پہلا سبب یہ کہ شعبۂ کلیات سے وابستہ ریسرچ اسکالرس کی وافر تعداد وہ ہے کہ جو دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہے۔ وہ عربی، فارسی اور اردو پر قدرت رکھنے کے باعث فطرتاً لٹریری ریسرچ کی جانب مائل ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا ان کے اشہب قلم سے جو تخلیقی وتحقیقی نگارشات وجود میں آتی ہیں وہ شاہکار ہونے کے باوجود یا تو کتابی شکل میں منظر عام پر آتی ہیں یا عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں شائع ہونے والے رسائل وجرائد میں ہی جگہ پاتی ہیں۔ جب کہ اعلیٰ اِمپیکٹ فیکٹر اور وافر سائٹیشن کے حامل سائنسی جریدے جو فی زمانہ تحقیقی معیار کے پیمانے تصور کیے جاتے ہیں نہ صرف انگریزی زبان میں شائع ہوتے ہیں بلکہ لٹریری ریسرچ کے مقابلے میں اپلائیڈ ریسرچ کو فوقیت دیتے ہیں۔ شعبۂ کلیات میں اعلیٰ تحقیقی فقدان کا دوسرا سبب یہ ہے کہ جس طرح علم الادویہ کی تحقیق وتجدید میں فارماکوگنوسی، فارماکولوجی، فائٹوکیمسٹری، فارماسیوٹکس، فارماسیوٹکل کیمسٹری، ٹاکسیکولوجی جیسے جدید مضامین پر مشتمل طریقہ ہائے تحقیق مستعمل ہیں اس طرح کے مستعار طریقۂ ہائے تحقیق کلیات کو حاصل نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کلیاتِ طب کی معیاری تحقیق کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ اناٹومی، فزیولوجی، پیتھالوجی،

بایوکیمسٹری جیسے جدید مضامین کی روشنی میں مسلّم مناہج تحقیق اختیار کیے جائیں لیکن وہ مستعار نہ ہوکر نفسِ مضمون کے مطابق وضع کیے جائیں اور اوّلاً طبیعت اور امورِ طبیعیہ سے وابستہ امور پر تحقیق ہو۔

میرے اور غفران کے درمیان اسی طرح کا تبادلۂ خیال ہوتا تھا جس سے یہ زود رس نتائج برآمد ہوئے کہ علم الادویہ ہو یا کلیات طب دونوں جگہ تحقیق کے حوالے سے کچھ مختلف کام درکار ہے۔ علم الادویہ میں مروجہ تحقیق نفس مضمون یعنی کلیاتِ ادویہ کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اور کلیات میں ہونے والی بیشتر تحقیق مطلوبہ تنقیح وتجدید سے عاری ہے۔ اسی فکر ونظر کے مطابق ہم نے اپنے اپنے شعبوں میں تحقیقی رجحان کو بدلنے کی کوشش کی۔ میں نے شعبۂ کلیات میں تحقیق کو طبیعت اور امورِ طبیعیہ پر مرکوز کرتے ہوئے مطلوبہ سہولیات میں سرِ فہرست فزیالوجی اور بایوکیمسٹری کی لیباٹریز کے قیام مع ماہرین کو ترجیح دی۔ اور غفران نے علم الادویہ کی اساس کلیاتِ ادویہ کے مطابق تحقیق کو باجواز بنانے کی مہم کا آغاز اس طرح کیا کہ ۲۵ر فروری ۲۰۲۰ء کو اپنے شعبہ میں ایک نیشنل سیمینار کا انعقاد کیا جس کا موضوع تھا، 'ہولسٹک (کلیات گائیڈڈ) ریسرچ ان یونانی میڈیسن۔ انھوں نے اس سیمینار میں ناچیز کو بھی عزت بخشی اور میرے خطاب کا عنوان ہی 'کلیاتِ ادویہ' تجویز فرمادیا۔ لہٰذا میں نے کلیاتِ ادویہ کی معنویت، اہمیت اور افادیت کے تعلق سے اپنا مقالہ پیش کیا۔

ہماری دو افراد پر مشتمل جماعت کا موقف یہ تھا کہ طبی اداروں میں انتظام و انصرام کی سطح پر بھلے ہی مختلف شعبے وجود میں آجائیں، تخصیصِ مضامین کے مطابق ماہرینِ فن اپنا اپنا دائرۂ کار متعین کریں لیکن یونانی طب کی بقا اور فروغ کے تعلق سے ہم سب کا ہدف مشترک ہو۔ اور وہ ہے کلیات طب میں مذکور نظریات وقواعد کا علمی اور عملی فروغ نیز عصری تقاضوں کے مطابق ان کی تنقیح وتجدید۔ اس نظریہ کے حامل افراد کی جماعت جتنی بڑی اور فعال ہوگی اسی مناسبت سے اس مقصد کی تکمیل ہوگی۔ ہم نے اس فکر کو عام کرنے کے واسطے عملی نمونہ پیش کرنے کی سعی کی جس کا آغاز ہوا ہی تھا کہ غفران سانحۂ ارتحال سے دوچار ہوگئے۔

یہ بات خوش آئند ہے کہ شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ کے موجودہ صدر ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب نے اپنے سابقہ صدر اور شعبہ کے ایک اہم رکن پروفیسر غفران احمد کے قبل از وقت انتقال کے بعد نہ صرف شعبے کے انتظام کو بہ حسن وخوبی سنبھالا ہے نیز ان کے زیر صدارت علمی سرگرمیوں کو بھی فروغ ملا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر عبدالرؤف نے اپنے مختصر سے عہد صدارت میں قابل تحسین اقدام کیے ہیں۔ دریں اثناوہ ایک نیشنل سیمینار بہ عنوان 'اِنٹیگریٹیو اپروچ فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن' کا پروقار انعقاد کرنے میں بھی کامیاب رہے۔ ڈاکٹر عبدالرؤف نے بھی مجھے عزت بخشی اور کلیات اور علم الادویہ کے باہمی ربط کو فوقیت دیتے ہوئے مجھے یہ حکم دیا کہ میں سیمینار میں 'مزاجِ ادویہ بحوالہ کلیاتِ ادویہ' سے مُعَنْوَن اپنا مقالہ پیش کروں۔ اس عنایت کے لیے میں ڈاکٹر صاحب کا ممنون ہوں۔ غرض کہ میرے اور غفران کے مابین قربت کی بنا پر شعبۂ کلیات اور شعبۂ علم الادویہ کی دیواروں میں بھی روزن پیدا ہوگئے جن سے گزرنے والی روشنی اس بات کی علامت ہے کہ کلیاتِ طب کے تحت پڑھے اور پڑھائے جانے والے یونانی طب کے بنیادی نظریات اور اصول وضوابط سے صرفِ نظر کرکے حاملینِ فن کے ذریعہ انجام دی ہوئی کوئی بھی تحقیق وتجدید یونانی طب کی بقاء اور فروغ کی مناسبت سے بارآور نہیں ہوسکتی۔

آخر میں اپنے مشفق ومخلص دوست غفران احمد فلاحی کے حق میں مغفرت کی دعا کرتا ہوں اور مرحوم کی تعظیم میں اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:۔

کیا کبھی وہ چراغ گُل ہوگا
جس نے روشن کئی چراغ کیے

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

بھلا سکے گی نہ یہ خاکِ عنبریں تجھ کو

ڈاکٹر فضل الرحمٰن ☆

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

عام طور سے موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے، موت کے انتخاب سے کسی کو مفر نہیں ہے، قرآن بھی کہتا ہے: "قل ان الموت الذی تفرون منہ فانہ ملاقیکم" (ان سے کہو، جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تمھیں آ کر رہے گی)، لیکن فرشتۂ اجل کا موت کے لیے غفران بھائی کو منتخب کرنا آج بھی بڑا سانحہ لگتا ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے ہیں لیکن غفران بھائی کی موت کے بعد ہماری زندگی میں نشیب ہی نشیب نظر آتے ہیں، ان کی مفقودیت کا احساس ہمہ وقت ذہن کو اداس اور دل کو مغموم رکھتا ہے، ان کی موت نے ان کے اعزہ و اقارب کی دنیا میں جو غم و حزن کا سایہ چھوڑا ہے شاید اس دنیا میں ایسا کوئی اجالا نہیں جو اس کا ازالہ کر سکے۔

وہ شخص سب کو محبوب تھا، ہر ایک اس پر جان چھڑکتا تھا، اس کی واحد وجہ ان کی لوگوں سے بے لوث محبت، لگاؤ، قربت، خیال اور ان سب سے پرے ان کا انسانیت سے گہرا رشتہ تھا۔ اس رشتہ کی اولین بنیاد ان کا اعلیٰ درجہ کا اخلاق تھا۔ ان کے مطابق انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے شرف کی پہچان اور قدر کے لیے دنیا کے دیگر لوازمات کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اخلاق، علم اور تقویٰ ہی کافی ہوتے ہیں۔ غفران بھائی کے نزدیک زندگی میں معاملات کرنے کا یہی ایک پیمانہ تھا۔ وہ اس جہاں سے رخصت ہو گئے اور اپنے ساتھ اپنی تمام خصوصیات بھی لے گئے جواب میرے لیے دوسروں میں تلاش کرنا ناممکن ہے۔ کسی دانا کا قول ہے کہ ''ایک اچھے انسان میں خوبیوں اور اس کے کمالات کو تلاش نہیں کیا جاتا ہے بلکہ وہ تو اس کے الفاظ، انداز، عادات و اطوار اور ہر عمل سے از خود جھلکتے ہیں''، یہ قول ان پہ پوری طرح سچ ثابت ہوتا ہے۔

غفران بھائی میرے بہنوئی ہونے سے پہلے میرے دوست تھے، اب میں کس سے اور کیسے بتاؤں کہ اس دوستی میں کیا کچھ پوشیدہ تھا، وہ میرے لیے عزیزوں سے زیادہ عزیز اور بڑوں سے زیادہ بڑے تھے۔ ہوسکتا ہے اور بھی لوگ اس دنیا میں اور بھی بڑی بڑی خصوصیات کے مالک ہوں لیکن ان کی خوبیاں مجھے اس لیے پسند تھیں کہ یہ خوبیاں غفران بھائی کی تھیں۔ میں جب بھی پریشان ہوتا تو ان سے گفتگو کرتا، کوئی اچھی بات سنتا تو ان سے ذکر کرتا اور اگر کوئی اچھی کتاب ختم کرتا تو ان سے اس پر تفصیلی گفتگو کرتا، بغیر ان سے ایک طویل گفتگو کے میرے لیے ہفتہ وار چھٹی کا کوئی معنیٰ نہیں تھا۔ وہ میری زندگی میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ اب بھی یقین نہیں ہوتا کہ وہ ہمارے بیچ نہیں رہے۔ ان کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے یہ سوچتا ہوں کہاں سے شروع کروں اور کیسے شروع کروں۔ ان کے تعلق سے کچھ سوچنا شروع کرتا ہوں تو خیالات باہم متصادم ہو جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے کون سے وصف کو اولیت دوں اور کسے مؤخر رکھوں۔ علامہ اقبال کا مصرعہ یاد آ رہا ہے: ع

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

غفران بھائی صحیح معنوں میں اس مصرع کی حقیقی تصویر تھے اور شاید یہی تاثیر تھی جس کی وجہ سے وہ اساتذہ، طلبہ، خاندان کے افراد، دوست احباب، اور ہر چھوٹے بڑے کے درمیان بہت مقبول رہے۔

میری ان سے پہلی ملاقات غالباً علی گڑھ میں ہوئی تھی جب میں نے Class XI میں داخلہ لیا تھا، اس وقت وہ وہاں اجمل خان طبیہ کالج میں زیر تعلیم تھے اور اس کے بعد ان سے ملاقات کا یہ سلسلہ برابر قائم رہا۔ یوں تو وہ میرے خالہ زاد بھائی تھے اور بعد میں ان کی شادی میری اکلوتی چھوٹی بہن سے ہوگئی لیکن ان کا

☆سینئر فیلو، انڈین کونسل آف ورلڈ افیئرس، نئی دہلی۔ Email:fazzur@gmail.com، Mob.No:9811214198۔

معاملہ میرے ساتھ اس رشتہ کی بنا پر نہیں تھا، یہ ضرور ہے کہ اس رشتہ کی وجہ سے ہمیں غفران بھائی کو اور قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور جیسے جیسے مہینہ اور سال گزرتے گئے ہم پر ان کی شخصیت کے الگ الگ پہلو عیاں ہوتے چلے گئے۔ وہ ایک خوددار، غریب پرور، صاحب علم اور اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ انھوں نے اپنے لیے ملنے ملانے کا جو پیمانہ متعین کر رکھا تھا وہ عام لوگوں سے بالکل مختلف تھا، اس میں دنیا کی چکاچوند، دولت، لباس اور دوسری لوازامات کا کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ خود با اخلاق انسان تھے اور لوگوں سے حسنِ اخلاق کی توقع کرتے تھے، البتہ اپنے تعین کردہ پیمانہ کا دوسروں پر نفاذ نہیں کرتے تھے۔ تاہم وہ یہ کوشش کرتے کہ جو لوگ اس معیار سے پرے ہیں ان سے اجتناب برتیں۔

ان کی خاکساری کا یہ حال تھا جب بھی وہ میرے یہاں (دہلی) آتے تو ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ مجھے تمھارا مکان بہت پسند ہے، حالانکہ میرا مکان اتنا Furnished نہیں تھا لیکن اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میرا مکان اوکھلا کے عام مزاحم علاقہ سے ہٹ کر تھا اور دوسری بات یہ کہ وہ پرسکون ماحول کے عادی تھے۔ ان کی اِن ترجیحات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آرام، اطمینان، سکون اور خوشی یہ ساری چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کی گفتگو کا انداز بڑا شائستہ تھا، ان کے ساتھ طویل گفتگو بھی قصیر لگتی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی گفتگو میں اکثر مزاح کا پہلو ہوتا تھا۔ یوں تو وہ طبی دنیا کے آدمی تھے لیکن ان کو اردو ادب سے اعلیٰ درجے کا شغف تھا، ان کے اس علمی پہلو سے بہت سے لوگ آگاہ نہیں تھے۔ علی گڑھ میں اردو ادب کا حلقہ ان سے کافی قریب تھا، ان کے ساتھ ان کا اکثر اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا اور وہ ان کی گفتگو بیشتر اوقات میرے ساتھ سانجھا کرتے تھے۔ دنیا کی دکھاوے بازی سے ان کو حد درجہ کی کڑھن ہوتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ آج کی علمی اور ادبی دنیا میں بھی الگ الگ طرح کا دکھاوا آچکا ہے جس کا براہ راست تعلق لوگوں کی لاعلمی سے ہے، وہ اس بات کے قائل تھے کہ علم اور مادیت پرستی کا تعلق کسی طرح نہیں ہوسکتا ہے۔

وہ طبی دنیا کے ماہرین میں سے تھے اور میں بین الاقوامی سیاست کا طالب علم لیکن اکثر ہمارے درمیان گفتگو ایسی شکل اختیار کر لیتی کہ ہم گھنٹوں منہمک رہتے اور وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ ان کے نزدیک گفتگو کا مطلب صرف وقت گزاری نہیں تھا بلکہ وہ بدلتی ہوئی طرز زندگی سے متعلق مثبت تبادلۂ خیالات کو فوقیت دیتے۔ میرا علی گڑھ اکثر جانا ہوتا تھا، غفران بھائی کے تعلق سے جو چیز مجھے حد درجہ تک متعجب کرتی تھی وہ تھا ان کا وقت کا مثبت استعمال، میں نے یہ پڑھا ہے اور بڑوں سے سنا بھی ہے کہ انسان کی کامیابی کا اصل محور یہ ہے کہ انسان اپنے وقت کو کیسے استعمال کرسکتا ہے اور میں نے اس معاملے میں ان کو ایک بے مثال شخص پایا۔

وہ اخلاق مند ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کے مہمان نواز بھی تھے۔ مجھے کبھی کبھی فکر ہوتی تھی کہ میرا علی گڑھ کا سفر ان کے روزمرہ کی معمولِ زندگی کو متاثر کرتا ہے اور خاص طور پر اُن کے مطالعے میں خلل پیدا کرتا ہے لیکن مجھے ان کے صاحبزادے بتاتے تھے کہ وہ آپ سے گفتگو کے بعد دیر رات تک مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے شاگردوں اور دوستوں سے یہ اطلاع بھی مجھ تک پہنچی ہے کہ وہ اکثر اوقات اپنے شعبہ کے کمرہ میں باہر سے تالا لگوا دیتے تھے تاکہ ان کے مطالعے میں کوئی خلل نہ ہو، لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہیں تھا کہ وہ مہمانوں سے مفرر رکھتے تھے۔ وہ بارہا کہا کرتے تھے ان کے طلبہ کا ان پر حق ہے اور اس حق کی ادائیگی بغیر مطالعہ کے ممکن نہیں۔ اس حق کی ادائیگی انھوں نے جس طرح سے کی وہ تو ان کے طلبہ اور ساتھی بخوبی جانتے ہیں، یہاں مجھے ان کے ایک طالب علم کا جملہ آج تک یاد ہے جس نے ایک بار کہا تھا: ''غفران سر کی پہلی کلاس کرنے کے بعد ہمارے ذہن میں جو روشنی ہوئی وہ آج تک قائم ہے۔'' حالانکہ وہ پروفیسر تھے لیکن میں اس عہدہ سے ان کو خطاب نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ کہا کرتے تھے عہدوں سے علم کا کوئی تعلق نہیں، یہ سب عارضی چیزیں ہیں، دائمی تو علم ہوتا ہے جس کو عہدے سے منسلک کرنا علم کی اہانت ہے۔ مجھے یہاں پر افلاطون کا جملہ یاد آتا ہے، جس نے یہ کہا تھا کہ ''عالم کے پاس علم کی شکل میں سونے و جواہرات ہیں تو اس کو ان عہدوں کی شکل میں ان چھوٹی چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟'' یہاں یہ بات سچ ثابت ہوتی ہے کہ ایک عالم کی موت ایک عالَم کی موت ہے۔

غفران بھائی صرف طلبہ کے ہی درمیان میں مقبول نہیں تھے بلکہ وہ اپنے ساتھیوں اور اساتذہ میں بھی مقبول تھے، اس کی واحد وجہ ان کا علم سے شغف، ان کا اعلیٰ اخلاق، ان کی محنت، طلبہ کے لیے ان کی دیانت داری اور ہمیشہ ایک فکر کہ کسی

کی حق تلفی نہ ہوجائے تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں اور اساتذہ کی بہت عزت کرتے تھے، لیکن علمی بحث ومباحثہ میں بڑی بے باکی اور حق گوئی سے کام لیتے تھے، یہاں پر بھی ان کی نیت کبھی یہ نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنی علمی بالادستی کو قائم کریں، بلکہ وہ تحقیق کو ترغیب دیتے تھے۔ اصل محقق کبھی بھی خلا میں گفتگو نہیں کرتا ہے بلکہ وہ اپنی بات کو ناپ تول کر شواہد اور حقائق کی روشنی میں بیان کرتا ہے، غفران بھائی بھی انھیں محققین میں سے ایک تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں نے ان سے حکیم اجمل خان پر ایک مضمون کا ذکر کیا تھا، جو ایک تاریخ کی مرتب کتاب میں شائع ہوا تھا، تو انھوں مجھ سے کہا تھا کہ اس کو تلاش کر کے فوراً مجھے بھیجنا اور میں نے اس مضمون کو بعد میں انھیں ارسال کیا تھا۔ ان کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہر کام کو خواہ اپنا ہو یا دوسروں کا بڑی خوشنودی اور مستعدی سے انجام دیتے تھے اور کسی کو محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اپنے یا کسی اور کے کام میں مشغول ہیں۔ معمولی سے معمولی یا بڑے سے بڑے کام کو وہ اس طور پر کرتے تھے جیسے ہم اور آپ غیر شعوری طور پر یہ سانس لیتے ہیں۔ وہ بغیر کسی قسم کا اعلان کیے اور بغیر کسی توقع کے دوسرے کے کام کو انجام دیتے اور بعد میں اس کا کوئی تذکرہ بھی نہیں کرتے۔ نظم وانتظام میں مہارت رکھنے کے باوجود کبھی بھی ان کے اندر کسی عہدے کی لالچ نہیں تھی، جو آج کل ایک بہت ہی عام بات ہے۔ وہ ہمیشہ ان عارضی عہدوں سے دور رہتے تھے، جب انھیں پہلی بار اپنے شعبہ کا صدر بننے کی نوبت آئی تو انھوں نے معذرت کر دی، ان کا خیال تھا، اس عہدہ سے صرف اور صرف وقت ضائع ہوتا ہے، اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ان سے میری بہت ساری یادیں منسلک ہیں لیکن ان یادوں کو قلم بند کرنا اتنا سہل نہیں کیوں کہ یہ تحریر بار بار دل ودماغ میں ایک لرزہ پیدا کرتی ہے کہ میرا عزیز دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ میں اس بات سے قاصر ہوں کہ اس حقیقت کو قبول کروں اور یقین کرلوں کہ اب غفران بھائی ہمارے درمیان نہیں ہیں اور اپنے خالق سے جا ملے ہیں۔ جب وہ موجود تھے تو ان کی مثال نعائم فطرت کی سی تھی مثلاً ہوا، پانی اور روشنی جو اس درجہ عام ہے جن کی فراہمی میں چند لمحے کے لیے کوئی خلل آجائے تو پھر دیکھیے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کی زندگی کا مطلب میرے لیے کچھ یوں ہی تھا:۔

جو شمعِ بزم جہاں تھے　　کہاں گئے وہ لوگ
جو راحتِ دل و جاں تھے　　کہاں گئے وہ لوگ
جو روحِ عمر رواں تھے　　کہاں گئے وہ لوگ
ابھی ابھی تو یہاں تھے　　کہاں گئے وہ لوگ

۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء کا دن آج بھی میرے ذہن پر ایک بھیانک خواب کی طرح منقوش ہے، وہ میری زندگی کا سب سے خوفناک لمحہ تھا جب میں نے اپنے بڑے بھائی کو کسی سے فون پر کہتے ہوئے سنا تھا کہ رہنے دو اب مزید کوشش مت کرو، یہ بات وہ غفران بھائی کے بارے میں کہہ رہے تھے جو اس وقت دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ مسلسل کوششوں اور جدوجہد کے باوجود میں اس منظر کو نہیں بھول پاتا ہوں، جب انھیں ایمبولینس سے لکھنؤ کے مکان میں لایا گیا اور میں اس مقام سے گزرا بھی نہیں جہاں ان کو رکھا گیا تھا کیونکہ میری آنکھیں غفران بھائی مرحوم کو دیکھنے کے لیے راضی نہیں تھیں۔ میرے پاس وہ قوت نہیں تھی کہ میں ان کو دیکھ سکوں۔ مجھے کچھ نہیں پتا کہ ان کو کب اور کیسے غسل دیا گیا اور اس میں کون لوگ شامل تھے۔ مجھے آج بھی یاد نہیں کہ میں نے ان کی نماز جنازہ کیسے پڑھی؟ لیکن مجھے یہ بخوبی یاد ہے کہ میں ان کی قبر سے کافی دور کھڑا ہو کر اپنے اس عزیز دوست کو مدفون ہوتے دیکھ رہا تھا اور اپنی پوری کوشش کے باوجود میرا قدم ان کی قبر تک نہیں بڑھ سکا تھا کہ میں ان کی آخری رسومات میں شامل ہو جاؤں۔ ایک عرصہ گزرنے کے بعد، آج بھی میرے پاس ہمت وقوت نہیں کہ میں کسی سے پوچھوں کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے ان کی آخری رسومات کو ادا کیا۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ان کے صاحبزادے نصران سے پوچھوں کہ ان کی رسومات کیسے ہوئیں اور کس نے کیں، لیکن یہ خیال ہنوز دائرۂ فکر تک ہی محدود ہے۔

بس اللہ سے ایک ہی دعا ہے کہ اللہ کسی اور کو ایسی آزمائش سے بچائے اور اس طرح کی صبر آزما تکلیف سے کسی اور کو دوچار نہ کرے اور نہ کسی کو کسی کے تئیں اتنی محبت دے کہ اس کی جدائی ناقابلِ قبول ہو۔ غفران بھائی آپ کی خوبیاں زندہ اور نیکیاں باقی!

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

تجھ سا کہیں کسے!!

آہ! ڈاکٹر غفران احمد

پروفیسر محمد سمیع اختر فلاحی ☆

موت تو ایک حقیقت ہے، ہر انسان اس دنیا میں ایک متعین مدت حیات لے کر آیا ہے اور اس مدت کے ختم ہونے کے بعد اسے اس دنیا سے رخصت ہونا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" (ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے) حاکم ومحکوم، بادشاہ وفقیر، مرد وعورت، بوڑھا ونوجوان، آقا وغلام اور امیر وغریب کسی کی بھی زندگی ابدی نہیں ہے، اسی طرح انسان کا کسی کے موت پر افسردہ اور غم زدہ ہونا بھی فطری ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کی سرشت میں ایسے احساسات وجذبات کو ودیعت فرما دیا ہے جو خوشی اور غم دونوں صورتوں میں متأثر ہوتے ہیں، کسی کی موت پر حزن وغم اور رنج والم کی یہ کیفیت اس صورت میں کئی گنا بڑھ جاتی ہے جب کوئی اپنا بہت قریبی رشتہ دار یا بہت قریبی دوست مالک حقیقی سے ملاقات کے لیے اپنے آخری سفر پر روانہ ہوجاتا ہے۔ اپنے کسی عزیز کا اس دنیا سے رخصت ہوجانے کا درد وغم کیا ہوتا ہے اس کا حقیقی احساس پہلی بار اس روز ہوا جب ۳۰/مارچ ۲۰۱۰ء میں والد محترم چلتے پھرتے اور گفتگو کرتے ہوئے اپنے رب حقیقی سے جا ملے، اس روز احساس ہوا کہ والد محترم کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کس قدر عظیم نعمت سے نوازا ہے، افسوس ہم اپنی مصروفیتوں کی بدولت وقت رہتے ہوئے ان کی خدمت کے ذریعہ اپنی آخرت کو سنوارنے کا ساز وسامان نہیں کر پاتے، اس روز شدت سے احساس ہوا کہ سراپا رحمت و شفقت اور الفت ومحبت کا یہ شجر سایہ دار اب ہمارے سروں پر نہیں رہا، جن کی بدولت اب تک ہم زمانے کی ہر طرح کی الجھنوں اور پریشانیوں سے محفوظ تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے آمین! "رب ارحمهما كما ربياني صغيرا" (اے اللہ ان دونوں کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ فرما جس طرح ان دونوں نے شفقت ومحبت سے ہماری نگہداشت فرمائی ہے)۔

۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء کو دوسری بار اسی غم والم کا احساس اس وقت ہوا جب اپنے مخلص ترین اور وفا شعار دوست پروفیسر ڈاکٹر غفران احمد (۱۹۶۴ء-۲۰۲۱ء) کے انتقال کی خبر موصول ہوئی، ایک لمحہ واقعی ایسا محسوس ہوا کہ پاؤں تلے زمین نکل گئی، اس روز دوسری بار احساس ہوا کہ ایک بہت قریبی اور وفادار دوست کی زندگی میں کیا اہمیت ہوتی ہے، دوست سے خون کا رشتہ تو نہیں ہوتا لیکن بسا اوقات اس قدر قربت اور اپنائیت ہوجاتی ہے کہ اجنبیت کی ساری دیواریں منہدم ہوجاتی ہیں، اور وہ رشتہ داروں سے بھی زیادہ قریب معلوم ہونے لگتا ہے، ہم دونوں کی رفاقت ایک دو سال نہیں بلکہ تقریباً چالیس سال پرانی اور بدستور قائم تھی، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ دوستی برابر مضبوط ہوتی گئی، اور ہم ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہوگئے کہ ہم دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے لیے کھلی کتاب تھی، یوں تو مرحوم کی طبیعت ۱۰/اپریل ۲۰۲۱ء سے ہی خراب تھی، بخار مستقل آرہا تھا، لیکن ٹیلی فون اور واٹس ایپ پر یہی کہتے رہے کہ بخار ہے ان شاء اللہ ٹھیک ہوجائے گا، جب کہ وہ ایک کامیاب اور تجربہ کار ڈاکٹر تھے، وہ یقیناً اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ ''وہ کورونا'' مرض میں مبتلا تھے، ۲۰/اپریل کو میسیج آیا، اللہ کا شکر ہے اور دعا کی درخواست ہے، دراصل

☆ سابق صدر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش۔ Mob.No:9897053096، Email:m.samiakhter@gmail.com۔

وہ مرض کی اطلاع دے کر دوسروں کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے، اللہ تعالی نے ان کو ہمت وحوصلہ عطا کیا تھا، ان کی یہ عادت تھی کہ اپنی تکلیف حتی الامکان دوسروں کو سامنے بھی بیان نہیں کرتے تھے، لیکن دوسروں کی تکلیف و پریشانی کو نہ صرف سنتے بلکہ عملی تدبیر بھی کیا کرتے تھے، تشویش تو ہو رہی تھی کیوں کہ کورونا وبا کی دوسری خطرناک لہر شروع ہو چکی تھی، ان کے اس مہلک مرض کا علم ان کے شاگرد ڈاکٹر شمشاد عالم اور ان کے بیٹے نصر ان کے ذریعہ اس روز ہوا جب ان کو آکسیجن میں شدید کمی کے سبب میڈیکل کالج میں ایڈمٹ کرانا پڑا، اس کے بعد مرض کی شدت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا، یہاں تک کہ مزید بہتر علاج کے لیے ان کے اعزہ ان کو ۲۶/اپریل کو لکھنؤ لے گئے۔

وہ خود ایک ڈاکٹر تھے، سینکڑوں مریضوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ سے شفا دی تھی، میرے والد صاحب جب تک حیات تھے ان ہی کا علاج کرواتے تھے، میری والدہ محترمہ دسیوں سال سے صرف ان کی تجویز کردہ دوائیں کھا رہی ہیں، میرے ایک فون پر وہ ان کو دیکھنے بذات خود آجایا کرتے اور ان کی دعائیں لیتے، دیگر شہروں میں مقیم میرے بھائی بہن بھی ان کے زیر علاج تھے، اور ابھی بھی وہ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے، کھانے پینے میں محتاط، کھیلنے اور جسمانی ورزش کا اہتمام کرتے، لیکن جب معاملہ نوشتہ تقدیر کا ہو تو تمام تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں اور تقدیر کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے، بہر کیف کئی دنوں تک تو مجھے خود یقین نہیں آیا، میرا دل کسی طرح اس خبر کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اب میں اپنے عزیز ترین دوست کی رفاقت، اس کی بے لوث محبت، اس کی عنایتوں اور اس کے مخلصانہ مشوروں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا ہوں، میں نے لوگوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض نیک اور اچھے بندوں کو جلد اپنے پاس بلا لیتا ہے، اور یہ قول مرحوم کے حق میں سچ معلوم ہوتا ہے، وہ واقعی اللہ کے نیک بندے تھے جو بیماری کی حالت میں رمضان المبارک کے مقدس مہینہ اور مقدس دن جمعہ کے روز ۳۰/اپریل کو اپنے رب حقیقی سے جا ملے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، ان کی لغزشوں اور خطاؤں کو درگزر فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے اہل وعیال کو صبر وسکون عطا کرے، آمین یا رب العالمین۔

ابھی بھی جب کبھی فون پر یا کسی مجلس میں کوئی مرحوم کا ذکر خیر چھیڑ دیتا ہے تو آنکھوں سے بے ساختہ آنسو رواں ہو جاتے ہیں، یقین نہیں آتا کہ اب ہماری بے تکلف ملاقاتیں، پر لطف باتیں محض یادیں بن کر رہ جائیں گی، ابھی بھی جب کبھی ان کا خیال آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے ان کی باوقار شخصیت اور مسکراتا چہرہ سامنے آجاتا ہے، وہ بے پناہ عزم وحوصلہ کے حامل ایک باکردار اور وفا شعار انسان تھے، لمبا قد، چھریرا بدن، گورا رنگ، مسکراتی ہوئی بڑی آنکھیں، زیر لب ہنسی، پر تپاک چہرہ، ہلکی خشخشی داڑھی، خوش لباس، خوش مذاق، خوش گفتار انسان کا تصور ذہن پر مرتسم ہو جاتا ہے، ان کی ظاہری شخصیت بھی نہایت پر کشش اور جاذب نظر تھی، میں نے بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ کسی نئے اور انجان شخص سے پہلی ملاقات کے دوران ہی ان کی گفتگو کے انداز میں ایسی اپنائیت ہوتی کہ وہ شخص پہلی ہی ملاقات میں ان کا گرویدہ ہو جاتا اور ان کو اپنا قریبی دوست اور ہمراز سمجھنے لگتا، ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی اور سب سے بڑا کمال یہی تھا کہ ہر شناسا شخص ان کو اپنا سب سے زیادہ قریبی دوست سمجھتا اور مرحوم بھی کبھی اسے مایوس نہیں کرتے، آج ہمارے معاشرے میں ایسے افراد نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں جن کے پاس دوسروں کی باتیں سننے، ان کے مسائل حل کرنے کے لیے وقت ہو، یہی وجہ ہے کہ ان کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا، جس میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے اساتذہ، طلبہ، ریسرچ اسکالروں کے علاوہ دینی، علمی، سماجی اور سیاسی حلقوں کے لوگ شامل تھے، اور یہ تمام ہی افراد ان کی بڑی عزت کرتے تھے، وہ دینی ذہن کے حامل تھے، جماعت اسلامی کے پروگراموں اور ماہانہ اجتماعات میں شریک ہوتے، تبلیغی جماعت کے افراد سے بھی ان کے اچھے تعلقات تھے اور وہ ان کی عزت کرتے تھے، انھوں نے اپنے تعلقات کو کبھی اپنے ذاتی فائدے کے لیے استعمال نہیں کیا، بلکہ وہ بسا اوقات اپنے تعلقات کو

اپنے بعض احباب کے مسائل حل کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے، وہ اپنی بے پناہ علمی و تحقیقی مصروفیات کے باوجود شعبے اور گھر ہر جگہ پر ہر نو وارد کا مسکراتے ہوئے اور خندہ پیشانی سے استقبال کرتے، انھوں نے کسی کے لیے ''نا'' کہنا تو سیکھا ہی نہیں تھا، اپنا آرام وسکون تج کر اور اپنا ذاتی نقصان برداشت کر کے دوسروں کو فائدہ پہنچانا ان کی عادت ثانیہ تھی، اگر کسی پڑوسی یا جاننے والے کی طبیعت خراب ہو تو اس کے اعزہ سے قبل وہ خود اسے لے کر اسپتال پہنچ جایا کرتے، کبھی پوری رات اس کے پاس گزار دیا کرتے، ان کے انتقال پر صرف ایک میرا دل ہی افسردہ نہیں بلکہ ان کے احباب کا پورا حلقہ رنج والم کی کیفیت میں مبتلا ہے، اور ان کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے، علی گڑھ میں ان کے احباب ورفقاء کے وسیع حلقے میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس کی آنکھیں ان کے انتقال کی خبر سن کر اشک بار نہ ہوئی ہوں اور اس کا دل افسردہ نہ ہوا ہو۔

اپریل ۲۰۲۱ء کی دوسری وتیسری دہائی میں کورونا وبا کی دوسری لہر کے دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بڑی تعداد میں اپنے سبکدوش اور کارگزار قد آور علمی شخصیات سے محروم ہوگئی۔ موجودہ دور میں طب، سائنس اور انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی اپنی تمام تر محیر العقول ایجادات وترقیات کے باوجود عالمی سطح پر اس وبائی مرض پر قابو پانے میں اب تک ناکام ہے اور اس دوسری لہر کے دوران صرف علی گڑھ ہی نہیں بلکہ پورے ہندستان میں ہزاروں افراد اس مرض کے سبب لقمۂ اجل بن رہے ہیں، محترم شیخ الجامعہ پروفیسر طارق منصور نے یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے اپنے تمام فاضل اور قابل رفقاء کار کی رحلت پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور ان کے انتقال کو بالخصوص یونیورسٹی اور بالعموم پوری علمی دنیا کا بڑا نقصان قرار دیا ہے، محترم شیخ الجامعہ نے پروفیسر ڈاکٹر غفران احمد کے انتقال پر اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ہربل میڈیسن کے میدان میں ان کی گراں قدر علمی وتحقیقی خدمات کا ذکر کیا جو عالمی سطح پر ٹریڈیشنل میڈیسن کے میدان میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، اور مرحوم کے تعلق سے انھوں نے اپنے تعزیتی پیغام میں ایک خاص بات یہ کہی کہ ''پروفیسر غفران احمد کا رخصت ہو جانا ان کا ذاتی نقصان بھی ہے'' اس سے ظاہر ہے کہ شیخ الجامعہ کو ان سے ذاتی قربت و انسیت بھی تھی اور وہ ان کی صلاحیتوں اور خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھے، بہرکیف راقم تو تقریباً چار دہائی پر مشتمل ان کی پُرخلوص رفاقت اور بے لوث محبت، بے غرض احسانات اور بے پناہ اپنائیت کو بھلائے نہیں بھلا سکتا۔

موصوف واقعی اس دور میں انسان اور انسانیت کا درد رکھنے والے ایک عظیم انسان تھے، میں نے بارہا دیکھا اور محسوس کیا کہ ان کو دوسروں کے کام آکر دلی خوشی ہوتی تھی، وہ کسی کی مشکل یا پریشانی کو دور کرنے کے لیے ذاتی طور پر ہر ممکن کوشش کرتے، اپنے ذاتی تعلقات کو استعمال کرتے، ان کی نیت ہمیشہ دوسروں کو دینے اور فائدہ پہنچانے کی ہوتی اور بدلے میں کچھ لینے کی خواہش کبھی نہیں رہی، ان کے دوسروں کے ساتھ احسان کرنے اور احسان کر کے بھول جانے کی عظیم انسانی صفت کو دیکھ کر مجھے مشہور عربی ادیب اور اجتماعی موضوعات پر لکھنے والے مصنف مصطفیٰ لطفی منفلوطی کا مقالہ "الغنی والفقیر" یاد آگیا جس میں اس نے موجودہ انسانی معاشرے سے اعلیٰ اخلاقی وانسانی قدروں کے رخصت ہو جانے پر شدید رنج وغم کا اظہار کیا اور اس دنیا میں احسان کرنے والوں کی درجہ بندی کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

> ''انسان اور حیوان کے درمیان وجہ امتیاز احسان ہے، حیوان صرف اپنے وجود کی بھلائی کے متعلق سوچتا ہے مگر انسان صرف اپنے بارے میں نہیں بلکہ اپنے دیگر ساتھیوں کے متعلق بھی فکرمند رہتا ہے، آج معاشرے میں عام طور پر تین طرح کے انسان پائے جاتے ہیں، ایک تو وہ جو دوسروں کے ساتھ اس لیے اچھا سلوک کرتا ہے تاکہ وہ اس احسان کے ذریعہ اس کا استحصال کرے اور اسے اپنا غلام بنالے، یہ انسان کی نہایت ظالم وجابر قسم ہے، دوسرا انسان وہ ہے جو صرف اپنی بھلائی اور اپنے نفع ونقصان کے متعلق سوچتا ہے، یہ اول درجے کا حریص وخودغرض انسان ہے کہ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ انسان کی رگوں میں بہنے والے خون کو سونے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے تو وہ تمام انسانوں کو قتل کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائے، انسانوں کی تیسری قسم وہ ہے جو نہ اپنے اوپر احسان کرتا ہے اور

نہ دوسروں پر کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے، یہ بیوقوف بخیل ہے جو خود بھوکے پیٹ سوتا ہے تاکہ اس کی تجوری بھری رہے، مگر انسان کی ایک چوتھی قسم بھی ہے جو دوسروں پر احسان کرکے اسے اپنے اوپر احسان سمجھتا ہے اور وہ کسی کے کام آکر خوش ہوتا ہے اور بدلے میں کچھ نہیں چاہتا، اور اس انسان کے بلند مقام ومرتبہ کے کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا جو معاشرے میں شاذونادر ہی نظر آتے ہیں، شاید اسی انسان کو یونانی فلسفی ڈیوجانس دن کے اجالے میں لالٹین لے کر ڈھونڈ رہا تھا، جب لوگوں نے اس فلسفی سے پوچھا کہ دن کے اجالے میں لالٹین لے کر کیوں گھوم رہا ہے تو اس نے جواب دیا تھا کہ میں انسانوں کی اس بھیڑ میں انسان کو تلاش کررہا ہوں۔''

آج ہمارا معاشرہ بھی ایسے بے غرض، مخلص اور محسن انسانوں سے خالی ہوتا جارہا ہے جو صرف اپنے دل کی تسلی اور اپنے نفس کی خوشی کی خاطر دوسروں کے کام آتے ہوں اور بدلے کی کوئی توقع نہ رکھتے ہوں، میں اپنے طویل ذاتی تجربات کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم غفران احمد واقعی عظیم انسان تھے جنھوں نے ہمیشہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے کی کوشش کی اور اپنے مسائل اپنی تکلیف اور اپنی پریشانی کو حتی الامکان چھپانے اور ازخود دور کرنے کی کوشش کی، ان کے انتقال کے بعد احباب کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ یونیورسٹی کے حلقے میں کافی مقبول تھے، یہاں تک کہ میڈیکل کالج کے ڈاکٹر صاحبان بھی ان کی تشخیص اور ان کی تجویز کردہ دواؤں پر بھروسہ کرتے تھے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

علمی مقام ومرتبہ

پروفیسر غفران ایک با اخلاق، ملنسار، شیریں کلام اور اچھے انسان ہونے کے ساتھ علم وتحقیق کی دنیا میں بھی اپنے معاصرین کے درمیان ممتاز حیثیت کے حامل تھے، یونانی طب کے علاوہ ماڈرن میڈیسن پر بھی ان کی گہری نظر تھی، بحث وتحقیق سے ذاتی دلچسپی تھی، بحث وتحقیق کے اس ذوق کو پروان چڑھانے میں ان کے مشفق ومحسن استاد ڈاکٹر یوسف امین صاحب کی تربیت اور سرپرستی کا بڑا دخل تھا، اپنی محنت اور ان کی تربیت کی بدولت وہ اردو سے زیادہ انگریزی زبان میں اپنے تحقیقی مقالات لکھا کرتے تھے، جو انگریزی اور اردو کے ان مؤقر سائنسی جرنلس میں شائع ہوئے جو علمی وتحقیقی اعتبار سے معیاری تصور کیے جاتے ہیں، ان جرنلس میں کسی روایتی طریقۂ علاج سے منسلک ڈاکٹر کے پیپر کا شائع ہوجانا بڑے علمی اعزاز کی بات تھی، ان کے بعض مقالات کے Impact Factor بہت زیادہ تھے، وہ اکثر مجھ سے گفتگو کے دوران اپنے بعض تحقیقی پیپرز کے متعلق ذکر کیا کرتے تھے جن کی عالمی سطح کی کانفرنسوں میں بڑی تعریف ہوتی تھی۔ علی گڑھ میں ہم دونوں نے ایک ہی ساتھ ۱۹۸۳ء میں قدم رکھا، حسن اتفاق سے ہم دونوں کا تعلق ہندستان کی عظیم دینی درسگاہ جامعۃ الفلاح سے بھی رہا ہے وہاں کی عالمیت کی سند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آرٹس اور سوشل سائنس کے کسی بھی سبجیکٹ میں بی اے کے لیے منظور شدہ تھی، چنانچہ راقم نے انگریزی آنرس کا انتخاب کیا اور پروفیسر غفران صاحب اور میرے ایک اور دوست ڈاکٹر مجاہد الاسلام نے معاشیات (Economics) کا انتخاب کیا، مدرسے سے فارغ کسی طالب علم کے لیے بی اے میں معاشیات کے مضمون کا انتخاب بڑے عزم وحوصلہ کی بات تھی، جب کہ عام طور پر گورنمنٹ اسکول سے آنے والے طلبہ بھی اس مضمون کو لیتے ہوئے گھبراتے ہیں، دوسری اہم بات یہ کہ میڈیم انگلش اور تمام کتابیں انگریزی میں تھیں، اور تیسری بات یہ کہ معاشیات میں بی اے کرنے کے لیے کم از کم ہائی اسکول کے سطح کی ریاضیات کے فارمولوں سے واقفیت ضروری تھی، چنانچہ جلد ہی اس سال جامعۃ الفلاح سے آنے والے طلبہ اپنا مضمون تبدیل کرواکر عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات میں منتقل ہوگئے اور خاکسار نے بھی انگریزی مضمون کے بجائے عربی میں گریجویشن کو ترجیح دی، ڈاکٹر مجاہد نے بھی غفران صاحب کو بتائے بغیر خاموشی سے اپنا مضمون معاشیات سے تبدیل کرواکر اردو کروالیا، لیکن مرحوم نے ہمت نہیں ہاری اور بے پناہ محنت کرکے انگریزی اور ریاضیات دونوں میں مہارت پیدا کی اور ۱۹۸۵ء میں اچھے نمبرات سے معاشیات میں بی اے آنرس کی ڈگری حاصل کی، چنانچہ ملک کی معاشیات اور معاشی مسائل پر ان کی گہری نظر

رہی، ملک کی معاشی پالیسیوں اور اس کے اچھے برے نتائج پر کسی ماہر معاشیات کی طرح بڑی علمی گفتگو کیا کرتے تھے، شیئر مارکیٹ سے متعلق بھی ان کو اچھی معلومات تھی، اگر وہ معاشیات کے میدان میں ہوتے تو وہاں بھی یقیناً کامیاب محقق ومصنف ہوتے، بہرکیف گریجویشن کے بعد اپنے والد محترم کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے بی یو ایم ایس کے مقابلہ جاتی امتحان میں بیٹھے اور کامیاب ہوگئے، اور اس طرح یونانی طب اور ہربل میڈیسن سے ان کا رشتہ استوار ہوگیا، اور ۱۹۹۲ء میں بی یو ایم ایس اور ۱۹۹۵ء میں ایم ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں، اپنے سبجیکٹ میں مہارت اور فطری ذہانت کی بنا پر ان کو ہندستان کے مختلف طبیہ کالجوں میں لیکچرر کے آفر آئے، لیکن انھوں نے ۱۹۹۷ء میں اجمل خان طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مستقل استاد کی حیثیت سے تقرری کو ترجیح دی، انگریزی زبان میں قدرت، فطری ذہانت اور موضوع میں مہارت کی بدولت ان کو اپنے معاصر رفقاء کار کے درمیان امتیازی مقام حاصل تھا۔ جلد ہی ان کے تحقیقی مقالات عالمی سطح پر مستند اردو اور انگریزی زبان کے طبی جرنلس میں شائع ہونے لگے جو طبیہ کالج کے کسی اسسٹنٹ پروفیسر کے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی، اس کے باوجود میں نے کبھی ان کی شخصیت میں کبر، خودنمائی اور خودستائش کا شائبہ نہیں دیکھا، وہ اپنی بڑی سے بڑی علمی کامیابی کا بھی بڑی سادگی اور تواضع کے ساتھ سرسری طور پر ذکر کیا کرتے تھے، یونانی طب کے میدان میں ان کی غیر معمولی تحقیقی صلاحیت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ طبیہ کالج میں لیکچرر رہتے ہوئے انھوں نے بنگلور میں قومی ادارہ برائے یونانی طب (National Institute of Unani Medicine) میں پروفیسر کی پوسٹ کے لیے درخواست دے دی اور جنرل سلیکشن کمیٹی نے ریڈر اور پروفیسر کی پوسٹ پر کام کررہے افراد کو چھوڑ کر بالاتفاق ڈاکٹر غفران کو پروفیسر کی حیثیت سے منتخب کرلیا اور انھوں نے ۲۰۰۷ء سے ۲۰۰۹ء تک Deputation پر اس مرکزی تحقیقی ادارے میں تدریسی، تحقیقی اور انتظامی خدمات انجام دیں اور اس کے بعد طبیہ کالج کے علم الادویہ شعبے میں پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے، شعبے میں یو جی سی کے DRS اسکیم کے دوسرے مرحلہ ۲۰۱۷ء-۲۰۲۲ء کے کوآرڈینیٹر کے عہدے پر بھی فائز تھے۔ ان کی ریسرچ کا کمال یہ تھا کہ روایتی طریقۂ علاج کے علاوہ جدید طریقۂ علاج اور مغربی میڈیسن پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور دونوں طریقۂ علاج کے درمیان مطابقت کے پہلوؤں کو تلاش کرنا ان کی تحقیق کا خاص میدان تھا، انھوں نے اپنی تحقیقات اور تجربات کی روشنی میں متعدد امراض میں کام آنے والی یونانی طب کی دواؤں کو فائنل شکل دی اور ان کے طریقۂ استعمال کی وضاحت کی، اپنی تدریسی زندگی کے دوران انھوں نے تیس سے زائد ایم ڈی کے تحقیقی مقالات کی نگرانی کی، اور دیگر کالجوں میں متعدد مقالات کے ممتحن رہے، ہربل میڈیسن سے متعلق تقریباً دس سے زائد قومی وبین الاقوامی ریسرچ جرنلس کے ایڈیٹوریل اور ریویو کمیٹی کے رکن تھے، اس مختصر مدت میں ان کے ۸۰ سے زیادہ تحقیقی مقالات انگریزی اور اردو، اور زیادہ تر بین الاقوامی جرنلس میں شائع ہوئے، ۳۰ر سے زائد نیشنل وانٹرنیشنل کانفرنسوں میں شرکت کی اور سائنٹفک سیشن کی صدارت کی، ۲۰۱۴ء میں AIIMS دہلی کی بین الاقوامی کانفرنس میں روایتی طریقۂ علاج میں ان کے پیپر کو بیسٹ ریسرچ پیپر کا ایوارڈ دیا گیا، ۲۰۱۶ء میں IHFS، حیدرآباد نے ان کو بیسٹ یونانی اسکالر گلوبل ایوارڈ سے نوازا، ۲۰۱۷ء میں حکومت ہند کی وزارت آیوش کے تحت سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن (CCRUM) نے Best Teacher کا ایوارڈ دیا، ۲۰۱۹ء میں اسی سنٹرل کونسل نے یونانی طب میں تحقیقات کے لیے ان کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ عطا کیا، فروری ۲۰۱۹ء میں ایک ہفتے کے لیے ویزیٹنگ فیلو کی حیثیت سے موریشس میں ہربل میڈیسن میں انگریزی زبان میں لکچرس دیے، انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بڑی کامیابی کے ساتھ متعدد قومی وبین الاقوامی کانفرنسوں کو آرگنائز کیا، وہ فی الحال روایتی طریقۂ علاج اور ہربل میڈیسن کی تحقیق سے متعلق سنٹرل گورنمنٹ اور ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) کے تحت مختلف ریسرچ کمیٹیوں میں کام کررہے تھے اور ریاستی سطح پر بھی یونانی طب سے متعلق سرکاری کمیٹیوں کے ممبر تھے۔

زندہ دلی

اپنی تمام تر علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے باوجود وہ ایک زندہ دل انسان تھے، خاص طور پر اپنے بے تکلف دوستوں کی محفل میں اپنے پر لطف مزاحیہ جملوں سے زور دار قہقہہ لگاتے تھے، ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی، اگر پریشان بھی ہوتے تو اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیتے، ہر طرح کے موضوعات پر گفتگو ہوا کرتی تھی، پرانے احباب کا بھی ذکر ہوتا لیکن شاید ہی کبھی ایسا ہوا کہ ہماری گفتگو مزاح وظرافت سے نکل کر غیبت کے دائرے میں داخل ہوئی ہو، موصوف کو کرکٹ سے جامعۃ الفلاح کے طالب علمی کے زمانے سے ہی خاص دلچسپی تھی، جامعۃ الفلاح کی ٹیم میں اپنے لمبے قد اور مضبوط بازوؤں کی بدولت فاسٹ بالر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، یہ دلچسپی علی گڑھ آنے کے بعد بھی باقی رہی اور یہاں بھی طالب علمی کے زمانے میں ہاسٹل کی ٹیم میں آل راؤنڈر کی حیثیت سے کھیلتے رہے، کرکٹ اور کرکٹ کے قومی و بین الاقوامی کھلاڑیوں سے متعلق ان کی معلومات بہت وسیع تھیں ان کی غیر معمولی ذہانت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک کے قومی کھلاڑیوں کے علاوہ IPL کی مختلف ٹیموں کی کھلاڑیوں کی پرفارمنس پر بھی کسی ماہر کی طرح تکنیکی تبصرے کرتے، اپنی تمام تر علمی، تحقیقی وانتظامی مصروفیات اور عائلی وسماجی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے کچھ وقت کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے بھی ضرور نکال لیتے، ان کے بڑے صاحبزادے نصران احمد کو بھی کرکٹ کا شوق ہے، دونوں میچ کے دوران کسی دوست کی طرح کھلاڑیوں پر تبصرے کیا کرتے، ان کو عالمی اور قومی سطح کے قدیم اور جدید کرکٹ کھلاڑیوں کے ریکارڈ یاد تھے، وہ اپنی ذاتی زندگی میں بہت زیادہ دین دار اور اللہ سے ڈرنے والے تھے لیکن خشک زاہد اور روایتی عالم دین کی طرح ہمیشہ بزرگی وسنجیدگی اپنے اوپر طاری نہیں رکھتے تھے، اپنے دوستوں سے ہمیشہ کھل کر ملتے اور ان سے بے تکلف گفتگو کرتے، ان کی یہ عادت شروع سے آخر تک قائم رہی، مجھے بی اے کا وہ زمانہ یاد ہے جب راقم، ڈاکٹر ابونصر، ڈاکٹر مجاہد آرٹس فیکلٹی میں کلاس ختم ہونے کے بعد عام طور پر غفران کے ساتھ سلیمان ہال کے بھوپال ہاؤس میں چلے جایا کرتے جہاں ان کے بڑے بھائی عرفان احمد کا کمرہ تھا اور وہ سول انجینئرنگ کے تیسرے سال میں تھے، اور وہاں غفران بے تکلف ہم سب کے لیے کچھ نہ کچھ کھانے کا انتظام کرتے، اس زمانے میں عام طور پر کمرے میں کھانا بنانے کا رواج تھا، ہم لوگ بھی مدد کرتے، ان کے بڑے بھائی ہم لوگوں کو دیکھ کر کمرے سے چلے جاتے، وہ غفران کی طرح ہم لوگوں کا بھی خیال رکھتے، اسی طرح شمشاد مارکیٹ اور تصویر محل میں بھی ہم لوگ اکٹھے چائے پیا کرتے تھے، ان کی ضیافت کی عادت تو آخر تک قائم رہی، میں نہیں جانتا کہ طالب علمی کے دور کا کوئی بھی قدیم دوست کسی کام سے علی گڑھ آیا ہو اور انھوں نے اپنے گھر پر اس کی دعوت نہ کی ہو، میرٹھ میں مقیم ہمارے دوست ڈاکٹر اطہر مستقیمی تو اکثر ان کی ضیافت سے مستفید ہوتے بلکہ وہ انھیں اپنی گاڑی سے بس اسٹینڈ چھوڑنے اور لینے بھی جایا کرتے، جب میرے بچے چھوٹے تھے تو میں عید کے موقعے پر اکثر بچوں کے ساتھ اپنے وطن پٹنہ جایا کرتا، مرحوم کا معمول تھا کہ اپنی گاڑی سے ہم سب کو اسٹیشن لے جاکر ٹرین پر سوار کراتے اور پٹنہ سے واپسی پر اسٹیشن پر ہمارا انتظار کرتے، اور فون پر برابر تعلق میں رہتے، ان کا سالوں یہ معمول رہا، یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچوں کو بھی ان کی کمی کا شدید غم ہے، جب مرحوم ایم ڈی کر رہے تھے تو میں جاب میں ۱۹۹۱ء میں آچکا تھا پھر بھی بڑے اصرار سے سنڈے وی ایم ہال میں اپنے کمرے پر بلاتے اور خود دوپہر کا اسپیشل کھانا کمرے پر بناتے اور کبھی کوئی تیسرا دوست بھی شریک ہوجاتا ورنہ ہم دونوں ہی رہتے، کھانا نہایت لذیذ اور ذائقہ دار ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے موصوف کو ان کے اعلیٰ مذاق، نفیس عادت، مہمان نواز، تواضع پسند اور طبیعت کے عین مطابق نہایت سلیقہ مند، وفا شعار، شریف النفس، پاک طینت، خدمت گزار، فرمانبردار، مہذب اور تعلیم یافتہ شریک حیات عطا کی تھی، دونوں کے فکر ومزاج میں بڑی حد تک یکسانیت تھی، ہم ان کی عائلی زندگی میں برابر ان خصوصیات کا مشاہدہ کرتے۔ یونیورسٹی میں داخلہ کے زمانے میں ان کے رشتے دار اور احباب اپنے بچوں کے ساتھ بلا تکلف ان کے مہمان ہوتے، اکثر اس زمانے میں ان کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوتا، بسا اوقات ان کے بچوں کی تعلیم کا حرج بھی ہوتا مگر دونوں

کی زبان سے کبھی شکایت نہیں سنی، ہم دونوں کی دوستی کے ساتھ ہماری بیویاں اور ہم دونوں کے بچے بھی اچھے دوست ہیں اور ہم دونوں کے بچے ایک ہی ساتھ بڑے ہوئے اور اسکول کے مرحلے تک تو اکثر ہمارا اپنے بچوں کے ساتھ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہوتا، اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، بھابھی ہمارے بچوں سے بہت محبت کرتی ہیں، بچوں کی آمد کی اطلاع پا کر ان کے پسند کی چیزیں پکا کر رکھتی تھیں، اللہ تعالیٰ سے ہم لوگوں کی یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اہلیہ اور بچوں کو صبر وسکون عطا فرمائے اور ہر طرح سے ان کی مدد کرے، آمین!۔ان کے ماشاءاللہ تین بچے ہیں، بڑا بیٹا نصران احمد جو مسلم یونیورسٹی سے انجینئرنگ کرنے کے بعد فی الحال الہٰ آباد میں ایم بی اے کے آخری سال میں ہے، دوسرا بیٹا ریان احمد ابھی 2+10 میں ہے اور ایک بیٹی ہے جو ابھی ساتویں سال میں ہے، میرا چھوٹا بیٹا بھی 2+10 میں ریان سے ایک سال آگے ہے اور دونوں گہرے دوست ہیں۔

گذشتہ چالیس سالوں کے دوران شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ ہم دونوں کے درمیان ہفتے میں ملاقات یا فون پر بات نہ ہوئی ہو، ہاں اتنا ضرور ہے کہ وقت کے ساتھ علمی مصروفیات، گھریلو ذمہ داریوں میں اضافہ کی وجہ سے براہ راست ملاقاتیں کم ہوتیں، وہ ملک یا بیرون ملک جہاں کہیں بھی جاتے اس کی اطلاع ضرور دیتے اور واپسی پر روداد سفر ضرور سناتے، ان کی پُرخلوص رفاقت اور محبت میں علی گڑھ میں اتنے سال کیسے گزر گئے اس کا اندازہ ہی نہیں ہوا، اور ان کے ہوتے ہوئے کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوا، ہم دونوں کی یہ عادت تھی کہ اپنی ہر چھوٹی بڑی بات ایک دوسرے سے ضرور شیئر کیا کرتے اور ہر معاملے میں ایک دوسرے سے مشورہ بھی ضرور لیا کرتے، میری زندگی کے ہر معاملے میں انھوں نے مناسب مشورہ دیا۔

بہرکیف اب مرحوم کے ہمراہ طالب علمی سے لے کر آج تک گزرے ہوئے لمحات کی یادیں باقی ہیں، دو سالوں سے ہم دونوں اپنے خاندان کے ہمراہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کی نیت کر چکے تھے، پچھلے سال بھی ایجنٹ سے بات کر لی تھی اور اس سال بھی ایجنٹ سے مسلسل رابطے میں تھے لیکن کورونا کی وجہ سے سعودی حکومت زائرین حج کو اجازت نہیں دے رہی ہے، انتقال سے چند روز قبل تک ہماری حج کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں، ان کی نیت خالص تھی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو حج مبرور کا ثواب عطا فرمائے، ان کی غیر موجودگی میں ان کے دیگر احباب کا تو مجھے علم نہیں، مگر میں خود کو بڑا تنہا محسوس کر رہا ہوں اور اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ ایک مخلص دوست اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے، یقیناً مخلص دوست کی رفاقت میں زندگی بڑی پرسکون اور خوشگوار گزرتی ہے اور اس کی فرقت میں زندگی کس قدر مشکل اور بے رونق رہ جاتی ہے، خاص طور پر جب کہ دوست اس قدر مخلص، ہمدرد، غم گسار اور وفا شعار ہو۔ ہر لمحہ دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، میرے اور میرے اہل وعیال کے دل کو بھی صبر و سکون عطا فرمائے۔آمین!۔

جان کرمن جملہ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

علم الادویہ میں ڈاکٹر غفران کی تحقیقی خدمات

ڈاکٹر سید محمد حسان نگرامی ☆

ڈاکٹر غفران مرحوم (جنھیں مرحوم لکھتے وقت ایک عجیب سا احساس ستا رہا ہے) سے میری بہت ملاقاتیں تو نہیں تھیں لیکن ان کے علمی شہ پاروں، عبقری انداز فکر سے آراستہ شاہکار تحریروں، پروقار اور خاموش مگر سمندر کی گہرائیوں جیسی گہرائی اور گیرائی سے مزین شخصیت، بڑے غور وخوض اور پورے فکر وانہماک کے بعد لب لباب سے رچی بسی عالمانہ بوقلمونیاں شروع سے متاثر کرتی رہیں۔ ان سے میرے دو رشتے تھے؛ ایک علمی رشتہ جس کی بنا پر ان سے کئی بار گفتگو نے ان کی عبقریت کا احساس دلایا، دوسرا رشتہ یہ تھا کہ مرحوم میرے بے حد قریبی دوست و عزیز، کرم فرما پروفیسر ڈاکٹر کوثر عثمان کے بہنوئی تھے۔ علی گڑھ میں میری ان سے پہلی ملاقات کا سلسلہ اسی حوالہ سے رہا۔

ڈاکٹر غفران کی شخصیت کے کئی پہلو تھے وہ نہایت وضعدار، علوم مشرقیہ سے سرفراز ہونے کی وجہ سے صاحب عالی کردار، اپنے کام سے کام رکھنے کی وجہ سے علاحدہ طبیعت ومزاج نے ان کی شخصیت کو منفرد بنا دیا تھا۔ خودی، خودداری اور خود اعتمادی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی، وہ علم دوست تھے، مہذب اور بزرگوں کا احترام وعقیدت ان کی ہستی کا امتیاز تھا۔ یقیناً ان کی اسی خصوصیت نے خاموش طبع ہونے کے باوجود ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ ان میں کبر وگھمنڈ تو نہیں تھا لیکن اپنا سر خم کرنا ناجائز سمجھتے تھے جس سے دستار کی فضیلت مجروح ہو جائے، نہ وہ اکڑ کے چلتے تھے نہ ہی ٹوٹ اور بکھر کر بغل گیر ہونے کو روا سمجھتے تھے، وہ اپنے شہر میں فاصلہ سے ملنے اور موم کو اس قدر اہمیت دینے کے قائل نہیں تھے جو پہلے سنگ پھر سنگ دل ہو کر وقت کا سامان بن جائے، وہ علمی دنیا میں ہمیشہ رواں رواں رہے۔ مخالفتیں آئیں تو ان کا بہت معیاری مقابلہ کیا۔ اس کے لیے انھوں نے کبھی اپنے ضمیر ظرف اور معیار کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ وہ قرطاس وقلم کے سپاہی تھے، انھوں نے دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھے بغیر اپنا سفر جاری رکھا اور آگے بڑھتے چلے گئے اور بہت کم عرصہ میں طبی دنیا میں انھوں نے اپنا ایسا مقام حاصل کر لیا جہاں پہنچنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ کسے معلوم تھا کہ بدنام زمانہ کورونا کا عذاب اپنے شکنجوں میں جکڑ کر انھیں ہم سے چھین لے جائے گا۔

علمی اور فنی خدمات

ڈاکٹر غفران نے جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ سے سند عالمیت حاصل کی تھی۔ پھر طب کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی یو ایم ایس اور ایم ڈی کیا، ''ہونہار بروے کے چکنے پات''۔ اساتذہ کی نظر انتخاب نے ان کی صلاحیتوں کو پہلے سے بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۹۷ء سے تدریسی سفر کا آغاز کیا اور لیکچرر، ریڈر اور پروفیسر کے عہدے تک پہنچے۔ ان کے تعلیمی سفر کا ایک سرا علی گڑھ سے وابستہ تھا، دوسرا بنگلور سے۔ یہاں وہ چیرمین، انچارج اور مختلف شعبوں کے سربراہ رہے اور جہاں رہے اپنی دیانتداری اور علمی عبقریت کی وجہ سے میرِ کارواں رہے۔ انھیں عہدوں سے دلچسپی کم اور تعلیمی وطبی تحقیق سے شغف زیادہ تھا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سی سی آر یو ایم کی سربراہی کو اپنانا بہتر نہیں سمجھا اور اپنے کو علمی اور تحقیقی سفر کے احاطہ میں محدود رکھا۔ تاہم انسانی تاریخ کا اصول یہ ہے کہ نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں۔ وزارت صحت کے آیوش محکمہ کی فارماکوپیا کمیٹی، انڈین فارماسیوٹیکل سوسائٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں یونانی فیکلٹی کے قیام کی بنیادی کمیٹی، بورڈ آف

☆ سابق ڈپٹی ڈائریکٹر (یونانی) سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن لکھنؤ، اتر پردیش۔ Mob.No:7071772077، Email:drsmahassan@gmail.com۔

ریسرچ اسٹڈیز جامعہ ہمدرد دہلی، اینمل ایتھیکس کمیٹی، علی گڑھ، حکومت ہند کے شعبہ آیوش کے ٹاسک فورس اور ڈبلو ایچ او کے تحت طبی اصطلاحات کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے ان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جن میں انھوں نے مؤثر اور اہم رول ادا کیا۔ ان تمام مشغولیات کے ساتھ ڈاکٹر غفران کا قلم تحقیق و تعلیم میں بارانِ گہربار میں مصروف رہا اور ۱۰۰/ سے زائد تحقیقی مضامین کی سرپرستی، جزئی اور کلی نمائندگی درج کرائی جسے اپنے آپ میں ایک مثالی کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی ذاتی شخصیت بہت پہلے نکھر چکی تھی اور جہانِ طب ان کی عبقریت کو تسلیم کر کے ان کی اہمیت کا اعتراف کر چکا تھا۔ اسی دور میں صاحب تذکرہ مرحوم ڈاکٹر غفران نے تقریباً ۳/ درجن تحقیقی مقالوں کے سپروائزر کی حیثیت سے ارباب تدریس و تحقیق کی ایک شاندار ٹیم تیار کی جو رہتی دنیا تک ان کے تجرباتی، تحقیقی اور علمی کارناموں سے فیضیاب کرتی رہے گی۔

علمی و تحقیقی آثار

علم الادویہ کی تدریس، تحقیق اور معالجاتی مطالعہ ان کا اصل موضوع تھا۔ ادویہ پر بہت کام ہوا ہے تاہم ڈاکٹر غفران کی افتادِ طبع، سنجیدہ 'حکمت عملی'، گہرے مطالعہ اور اصول تحقیق پر پابندی، نتائج کے بیانیہ میں افراط و تفریط سے گریز انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز بناتی ہے۔ ان کے تحقیقی مضامین کے عنوانات بتاتے ہیں کہ انھوں نے عام ادویہ بطور خاص جن ادویہ پر پہلے کام ہو چکا ہے ان کی ہمہ جہت افادیت کے تعین، معیار بندی اور حیوانات و انسانوں پر ان کی معالجاتی تحقیق نئی سمتیں متعین کرتی ہے۔ افسوس کی عمر نے ساتھ نہیں دیا اور صرف دو کتابیں وہ مکمل کر سکے، ان میں ایک کتاب ''اوصاف ادویہ- ضمانت سے محاسبہ تک'' شائع ہو سکی جب کہ دوسری کتاب ''اُصول دواسازی'' جسے ان کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بایوڈاٹا میں این سی پی یو ایل میں زیر طبع لکھا گیا ہے، خدا کرے وہ جلد منظر عام پر آجائے۔ لکھنؤ میں ایک ملاقات کے دوران اس کتاب کے مشمولات اور انداز پیش کش کی گفتگو صرف یہیں تک محدود رہی کی جلد ہی اردو کونسل سے طبع ہو کر ذریعہ استفادہ بنے گی۔ ان کی دوسری کتاب ''اوصاف ادویہ- ضمانت سے محاسبہ تک'' بمشکل تمام ہاتھ لگی اس کے لیے عزیزم ڈاکٹر شمیم ارشاد اعظمی کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کی فراہمی کا نظم کیا۔

18x22 سائز کے ۱۱۱/ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بنیادی طور سے ضمانت اوصاف، ادویاتی نباتات کی کاشتِ محمود (Good Cultivation of Medicinal Plants)، ادویہ کا معیاری حصول (Standard Collection)، اعمال صنعتِ محمودہ کے رہنما اصول (Guiding Principles of GMP) اور محاسبہ اوصاف (Assesment of Properties) کے عناوین سے آراستہ ۵/ ابواب پر محیط ہے اس موضوع کی ضرورت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف کتاب لکھتے ہیں:

> ''دور حاضر میں خالص، غیر آمیز اور معیاری خام ادویہ کے حصول اور معالجاتی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مؤثر اور محفوظ دیسی ادویات کی تیاری کے سلسلہ میں ایک جامع نظام مرتب کیا گیا ہے۔ یہ تحقیق کے مقررہ مناہج کو بروئے کار لا کر ادویہ و مصنوعات کا تجزیاتی مطالعہ کرتا ہے اور ان کے معیاری، خالص اور صحیح الاصل و غیر آمیز ہونے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ نظام خودرو اور کاشت کی جانے والی نباتی ادویہ کی کاشت و حصول سے لے کر صنعتی احاطہ میں ان کی تیاری اور پھر ان کے بازار میں اجرا تک کے مراحل کے لیے ایسے رہنما اصول و ضوابط وضع کرتا ہے جن کی پاسداری سے دوائی نباتات کے اوصاف مطلوبہ حالت میں برقرار رہتے ہیں اور بوقت محاسبہ ان کی موجودگی یقینی ہوتی ہے۔ احتسابی عمل کے بعد اگر دوا میں ان اوصاف کی موجودگی کی تصدیق ہوتی ہے تو اس دوا کو باضابطہ طور پر خرید و فروخت اور عمومی استعمال کی غرض سے بازار میں لانے کی اجازت دی جاتی ہے۔
>
> دوائی اوصاف کی ضمانت نباتات کی کاشت و حصول اور صنعت محمودہ کے رہنما اصول و ضوابط کی اتباع کے نتیجے میں حاصل ہونے والے مواد ادویہ و مصنوعات کو دی جاتی ہے جس کا تیقن احتسابی عمل سے ممکن ہوتا ہے۔ ان امور پر جدید علم دواسازی کے ماہرین اور عالمی تنظیم صحت کی جانب سے

بہت کچھ لکھا جاچکا ہے جن پر عمل درآمد کو مستحسن گردانا جاتا ہے۔ اطبائے قدیم نے بھی اوصاف ادویہ کو معیاری بنانے کے لیے گرانقدر اور بیش قیمتی اصول وضع کیے ہیں اور حصول ادویہ، تحفظ ادویہ، ذخیرہ اندوزی اور طریقۂ تیاری کے لیے واضح ضوابط پیش کیے ہیں جن سے طب اور دواسازی سے وابستہ افراد فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ لہٰذا یونانی ادویہ کے نظم اوصاف، ضمانت اوصاف یا محاسبۂ اوصاف کے سلسلے میں جو مناہج طے کیے جائیں، ان میں یونانی اصولوں کو پیش نظر رکھنا لازمی ہوگا۔''

اپنے اس عندیہ کو عملی طور سے یونانی ادویہ پر برتنے اور پرکھنے کے لیے مصنف نے مختصر اور جامع انداز میں ان تمام اصولوں سے سیر حاصل بحث کی ہے؛ ادویہ کی معیاری کاشت، ان کی حصولیابی، انھیں جمع کرنے، ان کی Shelf Life سے متعلق ہدایات، اور آخر میں برگ، تخم، گل اور بیخ کی حصولیابی میں رہنما ہدایات کے تفصیلی تذکرہ نے مطالعہ کو آسان اور طلبہ اور ارباب تحقیق کے لیے مزید مفید بنادیا ہے۔

ان بنیادی اصولوں کے ساتھ شخصی صفائی اور مرکز دوا سازی کی صفائی اور ماہیت دواسازی کے جدید اصولوں کو اپنانے کی تلقین، بطور خاص اعمال صنعتِ محمودہ (GMP) کو مدنظر رکھتے ہوئے یونانی ادویہ کے حوالہ سے بھی اچھی بحث پڑھنے کو ملتی ہے۔ دیگر مضامین کے علاوہ تیار شدہ دواؤں کی پیکنگ، ان کی معیار بندی، تجارتی پیش کش، بازار میں جانے سے پہلے حکومت کے وضع کردہ قوانین پر عمل آوری کے بارے میں ضروری معلومات کو جامعیت کا درجہ عطا کرتی ہے۔ سفر جاری تھا، قلم رواں دواں، اسی درمیان کورونا جیسی مہلک بیماری نے اپنے شکنجہ میں جکڑ لیا اور ممکن تدابیر وعلاج کے باوجود ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء کو مرضی خداوندی وہ ہم سے رخصت ہوگئے۔ آنکھیں اشکبار تھیں اور آخری آرام گاہ تک بڑھتا جنازہ یہ کہہ کے سپرد خاک ہورہا تھا کہ ''میں جارہا ہوں مرا انتظار مت کرنا''۔ کاش! زندگی نے مہلت دی ہوتی تو دیگر تحقیقی زاویوں پر مرحوم کی عبقریت سے استفادہ کا مزید موقع ملتا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اہل خانہ کو صبر اور یونانی طب کو نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

تعزیتی پیغام

جواں سال مرد پروفیسر غفران صاحب کے انتقال کی خبر نے بہت ہی صدمہ اور غم میں مبتلا کردیا ہے۔ آپ بہت ہی سنجیدہ اور بردبار شخصیت کے حامل تھے، آپ ایک تجربہ کار اور پسندیدہ استاد تھے اور طلبہ میں بے حد مقبول تھے، آپ بہت محنتی تھے اور چیزوں کو بہت قریب سے سمجھتے تھے۔ پروفیسر غفران صاحب کے انتقال سے فیکلٹی کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ اس غم میں ہم برابر کے شریک ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبر دے آمین!

(پروفیسر فواد سعید شیرانی، ڈین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

ISSN:2454-4507

دانائے اصول دواسازی

پروفیسر غفران احمدؒ

ڈاکٹر بلال احمد ☆

پروفیسر غفران احمد صاحب مرحوم کا شمار شعبۂ علم الادویہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے لائق و فائق اور ممتاز اساتذہ میں ہوتا تھا۔ آپ کی شخصیت تدریس و تحقیق کے اعلیٰ معیار، دقت نظر، قوت استنباط، اصابت رائے، دور بینی، قوت فیصلہ، احساس ذمہ داری، حلم و بردباری، خوش گفتاری و نرم خوئی، خوش سلیقگی اور سادگی کا مجسّم نمونہ تھی۔ میں ان خوش نصیبوں میں سے ہوں جنھیں ان سے براہ راست استفادہ کا موقع ملا۔ وہ صرف ایک جامع صفات اور باکمال شخصیت ہی نہیں تھے بلکہ ایک انجمن تھے جس سے فیضیاب ہونے والے تشنگان علم کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ ان کی فیض رساں طبیعت اور تب و تاب نے بلا مبالغہ سیکڑوں طلبہ کو یونانی طب کی حقیقی روح سے آشنا کیا اور ان کی تازہ دم فکر نے طبی تحقیق کے پودے کو شاداب رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

دور حاضر میں یونانی طب کو جس قحط الرجال کا سامنا ہے اس کے پیش نظر یہ کہنا کہ استاد محترم نایاب میں بھی نایاب تر تھے قطعاً مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ دوران گفتگو ہم طلبہ جہاں ان کے وسیع علم، عبقری ذہانت اور بیش بہا تجربات سے مستفید ہوتے وہیں ان کے نہایت زرخیز ذہن کی نکتہ رسی کے طفیل طب میں تحقیق کے نو بہ نو موضوعات سے روشناس ہوتے۔ طبی موضوعات پر ان کے تبصرے نہایت مدلّل ہوتے اور اپنی قوت متخیلہ کی بلندی کے سبب وہ ان پر غور و فکر کے ایسے پہلو سامنے لاتے جو بالکل نئے اور اچھوتے ہوتے۔ مغربی طب کے اسرار و رموز سے آگہی اور یونانی طب کے مبادیات کی نزاکتوں سے واقفیت نے انہیں وہ بالیدہ شعور عطا کیا تھا جس کے ذریعہ وہ معاصر طبی تحقیقات کو یونانی طب کے اسلوب سے ہم آہنگ کرنے پر قادر تھے، چنانچہ طبّی مباحث کی تفہیم میں جدید معلومات کا برمحل استعمال ان کی گفتگو کے حسن کو دوبالا کر دیتا تھا۔ انھوں نے یونانی طب کے مستقبل کے تئیں اپنی بے چینی و اضطراب طلبہ میں منتقل کرنے کی کوشش کی اور باصلاحیت شاگردوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جن کے اذہان طبی مسائل سے متعلق ان کی مناسب و متوازن فکر سے منور تھے۔ حاملین طب کے جس عملی و فکری اضمحلال کے وہ عمر بھر شاکی رہے، اسے دور کرنے کے لیے 'من وتو' کی قید سے آزاد ہو کر انھوں نے ہر اس طالب علم کی جس سے انھیں مستقبل میں طب کے اساسی فکر کی محافظت کی ذرا سی بھی توقع تھی دامے درمے قدمے سخنے مدد کی۔ استاد کے طور پر تو ان کا مقام بلند تھا ہی طب کے کلاسیکی لٹریچر اور معاصر سائنسی علوم سے کماحقہ واقفیت کے سبب بطور محقق ان کا مقام اس سے بھی بلند تر تھا۔ کاش میری یہ بات سچ نہ ہو کہ پروفیسر غفران احمد کی شخصیت میں نئے اور پرانے کا وہ انوکھا امتزاج جو یونانی طب کے درخشاں مستقبل کی نوید تھا ان کے انتقال کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ کورونا کی دوسری لہر کے دوران ان کی اچانک رحلت میرے لیے ذاتی طور پر ایک بڑا سانحہ اور طبی دنیا کے لیے ایک عظیم اور ناقابل تلافی خسارہ ہے۔ ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء مطابق ۱۷/رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ کو جمعہ کے روز پروفیسر غفران احمد کا لکھنؤ کے کنگ جارج میڈیکل یونیورسٹی کے اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین!

☆ ریسرچ آفیسر (یونانی)، سائنٹسٹ-IV، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی۔ Mob.No:8130238071، Email:bilalmd73@yahoo.co.in۔

پروفیسر غفران احمد (پیدائش ۲۵؍دسمبر ۱۹۶۴ء) اعظم گڑھ کے ایک معزز علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد جناب مسعود احمد صاحب جماعت اسلامی کے ایک سرگرم رکن تھے اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ نظم وضبط کی پابندی اور ملّی مسائل کے تئیں فکرمندی انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ استادمحترم کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ مزید تعلیم کے لیے ان کا داخلہ خطہ اعظم گڑھ کی معروف دینی درسگاہ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج میں کرایا گیا جہاں سے انھوں نے ۱۹۸۳ء میں عالمیت کی سند حاصل کی۔ سند عالمیت کی بنیاد پر ۱۹۸۳ء میں ہی ان کا داخلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی اے (معاشیات) میں ہوا۔ معاشیات میں گریجویشن کی تکمیل کے بعد ۱۹۸۵ء میں پری طب (بی یو ایم ایس) کورس میں منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۲ء میں بی یو ایم ایس سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کا انتخاب ایم ڈی (علم الادویہ) میں عمل میں آیا۔ ۱۹۹۵ء میں یہ تین سالہ کورس بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ایم ڈی کے دوران آپ نے جواہر مہرہ سے متعلق تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ ایم ڈی کی تکمیل کے بعد شعبۂ علم الادویہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پہلے عارضی طور پر اور ۲۷؍جنوری ۱۹۹۷ء کو مستقل طور پر بحیثیت لیکچرران کا تقرر عمل میں آیا۔ بعدازاں ۲۶؍نومبر ۲۰۰۷ء کو نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور سے بطور پروفیسر منسلک ہوگئے۔ ۲۹؍نومبر ۲۰۰۹ء کو ذاتی مسائل کے پیش نظر دوبارہ مادر علمی سے بحیثیت اسوشئیٹ پروفیسر وابستہ ہوگئے۔ جنوری ۲۰۱۲ء میں آپ کا تقرر پروفیسر کی حیثیت سے عمل میں آیا اور آخری سانس تک وہ اس عہدے کا حق بطریق احسن ادا کرتے رہے۔ صیدلہ کی تدریس سے انھیں خاص تعلق تھا۔ اپنی تمام تر تحقیقی مصروفیات کے باوجود وہ بی یو ایم ایس کے طلبہ کو دواسازی کے عملی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اعمال صیدلہ کی منطقی بنیادوں سے روشناس کرانے کے لیے درسی خطبات کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ ایم ڈی کے طلبہ کو بھی صیدلہ کی اہمیت سے واقف کراتے اور معاصر صیدلی تحقیقات کی روشنی میں دواسازی سے متعلق اعمال کی توضیح فرماتے تھے۔ تحقیق و تدریس کی بہترین صلاحیتوں سے متصف ہونے کے علاوہ تسخیر قلوب کا انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ان کی شفقت و محبت، مشوروں اور اخلاقی مدد سے بے شمار طالب علم فیضیاب ہوئے۔

استادمحترم دواسازی کو طبیب اور مریض کے درمیانی رشتے کی ایک اہم کڑی تسلیم کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی بھی علم یا فن کی تغیر پذیری اور معاصر داعیوں سے ہم آہنگی کی صلاحیت ہی اس کی ہمہ جہت ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔ دواسازی کا فن ان دونوں اوصاف سے متصف ہونے کے باوجود ارباب فن کے تساہل اور سہل انگاری کے باعث جمود کا شکار ہوگیا۔ ان کے مطابق ٹکنالوجی کے میدان میں ہونے والی ہمہ جہت ترقیات سے استفادہ اس فن کی ترقی کی شاہ کلید ہے جنھیں برت کر یونانی دواسازی میں عمدگی لائی جاسکتی ہے اور یونانی دواؤں کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ اپنے انہی خیالات کی روشنی میں انھوں نے ۲۰۰۳ء میں دواسازی سے متعلق ایک نصابی کتاب مرتب کرنی شروع کی جس میں وہ وقتاً فوقتاً اضافات کرتے رہے۔ سن ۲۰۱۹ء کے اواخر میں جب انھوں نے اس کتاب کی طباعت کا ارادہ کیا تو اس کا مسوّدہ ۷؍دسمبر ۲۰۱۹ء کو بذریعہ ای میل مجھ کم علم کو روانہ کیا تاکہ اس کے مشتملات کا طلبہ کی ذہنی سطح کی روشنی میں تجزیہ کرنے کے بعد اپنی رائے سے انھیں آگاہ کروں۔ سوئے اتفاق کہ اسی مہینے میں کووڈ-۱۹ نے چین کے وُہان شہر میں دستک دی اور دیکھتے ہی دیکھتے چند مہینوں میں اس وبا نے پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے کر سارا نظام درہم برہم کردیا۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کی طباعت بھی ٹل گئی، لیکن اس دوران استادمحترم نے تقریباً ۱۲۵؍صفحات پر مشتمل چند اور موضوعات کا اضافہ کیا جن کا مسوّدہ میرے پاس نہیں ہے۔ افسوس کہ کووڈ-۱۹ کی دوسری لہر میں ان کی ناگہانی موت کی وجہ سے طباعت کا منصوبہ تعطل کا شکار ہوگیا۔ امید ہے کہ ان کے وارثین جلد ہی اس اہم کتاب کو منظرِ عام پر لانے کا اہتمام کریں گے۔ پیش نظر مضمون میں میری کوشش ہوگی کہ اپنے پاس موجود نامکمل مسودے کا ایسا تعارف پیش کروں کہ اس کے عناوین اور محتویات کا ایک اجمالی خاکہ قاری کے سامنے آجائے اور اسے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوسکے۔

مسوّدہ کے سرورق پر کتاب کا نام موجود نہیں ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر آویزاں مؤلف کے خاکہ میں دواسازی کے موضوع پر ان کی ایک

تالیف، اصول دواسازی کا نام اس صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ اس کی طباعت کی ذمہ داری قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی نے لی ہے۔ غالباً پیش نظر مسوّدہ، مذکورہ اصول دواسازی کا ہی ہے۔ اس مسوّدہ میں کل ۶۷۶ صفحات ہیں۔ بغیر کسی تمہید کے یہ مسوّدہ علم الصیدلہ: تعریف، تقسیم اور دائرۂ کار کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ مؤلف نے اس عنوان کے تحت وجہ تسمیہ کے ذیل میں تاریخی حوالوں کی روشنی میں عالمانہ گفتگو کی ہے۔ علم صیدلہ کی تعریف کے تحت عہد حاضر میں اطباء کے درمیان رائج تعریف کا تقابل، البیرونی کی بیان کردہ تعریف سے کرتے ہوئے مؤخرالذکر تعریف کی تائید اس بنیاد پر کی ہے کہ یہ دواسازی کے علمی اور عملی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

دواسازی کی مروّجہ تعریف میں استعمال ہونے والی اصطلاحات، ترکیب، تحلیل اور تجزیہ کے مفاہیم کی وضاحت علم کیمیا کی روشنی میں کی گئی ہے۔ دواسازی کی اقسام کے تحت جزوی دواسازی اور عمومی دواسازی کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں نیز جزوی دواسازی کے تحت اس کے فوائد ونقائص اور عمومی دواسازی کے ذیل میں اس کے منافع اور خامیوں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ یونانی طب میں جزوی دواسازی کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے مؤلف رقمطراز ہیں:

> ''جزوی دواسازی کا اصل رشتہ یونانی معالجہ اور اصول علاج سے ہے۔ اسی بنا پر یونانی طب میں اسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یونانی معالجے میں شخصی انفرادیت کا لحاظ اصول علاج کی کلید قرار پاتا ہے، لہٰذا علاج شروع کرنے سے قبل طبیب کے لیے مرض کی مکمل تفصیل کے ساتھ مریض کی جسمانی ساخت، مزاج، اطوار، عمر، اس کا ماحول اور معمولات وغیرہ کے تفصیلی خاکے کا بھی سامنے ہونا لازمی ہے۔ ان سارے امور کو پیش نظر رکھ کر مناسب دوا تجویز کی جاسکتی ہے اور معالجہ شروع ہوسکتا ہے۔ گویا صرف مقامِ مرض، مادۂ مرض یا ماہیت المرضی کیفیت ہی معالجاتی تدابیر کو اساس فراہم نہیں کرتے بلکہ پورا جسم انسانی ایک وحدت میں مریض تصور کیا جاتا ہے اور جسم انسانی مجموعی طور پر معالجے کی زد پر ہوتا ہے، لہٰذا علاج کے وقت پورے جسم انسانی کی رعایت ناگزیر ہوتی ہے۔ مذکورہ امور کی روشنی میں ایک فرد کا جو صحتی یا مرضی خاکہ بنتا ہے وہ دوسرے فرد سے مختلف ہوتا ہے، چنانچہ اس بات کا مشاہدہ اکثر کیا جاتا ہے کہ ایک ہی مرض سے متأثر مختلف مریضوں کے لیے جو نسخے تجویز کیے جاتے ہیں وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور مذکورہ امور میں اختلاف کے پیش نظر نسخوں میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ ہر مریض کا علاج انفرادی طور پر کیا جائے گا اور مرض کی یکسانیت کے باوجود علاج میں یکسانیت کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس صورت حال میں کوئی ایسا نسخہ ترتیب دینا دشوار ہے جو کسی مرض کے ازالے کے لیے ہر حال میں مفید ہو، خاص طور سے مرض حاد میں جہاں دوائی تاثیرات کی مخصوص نوعیت میں معمولی ترمیم یا اس کی شدت وخفت کا معمولی اختلاف بڑے نتائج کا موجب ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ہر مریض کے لیے اس کے مرض اور دیگر احوال کے پیش نظر الگ دوا تجویز کرنا ایک بدیہی امر ہے اور یہ جزوی دواسازی کے بغیر ممکن نہیں۔ ترکیب ادویہ کا جو کام عطار اور دواساز انجام دیتے تھے آہستہ آہستہ وہ دواساز اداروں نے انجام دینا شروع کردیا ہے۔ مختلف اشکال اور مواقع استعمال کی ادویہ کی تیاری کے سلسلے میں ان اداروں نے جدت طرازیوں کا غیر معمولی مظاہرہ کیا، اس سے یہ فائدہ تو ہوا کہ دوائی مصنوعات کے انتخاب کی گنجائش بڑھ گئی اور عمومی ضرورتوں کے لیے مختلف ترکیبی نمونے اب استعمال کے لیے دستیاب ہیں، مزید یہ کہ ان کی کاوشوں سے تحقیق وتدوین کے نئے ابواب بھی کھلے ہیں، لیکن معالجے میں شخصی انفرادیت اور مریضوں کے حسب حال نئے مرکبات کی تیاری کے امکانات محدود ہوگئے ہیں۔''

دواسازی کے دائرۂ کار پر گفتگو کرتے ہوئے مؤلف نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) مرکزی/بنیادی، (۲) ثانوی اور (۳) ضمنی/اضافی۔ بنیادی دائرۂ کار کے تحت جن کاموں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں خام دواؤں کو قابل استعمال بنانا، دواؤں کو مخصوص شکل دینا، نئی دواؤں کی تلاش وتیاری اور مروّج ادویہ میں تصرف کرکے ان کے افعال کو مخصوص کرنا اور ان کے استعمال کو زیادہ مؤثر و محفوظ بنانا شامل ہیں۔ ثانوی دائرۂ کار کے ذیل میں خام ادویہ کی شناخت، اعمال

دواسازی کی معیار بندی، خام مواد اور تیارشدہ ادویہ کی طبعی، کیمیاوی اور تجزیاتی معیار بندی، دواؤں کے افعال کی تعیین اور تیارشدہ ادویہ کی محافظت اور مدت استعمال کی تعیین جیسے کاموں کی تفصیلات قلم بند کی گئی ہیں۔ مدت استعمال کی تعیین کے تحت دو طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ ایک حقیقی مدت کا مطالعہ (Real Time study) اور دوسرا اسرعتی مطالعہ (Accelerated study) جس میں حقیقی کے مقابلے میں کم وقت درکار ہوتا ہے۔ ضمنی دائرۂ کار کے تحت دواؤں کی کاشت اور خام ادویہ کی تیاری، دواؤں کی تجارت وحرفت سے متعلق پالیسی وضع کرنا، نیشنل ہیلتھ کیئر میں تعاون اور ریسرچ وتحقیق جیسے کام بیان کیے گئے ہیں۔

دواسازی کے دائرۂ کار پر بالتفصیل روشنی ڈالنے کے بعد کناش، قرابادین، فارماکوپیا اور فارمولری کے فرق کو واضح کرتے ہوئے ان اصطلاحات کے تاریخی سفر کا بھی احاطہ کیا گیا ہے اور ڈرگ اینڈ کاسمیٹک ایکٹ کی ضروری تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں۔ اگلے بیس صفحات میں دواسازی کا تاریخی پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ مقدارخوراک رقدرشربت کے عنوان کے تحت قدیم اور جدید معلومات کو نہایت خوبی کے ساتھ یکجا بیان کیا گیا ہے۔ جدید معلومات کے تحت Young's rule، Dilling's rule، Fried's rule وغیرہ کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ مقدارخوراک پر مؤلف کی گفتگو ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

اگلا عنوان اعمال دواسازی ہے جس کی تفصیلات صفحہ نمبر ۱۱۱ سے صفحہ نمبر ۳۴۸ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے تحت مؤلف نے جن اعمال پر گفتگو کی ہے ان میں ارغاء، ازالۂ لون، اطفاء، تجفیف، تحلیل وتحلل، تقطیع، نیم کوب، احراق، تکلیس، تبخیر، ترویق، تبلور، تسقیہ، نخل، اقلاء، تعصیر، اذابت، تصعید، تقشیر، تحمیص، تشویہ، برد، تقلیہ، تدہین، ترشیح، تطریہ، تحبیب، تدخین، ترسّب، ترسیب، سف وحَق وغیرہ شامل ہیں۔ آلات حَق کے بیان میں قدیم آلات کے ساتھ ساتھ جدید مشینوں مثلاً مطحنہ کرویہ (Ball Mill)، مارتول مِل (Hammer Mill)، قطّاعہ گرداں (Rotatory Cutter Mill)، مطحنہ ذات الطاقۃ السائلۃ (Fluid Energy Mill)، لسونتی مِل (Colloid Mill)، مدلفنہ (Roller Mill) اور مطحنہ تفریز طرفی (End Runner Mill) کے کام کرنے کے طریقوں اور خوبیوں اور خامیوں کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ مؤلف نے اعمال دواسازی کے ذیلی عناوین کے عملی پہلوؤں کے علاوہ ان کے پس پشت کارفرما سائنسی عوامل کی بھی نشاندہی کی ہے۔ کتاب کے اس حصّے میں جدید صیدلی ترقیات کو قدیم صیدلی اصطلاحات کے تحت جس خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ عام طور پر اطباء نے اعمال صیدلہ کو درسی کتابوں میں اصطلاحات کے ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے جس کی وجہ سے طالب علم کے لیے ان کے اصل مفہوم تک رسائی ممکن نہیں ہو پاتی۔ اصول دواسازی میں مؤلف کا انداز بیان اس قدر سادہ اور عام فہم ہے کہ قاری کے لیے اعمال دواسازی کی منطقی بنیادوں اور پس پردہ نکات کا اندازہ بآسانی ہوجاتا ہے۔ اعمال دواسازی کی تشریح وتعبیر میں مؤلف کے اسلوب کو عمل ترویق کے تحت 'اصول دواسازی' سے ماخوذ مندرجہ ذیل اقتباس کی روشنی میں بآسانی سمجھا جاسکتا ہے:

> ''پودوں میں نمکیات، الکلائڈس اور دوسرے کیمیاوی اجزاء کی مقدار بہت کم ہوتی ہے، جب کہ بیضین (albumin) اور خضرہ (chlorophil) وغیرہ کی مقدار نسبتاً زیادہ ہوتی ہے، جن کا استعمال مریض کے لیے دشوار اور غیر ضروری ہوتا ہے اور دوا کی مقدار خوراک میں غیر ضروری طور پر اضافہ ہوتا ہے۔ اگر نچوڑے ہوئے پانی کو، اس کے اجزاء مؤثرہ کو علاحدہ کیے بغیر استعمال کیا جائے تو دوا کی زیادہ مقدار استعمال کرنے کے باوجود اس کی شدت تاثیر اور مجموعی عمل میں نسبتاً کمی آئے گی۔ جب ہم ادویہ کے رَس کو گرم کرتے ہیں تو ایک مخصوص درجۂ حرارت پر البیومین اور کلوروفل جم (clot) جاتے ہیں اور پورا مرکب رقیق اور جامد اجزاء میں منقسم ہوجاتا ہے، اسی کو ہم دوا کا پھٹنا کہتے ہیں۔ منجمد مادّے کو چھان کر علاحدہ کرنا آسان ہوتا ہے۔ دوائی اہمیت کے حامل اجزاء پانی میں حل پذیر ہونے کی وجہ سے عصارے میں آجاتے ہیں۔ اس کو مزید گرم کرکے پانی کو بھاپ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور نمکیات کو زیادہ مرتکز شکل میں حاصل کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کو رقیق حالت میں تازہ بہ تازہ استعمال کرنا زیادہ بہتر تصور کیا جاتا ہے۔ خضرہ ۵۳ ڈگری اور بیضین ۹۳ ڈگری درجۂ حرارت پر جم جاتے ہیں۔ اگر ان

سے ایک جز کو علاحدہ کرنا ہو تو دونوں کے نقطۂ انجماد کے فرق کی وجہ سے ایسا آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ دوا کے رس کو گرم کر کے کم نقطۂ انجماد والے جز کو پہلے چھان کر علاحدہ کر لیتے ہیں اور دوبارہ گرم کر کے زیادہ نقطۂ انجماد والے جز کو۔ لیکن بالعموم دونوں ہی کو الگ کرنا ہوتا ہے، لہٰذا رقیق مادے کو جوش دے کر چھان لیتے ہیں۔''

اعمال دواسازی کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد اس کتاب میں تدبیر و اصلاح ادویہ کے اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ تدبیر و اصلاح ادویہ کے تحت پیش کی گئیں یہ تفصیلات صفحہ نمبر ۳۴۸ سے صفحہ نمبر ۳۸۴ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس فصل میں اذاراقی، املتاس، آملہ، انزروت، بابچی، بلادر، بیش، گندھک، سنگ سرمہ، حجرالیہود، خربق سفید، خربق سیاہ، ہلیلہ، بھنگ، پھٹکری، تیلنی مکھی، حدید، خبث الحدید، خارخسک، بیخ شوکران، رائی، رسکپور، ریوندچینی، سجی، کونچ، سنکھیا، شنگرف، شورہ قلمی، شیر مدار، غاریقون، مازو، چاکسو، افیون، نوشادر، رصاص، سلاجیت، جوزماثل، حب السلاطین، سقمونیا، مازریون وغیرہ کو مدبّر کرنے کی تراکیب اور تدبیر سے حاصل ہونے والے فوائد کا جائزہ معاصر تحقیقات کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ صیدلہ کی متداول درسی کتابوں میں تدبیر ادویہ کو بالعموم نہایت سرسری انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ طلبہ بھی اغراض و مقاصد سے بے خبر انھیں رٹ رٹا کر امتحان کے مرحلے سے بآسانی گزر جاتے ہیں اور ماسوائے قوت ذکر کبھی قوت فکر کو زحمت نہیں دیتے۔ حالانکہ تدبیر کے نتیجے میں دوا میں جو طبعی اور کیمیاوی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں وہ اس کی تاثیر میں شدت وخفت یا بعض اوقات یکسر تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان تغیرات سے واقفیت کے بغیر تدبیر کے مقاصد اور مدبر دوا کے افعال کی تبدیلیوں کی تشریح معروضی طرز پر نہیں کی جاسکتی۔ مؤلف نے طلبہ کی ذہنی سطح کو پیش نظر رکھتے ہوئے تدبیر کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں کو عام فہم زبان میں بیان کیا ہے اور کسی دوا کی تدبیر میں مخصوص ذرائع کے استعمال کی توجیہ بھی پیش کی ہے۔ انزروت مدبّر کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے، انزروت کو جھاؤ کی لکڑی میں پرو کر بھوننے کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جھاؤ کی لکڑی میں پرو کر بھوننے کی وجہ یہ ہے کہ لکڑیاں حرارت کو اچھی طرح منتقل نہیں کر پاتی ہیں، یعنی یہ bad-conductor ہوتی ہیں اور جھاؤ کی لکڑی دوسری لکڑیوں سے زیادہ bad-conductor تصور کی جاتی ہے۔ جب اس لکڑی پر انزروت کو پرو تے ہیں تو حرارت صرف ایک جانب سے پہنچتی ہے اور اتنی ہی دیر تک جتنی دیر تک ہم چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر یہی عمل لوہے کی سیخ پر کیا جائے تو لوہا good-conductor ہونے کی وجہ سے جلد گرم ہوگا اور دیر تک گرم رہے گا، اور انزروت کے جل جانے کا خطرہ ہوگا۔ اگر انزوت کو ضرورت سے زیادہ حرارت دی جائے تو اس کے دوائی اثرات میں کمی واقع ہوتی ہے۔''

تدبیر ادویہ کے بعد مؤلف نے اشکال ادویہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اشکال ادویہ پر تمہیدی گفتگو کے بعد انھوں نے جامد ادویہ، نیم جامد ادویہ، سیال ادویہ اور بخاری ادویہ کی خوبیوں اور خامیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد موجودہ دور میں مرکبات کی پرانی شکلوں کو نئی وضع میں پیش کرنے کی کوششوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے تحفظات قلمبند کیے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ اشکال ادویہ کی تبدیلی کی ضرورت دواساز اداروں کو زیادہ محسوس ہو رہی ہے، اطباء و معالجین کو کم، ان کی خواہش ہے کہ قرابادینی نسخوں کو ایسی شکل دے دی جائے کہ ان کا بنانا اور فروخت کرنا آسان ہو جائے۔ قرابادینی دواؤں کی شکل کو اگر تبدیل کر دیا جائے گا تو قرابادینی نسخے کی مقبولیت کی وجہ سے نئی شکل کو فروخت کرنے میں دشواری نہیں ہوگی، مثلاً خمیرہ آبریشم حکیم ارشد والا کو اگر قرص ارشدی کے نام سے فروخت کیا جائے تو اس نئی شکل کے تعارف کی ضرورت درپیش نہیں ہوگی۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ دواساز اداروں کو صرف اپنی مصنوعات فروخت کرنے اور نفع حاصل کرنے کی فکر ہوتی ہے، اس لیے ان کی نفس ناطقہ حرفتی ہوتی ہے اور یہ ادارے ہر وہ حربہ استعمال کرتے ہیں جس سے ان کو فائدہ ہو، خواہ طب اور فن دواسازی کی شناخت ہی کیوں نہ زد پے آجائے۔ قرابادینی ادویہ کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں جو اشکال استعمال ہوتی ہیں ان میں سے بیشتر کو اطباء اور دواساز بذات خود تیار

کر سکتے ہیں۔ دوائی افادیت اور معالجاتی استعمال کی قدیم روایت کے علاوہ تشکیل کی آسانی کے سبب بھی اطباء قرابادینی ادویہ کو کثرت سے بناتے اور علاج کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر دواساز اداروں کو اس بات کی اجازت دے دی جائے کہ وہ ساری قرابادینی ادویہ کو نئی شکل دے سکیں تو وہ ان ساری تراکیب کو اپنائیں گے جن میں دستکاری کو دخل نہ ہو، بلکہ مشینوں کے ذریعہ سارا کام ہو سکے۔ پھر ادویہ کی اس قدر افزونی ہو جائے گی کہ آہستہ آہستہ دواؤں کی تیاری کا کام (غیر قرابادینی بھی) جو اطباء خود کرتے ہیں یا اپنی نگرانی میں دواساز وعطار سے کرواتے ہیں اور بوقت ضرورت نسخوں میں حذف و اضافہ بھی کرتے ہیں، کہ ایسا کرنا انفرادی معالجے کے لیے ضروری ہے، ان کے دائرۂ اختیار سے نکل جائے گا اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ یونانی علاج کا امتیاز قائم نہیں رہ پائے گا۔ زیادہ بہتر ہے کہ دواساز ادارے اپنی پسند کی اشکال کے نئے مرکبات تیار کرنے کی کوشش کریں تاکہ یونانی معالجے کی روایت اور اس کا اختصاص قائم رہے اور عمومی معالجے کے لیے نئی ادویہ بھی دستیاب ہو سکیں۔''

اشکال ادویہ کی تبدیلی کو مؤلف، عصر حاضر کی ترقیات، معاشرتی رویوں اور سفر وحضر کے مسائل کی روشنی میں ناگزیر قرار دیتے ہیں لیکن کسی ایسی تبدیلی کو ناجائز تصور کرتے ہیں جو مرکّب کے مزاج، ترکیب، تاثیر اور شرح انجذاب، تقسیم، استحالہ واخراج پر اثر انداز ہو۔ ان کا خیال ہے کہ مرکب سے متعلق ان امور میں تھوڑی سی بھی تبدیلی، ہزار ہا سال کے تجربات پر مبنی ان دواؤں سے متعلق اعتماد کو متزلزل کر دے گی۔ اس سلسلے میں اپنے تحفظات کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اشکال ادویہ میں تبدیلی کرتے وقت یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ جب کسی مروج دوا کی شکل تبدیل کی جاتی ہے تو اسے نئی دوا تسلیم کیا جاتا ہے۔ نئی ادویہ کے سلسلے میں ضروری ہے کہ ان کی تاثیر اور سمیت کے تعین کے لیے منظّم تجربات اور سریریاتی مشاہدات کیے جائیں، اور نتائج کا شماریاتی اصولوں کے مطابق تجزیہ کر کے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ دوا ہر طرح سے محفوظ ہے اور متوقع دوائی افعال پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد ہی حکومت یا متعلقہ ادارہ دوا کی نئی شکل کو عوامی استعمال کے لیے بازار میں لانے کی اجازت دے گا۔ یہ عمل نسبتاً مشکل، وقت طلب اور مصارف کا متقاضی ہوتا ہے جس سے نئی دوا کی قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ پھر اس بات کے بھی (قوی) امکانات ہوتے ہیں کہ دوا صفاتی لحاظ سے اس معیار پر نہ اترے، جو مطلوب ہے۔ اس صورت میں ساری محنت رائیگاں چلی جائے گی۔ اس کی متبادل صورت یہ ہے کہ مروجہ ادویہ میں تبدیلی کرنے اور ان کی شکل بدلنے کے بجائے کوئی نیا مرکب ترتیب دیا جائے جو مروجہ مرکب جیسے افعال کا حامل ہو، اس مرکب کا بھی تجرباتی، تجزیاتی اور سریریاتی مطالعہ کیا جائے اور مروجہ مرکب کے بدل کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ پرانی دوا اپنی شکل پر برقرار رہے گی اور یونانی ذخیرے میں ایک نئی دوا کا اضافہ ہوگا۔ پھر نئی دوا میں حذف و اضافے کی بھی آزادی ہوگی جب کہ پرانی دوا کے اجزاء ترکیبی کو بدلنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔''

قِوامی ادویہ اور ان کی تیاری کے طریقے کا عنوان قائم کر کے مؤلف نے نہ صرف قِوامی ادویہ کی تیاری کے مختلف اغراض کو منضبط کیا ہے، بلکہ قوامی مادوں کا ذکر کرتے ہوئے مختلف شیریں مادوں سے قوام بنانے کے طریقے بھی بیان کیے ہیں۔ اس ذیل میں شربت کی تعریف اور شربت کی تیاری میں شکر اور دوسرے شیریں مادوں کی شمولیت کی افادیت کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ شیریں مادوں کی شمولیت کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شربت خواہ کسی قسم کا ہو اس کی تیاری میں شکر (یا دوسرے شیریں مادوں) کی شمولیت کا اہم رول ہے۔ شیرینی ومٹھاس پیدا کرنے کے علاوہ دیگر خصوصیات کی بنا پر بھی شیریں مادوں کا استعمال شربت بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ متعدد دیگر خصوصیات کے باوصف شکر کی یہ خوبی کہ شربت میں اس کا مخصوص درجے کا ارتکاز شربت کی محافظت کرتا ہے اور جراثیم کی افزائش کو روکتا ہے، شربت میں اس کی شمولیت کو ترجیح دیے جانے کے لیے کافی ہے۔ شکر اپنے وزن سے تقریباً نصف پانی میں گھل جاتی ہے۔ جب شکر کا ارتکاز شربت میں ۶۵-۶۸ رفیصد کے قریب ہو جاتا ہے تو یہ ارتکاز اس کے تحفظ کا ضامن ہو جاتا ہے۔ اگر شربت میں

شکر کا ارتکاز اس سے کم ہو تو پھپھوند اور دیگر اجسام تعدیہ وتخمیر کی افزائش اوران کے تغذیہ کا یہی شربت اہم ذریعہ بن جاتا ہے۔ دراصل ۶۸ رفیصد یا اس سے زیادہ ارتکاز پر شربت میں نفوذی خصوصیت (osmotic properties) پیدا ہوجاتی ہے جس کے سبب جرثومے کی مائیت شکر کے محلول کی طرف منتقل ہوجاتی ہے (کم سے زیادہ ارتکاز والے مادے کی طرف)، اس بنا پر اجسام تعدیہ (organism) کی افزائش رک جاتی ہے۔ جس شربت میں شکر اپنے نقطۂ اشباع (saturation point) سے کم ہوتی ہے اس میں یہ وصف پیدا نہیں ہو پاتا۔ شکر کا نقطۂ اشباع ۶۴٫۷ رفیصد ہوتا ہے۔''

قوامی مرکبات میں شامل خمیرہ کے بارے میں ایک عام رائے یہ ہے کہ اس کے اجزا کو قوام میں شدت سے گھونٹنے کی وجہ سے وہ پھول جاتا ہے اور اس میں تخمیری کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ خمیرہ کے قوی التاثیر ہونے کا سہرا بھی اس کی اسی تخمیری کیفیت کے سر باندھا جاتا ہے۔ مؤلف نے اس کو ایک باطل خیال قرار دیتے ہوئے درج ذیل توجیہ پیش کی ہے:

''بعض لوگ خمیرہ کہے جانے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں تخمیری کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، جو درست نہیں ہے۔ اس کے اندر شکر کا ارتکاز اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ تخمیر کے ذمہ دار جرثومے (فنگس) زندہ نہیں رہ پاتے، لہٰذا یہ عمل واقع نہیں ہو پاتا۔ فنگس کی بہت کم جنس ایسی ہوتی ہیں جو ۶۵-۷۰ رفیصد شکر کے ارتکاز پر زندہ رہ پائیں، جب کہ خمیرے میں شکر کا ارتکاز کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ البتہ اجزاء دوائیہ کا تعامل خمیرے میں ضرور ہوتا ہے جس سے اس میں نئے اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور مرکب جداگانہ صورت نوعیہ کا حامل ہوجاتا ہے۔''

قوامی ادویہ کے بعد مؤلف نے حبوب واقراص کی تیاری پر گفتگو کی ہے۔ حبوب کے طریقۂ تیاری کے مراحل کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لبدی بنانے، لبدی کی تقسیم، حبوب کو گول کرنے کی تراکیب، گولیوں پر غلاف (وارنش کا غلاف، غلاف لولوی، غلاف ہلامی، شکر کا غلاف، ورقِ نقرہ وطلا کا غلاف، روغن کا استر) چڑھانے کی تدابیر اور رابطات (سیال رابطے، نیم سیال رابطات، جامد رابطات) کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ اقراص کے ذیل میں بھی تیاری کے قدیم طریقوں کے ساتھ ساتھ جدید صیدلی معلومات کو شامل کرنے کا التزام کیا ہے۔ ان کے علاوہ مراہم، کریم، طلا، لوشن، روغنیات وغیرہ جیسی اشکال کی ترکیب تیاری بیان کرتے وقت جدید سائنسی معلومات سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔

یونانی طب میں غذا اور علاج بالغذاء پر جس قدر مواد دستیاب ہے، کسی اور روایتی طب میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ لیکن اساسی کتب سے عدم استفادہ کی روایت اور نصابی کتابیں ترتیب دینے والے اطباء کی عدم توجہی کی وجہ سے یہ اہم موضوع الگ تھلگ پڑ گیا ہے۔ اصول دواسازی میں اس کی اہمیت کے پیش نظر مؤلف نے اس کتاب کے تیس صفحات اس کے لیے مختص کیے ہیں۔ اس فصل میں مؤلف نے جن غذاؤں کی ترکیب تیاری اور منافع بیان کیے ہیں ان میں فالودہ، فیرنی، ساگودانہ، دلیا، خبیص، حریرہ، دال کا پانی، ماء الجبن، ماء الرائب، ماء العسل، ماء السکّر، جلّاب، ماء الاصول، ماء البزور، ماء الشعیر، کشک الشعیر، ماء البقول، ماء الحمص، ماء الفواکہ، ماء اللحم وغیرہ شامل ہیں۔ ماء الشعیر بنانے کی ترکیب بیان کرتے ہوئے انھوں نے اسے تیار کرنے کا ایک ایسا طریقہ بیان کیا ہے جو صیدلہ کی رائج کتابوں میں مذکور ترکیب سے جداگانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جَو کے اچھے اور قدرے موٹے دانے لے کر پانی میں بھگو دیں۔ جب یہ پھول جائیں تو پانی سے نکال کر کسی مسطح فرش پر مرطوب اور نسبتاً گرم مقام پر پھیلا دیں تاکہ ان میں انکھوا نکل سکے۔ انکھوا نکلنے کے بعد ان کو ہلکی آنچ پر بھون لیں تاکہ انکھوے کی افزائش موقوف ہوجائے اور دانے خشک ہوجائیں۔ اب جَو کو ہاون دستے یا اوکھلی میں کوٹ لیں اور بھوسی اور انکھوے کو صاف کرلیں۔ اس مقشر اور صاف ستھرے جَو کو شعیرہ بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مقشر جَو کی مقررہ مقدار برتن میں رکھ کر اس میں پانچ گنا پانی شامل کریں اور کسی گرم جگہ مثلاً چولھے کے پیچھے یا گرم راکھ پر رکھ دیں، البتہ خیال رہے کہ اس کا درجۂ حرارت ۵۰ اور ۶۰ ڈگری کے درمیان رہے۔ اس طرح دو گھنٹے تک رکھنے کے بعد پانی کو نتھار لیں اور جَو میں پھر اسی مقدار میں پانی شامل کریں اور دوبارہ دو گھنٹے رکھ کر پانی کو نتھار لیں۔ اس طرح دو قسطوں میں جَو کے وزن کا دس گنا پانی شامل

کرتے ہیں۔اس عمل کے بعد جو پانی حاصل ہوتا ہے اس کو کم پریشر پر کسی Vacuum Pan میں رکھ کر گرم کرتے ہیں تا کہ اس کی تبخیر ہو سکے، البتہ درجۂ حرارت کو ۵۵ڈگری سے زیادہ نہیں بڑھاتے۔ جب مطلوبہ ارتکاز کا آشِ جَو تیار ہو جاتا ہے تو تبخیر کے عمل کو موقوف کر دیتے ہیں اور اس کو استعمال کے لیے محفوظ کر لیتے ہیں۔ چونکہ جَو کو بھگونے کے بعد اس کا پانی دوبار میں اور دو گھنٹے کے وقفے سے حاصل کیا جاتا ہے، لہٰذا چاہیں تو دونوں کی الگ الگ کم پریشر پر تبخیر کر لیں یا بعد میں حاصل ہونے والے پانی کو اسی Vacuum Pan میں ڈال دیں جس میں پہلے والے پانی کی تبخیر کی جا رہی ہو اور مناسب وقت تک گرم کر کے گاڑھا کر لیں۔''

درسی کتابوں میں مذکور ماء الشعیر بنانے کی ترکیب اور مذکورہ بالا طریقے کا تقابل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''آشِ جَو کی دونوں تراکیب تیاری میں دو بنیادی فرق بہت واضح ہیں۔ طریقۂ اول میں جَو کو بھگونے کے بعد ایک خاص ماحول میں اس وقت تک رکھتے ہیں کہ اس میں انکھوا نکل سکے۔ انکھوا نکلنے کے وقت اسٹارچ کی سب سے زیادہ مقدار بیجوں میں پائی جاتی ہے اور انزائم کی بھی زیادہ مقدار اسی وقت موجود ہوتی ہے۔ جب کہ طریقۂ ثانی میں جَو کو بھگونے کے بعد اس کو خشک کر لیتے ہیں، اس میں انکھوا نکلنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ اس طرح طریقۂ ثانی میں طریقۂ اول کی بہ نسبت انزائم اور اسٹارچ، جن کے تعامل سے مختلف غیر حل پذیر مادوں کو حل پذیر مادوں میں تبدیل ہونا ہوتا ہے، کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ طریقۂ ثانی میں جَو کو پانی کے ساتھ جوش دے کر عصارہ حاصل کیا جاتا ہے جب کہ طریقۂ اول میں جَو کو پانی کے ساتھ جوش نہ دے کر صرف اس کو گرم مقام پر رکھتے ہیں تا کہ ایک مخصوص درجۂ حرارت پر انزائم کے زیر اثر اسٹارچ حل پذیر مرکبات میں تبدیل ہو سکے۔ پھر حاصل شدہ پانی کی کم پریشر پر تبخیر کی جاتی ہے تا کہ مخصوص ارتکاز کا آشِ جَو تیار ہو سکے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ڈائسٹیز جو نشاستہ کو گلوکوز اور فرکٹوز وغیرہ میں تبدیل کرتا ہے، ۵۵ڈگری سینٹی گریڈ درجۂ حرارت سے زیادہ پر ضائع ہونے لگتا ہے، لہٰذا جَو کو پانی کے ساتھ جوش دینے سے یہ انزائم ضائع ہو جاتا ہے اور نشاستہ حل پذیر غذائی اجزاء میں تبدیل نہیں ہو پاتا، نتیجتاً حاصل شدہ آشِ جَو میں غیر حل پذیر اجزاء زیادہ ہوتے ہیں اور اس میں وہ خواص پیدا نہیں ہو پاتے جو غذائی اور دوائی اوصاف کی بنا پر مطلوب ہیں اور جن کے سبب اسے ایک اہم غذا اور غذائے دوائی کا مقام حاصل ہے۔''

تغذیہ کے حوالے سے ماء اللحم اطباء کے درمیان ہر دور میں مقبول رہا ہے۔ تقویت عام اور حرارت غریزی کو برانگیختہ کرنے کے لیے اس کا استعمال طبیب حضرات بکثرت کرتے ہیں۔ اس کے حصول کے لیے اطباء نے عمل تعریق کو استعمال میں لانے کی ہدایت کی ہے۔ مؤلف کا خیال ہے کہ عمل تعریق کے نتیجے میں گوشت کے آبی اجزاء اور وہ اجزاء جو حل پذیر ہوں گے عرق کی شکل میں حاصل ہوں گے اور ان کی دوائی افادیت زیادہ ہوگی۔ ان کا خیال ہے کہ ماء اللحم سے اطباء کی مراد وہی گوشت کا پانی ہے جو عمل تعریق کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں وہ ماء اللحم جو یخنی کی شکل میں حاصل کیا جاتا ہے اور جس میں گوشت کے پانی کے علاوہ لحمی اور شحمی اجزاء وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں وہ یخنی اور شوربہ تو ہو سکتا ہے، عرق ماء اللحم ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ماء اللحم کے سلسلے میں اطباء کی اس فاش غلطی کی اصل وجہ، وہ تحقیق کے بنیادی اصولوں سے انحراف کو قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:

''ماء اللحم کی تحقیق میں بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ اس کے لیے موزوں Hypothesis ہی وضع نہیں کی گئی۔ اطباء نے ماء اللحم اس پانی کو بیان کیا ہے جو گوشت میں طبعی طور پر پایا جاتا ہے، جس کو بذریعہ حرارت گوشت سے الگ کیا جاتا ہے اور بذریعہ تبخیر عرق کی شکل میں حاصل کر لیا جاتا ہے، لیکن تحقیق کے وقت Hypothesis یہ بنائی گئی کہ ماء اللحم سے مراد گوشت کا محلول ہے اور اس محلول میں وہ سارے اجزاء یقیناً موجود ہوں گے جو گوشت کے اجزاء ترکیبی کا حصہ ہیں۔ چنانچہ گوشت کی یخنی (extract) تیار کی گئی، پھر اس سے عرق کشید کیا گیا اور عرق میں لحمین و شحمین کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، ظاہر ہے یہ کوشش مشکور نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ لحمین و شحمین کی تبخیر اس درجۂ حرارت پر نہیں ہو سکتی جس پر آبی اجزاء کی ہوتی ہے۔ پھر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ماء اللحم لطیف غذائی اور دوائی

اجزاء سے عاری ہے۔ اب اگر ماء اللحم کو استعمال کرنا ہے تو اس کی یخنی، محلول یا extract بنا کر ہی استعمال کرنا مناسب ہوگا، عرق حاصل کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس طرح ماء اللحم سے متعلق یونانی طب کے گراں قدر سرمائے اور اس کے استعمال کی قدیم روایت پر چند ماہ کی بے ربط تحقیق اور چند صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ نے سوالیہ نشان کھڑا کر دیا۔ مختصراً یہ کہ ع

کام اچھا نہ تھا انجام بھی اچھا نہ ہوا

لیکن افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ بعض اطباء جن میں سے ایک صاحب تو طب کے معروف مصنف ہیں، اس تحقیقی کام سے ایسے متأثر ہوئے کہ یونانی نظریات اور اس کی برسوں کی روایات کو بالائے طاق رکھ کر اس بات کی وکالت شروع کر دی کہ گوشت کا محلول ہی دراصل ماء اللحم ہے۔ ان کی تحریروں کا اثر یہ ہوا کہ آج تک سادہ لوح اطباء اسے یخنی اور گوشت کا محلول ہی سمجھتے ہیں۔ ہماری درسی کتابوں میں ماء اللحم کی اصطلاح عرق ماء اللحم کے ساتھ ساتھ یخنی کے لیے بھی استعمال ہونے لگی ہے، جب کہ دونوں جداگانہ خواص رکھنے والی اغذیہ ہیں۔''

یونانی طب کو مہاجرت سے خاص لگاؤ ہے۔ کئی تہذیبوں سے اس کے رشتوں نے اسے نو بہ نو اصطلاحات سے مالا مال کیا ہے۔ ان اصطلاحات کا ایک معتد بہ حصہ اوزان سے متعلق ہے۔ عصر حاضر میں رائج معیاری اوزان سے پہلے استعمال ہونے والے اوزان عصری، علاقائی اور تہذیبی حدود کے پابند ہوتے تھے۔ ایک علاقے میں استعمال کیے جانے والے ناپ تول کے پیمانے دوسرے علاقے میں رائج پیمانوں سے یکسر مختلف ہوتے تھے۔ بعض اوقات ایک ہی پیمانہ، مختلف علاقوں میں مختلف وزن کی نشاندہی کرتا تھا۔ آج جب ہم دواؤں اور غذاؤں سے متعلق قدیم طبی سرمایے کا مطالعہ کرتے ہیں تو اوزان کی تعیین کا مرحلہ نہایت مشکل ہوجاتا ہے۔ اصول دواسازی کے مؤلف استاد محترم پروفیسر غفران احمد صاحب نے طلبہ اور محققین کی اس دشواری کے پیش نظر تقریباً تین سو اوزان کو مروجہ اوزان میں تبدیل کیا ہے۔ ان کی یہ کوشش یونانی طب کے عملی پہلوؤں پر دادِ تحقیق دینے والے اشخاص کے لیے ایک اہم مرجع ثابت ہوگی۔ اوزان ادویہ کے عنوان کے بعد انھوں نے چند مخصوص ادویہ کی شناخت اور ان کے معیار کا تعین کے عنوان کے تحت زعفران، عنبر، مشک، شہد، روغن زیتون، روغن بادام، روغن کلونجی، مروارید، وغیرہ کی شناخت اور معیار بندی کے قدیم اور جدید وسائل کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔

یونانی دواؤں کے حصول کے بعد ان کا تحفظ ایک اہم مسئلہ ہے۔ علم الادویہ اور صیدلہ سے متعلق طب کی قدیم کتابوں میں، اساطین فن نے بالعموم اس کے لیے علاحدہ باب قائم کیے ہیں اور تحفظ کی اہمیت وافادیت کے ساتھ ساتھ مختلف تحفظی تدابیر بھی بیان کی ہیں۔ امتداد زمانہ کے ساتھ سائنسی ترقیات نے تحفظ کے زیادہ بہتر وسائل فراہم کیے ہیں جن کے ذریعہ دواؤں کے اوصاف کو ایک خاص وقت تک کے لیے برقرار رکھنا نسبتاً آسان ہوگیا ہے۔ مؤلف نے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس کی تفصیلات ۱۴ر صفحات میں پیش کی ہیں۔

اصطلاحات درحقیقت، علمی تصورات کے نام ہیں اور ان میں کئی کئی جملوں میں بیان کی جانے والی تعریف پوشیدہ ہوتی ہے۔ فی زمانہ اردو زبان سے واقف صیدلہ کے طالب علم کا سابقہ جن صیدلی اصطلاحات سے پڑتا ہے ان میں سے بیشتر یونانی طب کے عربی وفارسی ذخیرۂ کتب سے مستعار لے لی گئی ہیں، لہٰذا ان کے مفہوم تک رسائی اس کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بیسویں صدی میں لکھی گئی صیدلہ کی اردو کتابوں کی مدد سے اگر مفہوم تک اس کی رسائی ہو بھی جائے تو دور حاضر کی سائنسی ترقیات کی روشنی میں ان کی تفہیم ناممکن ہوجاتی ہے۔ طلبہ کی انہی مشکلات کے پیش نظر کتاب کے آخری حصے میں صیدلی اصطلاحات کی ایک فہرست ان کی مختصر تعریف کے ساتھ شامل کی گئی ہے تاکہ طلبہ بوقت ضرورت ان سے استفادہ کرسکیں۔

استاد مکرّم پروفیسر غفران احمد کا ۶۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل یہ مسوّدہ صیدلہ کے موضوع پر اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام ہے، جس میں قدیم اور جدید معلومات کو اس خوبصورتی سے ہم آمیز کیا گیا ہے کہ طالب علم قدیم وجدید کی تفریق سے بے نیاز ہوکر فنی رموز سے واقفیت حاصل کرسکے۔ ان کی جدت پسندی اور

تنقیدی طرز فکر نے صدیوں کے سفر کی تھکن سے چُور صیدلی موضوعات کو جو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے وہ یقیناً ان کے تعمق نظر، وسعت مطالعہ اور فنّی دسترس کا ثمرہ ہے۔ امید ہے کہ طباعت کے مرحلے سے گزر کر جب یہ کتاب منظر عام پر آئے گی تو اس سے نہ صرف طلبہ استفادہ کریں گے بلکہ اساتذہ کے لیے بھی یہ صیدلہ کی تدریس میں حددرجہ معاون ثابت ہوگی۔

استاد محترم پروفیسر غفران احمد مرحوم حقیقی معنوں میں ایک شجر سایہ دار تھے جس کی شبنمی چھاؤں سے نہ جانے کتنوں نے شادابی کشید کی ہے۔ میں بھی اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہوں کہ میری زندگی کے بیشتر گوشوں نے ان کی ہمہ جہت شخصیت کے اثرات قبول کیے ہیں۔ طالب علمی کے دور ۲۰۰۰ء سے ان کے انتقال تک مختلف حوالوں سے ان کی ذات سے اکتساب فیض میرے لیے باعث افتخار ہے۔ ایم ڈی کے دوران وہ میرے شریک نگران کار رہے، ۲۰۱۶ء میں جب حکومت ہند کی وزارت آیوش نے یونانی طب، آیورویدا اور سدّھا کی خدمات کو شماریات سے منسلک کرنے کے لیے ان کے قدیم علمی سرمایے میں مذکور امراض کو رموز (کوڈز) میں منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا تو یونانی طب کے لیے جن پانچ افراد کا انتخاب عمل میں آیا ان میں استاد محترم پروفیسر غفران احمد صاحب کے علاوہ یہ ناچیز بھی شامل تھا۔ ان کوڈز کو وزارت آیوش نے ۲۰۱۷ء میں ''نیشنل یونانی ماربیڈیٹی کوڈز'' کے نام سے شائع کیا اور اکتوبر ۲۰۱۷ء سے مذکورہ وزارت سے وابستہ یونانی طب کے بیشتر ادارے شماریات کے لیے انہی کوڈز کا استعمال کر رہے ہیں۔ وزارت آیوش نے ان شماریات کے توسط سے یونانی طب، آیورویدا اور سدّھا کو عالمی سطح پر نئی بلندیوں سے روشناس کرایا ہے۔ وزارت آیوش کے ارباب حل وعقد کی مسلسل کوششوں سے، عالمی ادارۂ صحت (WHO)، جنیوا نے مذکورہ بالا تینوں طریقہائے علاج کی اصطلاحات کی بین الاقوامی مشاورت سے معیار بندی کا فیصلہ کیا۔ یونانی طب، آیورویدا اور سدّھا ہر ایک کے لیے WHO نے تین تین ماہرین کا انتخاب کیا۔ یونانی طب کی اصطلاحات کا اوّلین مسوّدہ تیار کرنے کے لیے جن تین افراد کو WHO نے منتخب کیا ان میں پروفیسر غفران احمد اور پروفیسر سیّد شاکر جمیل، سابق ڈائریکٹر جنرل، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی کے علاوہ یہ ناچیز بھی شامل تھا۔ اس کام کے دوران انھوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود، مسوّدے کی تیاری میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا اور ادویہ و صیدلہ سے متعلق اصطلاحات کی معیار بندی پر خاص توجہ دی۔ امید ہے کہ عالمی ادارۂ صحت جلد ہی اس مسوّدے کو کتابی شکل میں منظر عام پر لائے گا۔ میری خوش بختی ہے کہ ۲۰۱۸ء کے یونانی ڈے کے موقع پر جب وزارت آیوش نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ۲۰۱۷ء سے نوازا تو مجھے بھی ینگ سائنٹسٹ ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس سے قبل ۲۰۱۷ء میں اسی وزارت کے ذریعہ ان کی تحقیقات کی معیاریت کے پیش نظر بیسٹ ٹیچر ایوارڈ ۲۰۱۶ء کے لیے بھی منتخب کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ ان کو ۹/اگست ۲۰۰۹ء کو حیدرآباد میں حکیم احمد اشرف میموریل نیشنل ایوارڈ، جنوری ۲۰۱۴ء میں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز، نئی دہلی میں منعقد ایک بین الاقوامی کانفرنس میں انسٹی ٹیوشنل ایوارڈ اور ۱۹/فروری ۲۰۱۶ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد ایک پروگرام میں اصلاحی ہیلتھ کیئر کی جانب سے بیسٹ یونانی اسکالر ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پروفیسر غفران احمد جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، ایک مرد قلندر، درویش صفت انسان، یونانی طب کے رمز آشنا اور سیکڑوں طلبہ کے مربی تھے۔ ان کا شمار ان منتخب روزگار لوگوں میں ہوتا تھا جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جاتا تھا۔ ان سے جو لوگ ملتے تھے، استفادہ کرتے تھے، معاملہ کرتے تھے وہ اس بات کی گواہی دیں گے۔ کووڈ-۱۹ کی پابندیوں کے باوجود فروری ۲۰۲۱ء میں ان سے بالمشافہ ملاقات کے شرف سے بہرہ مند ہوا۔ اس وقت میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔ ۱۸/اپریل ۲۰۲۱ء کو بذریعہ ٹیلیفون ان سے میری گفتگو صرف چند سکنڈ کی رہی۔ عسر تنفس کی وجہ سے وہ بولنے پر قادر نہیں تھے۔ یہ ان سے میری آخری گفتگو تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین!۔

تازہ نہ رہ سکیں گی روایات دشت و در
وہ فتنہ سر گئے جنھیں کانٹے عزیز تھے

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

مرحوم پروفیسر غفران احمد علیگ

ایک دیدہ ور شخصیت

پروفیسر غلام الدین صوفی ☆

پروفیسر غفران احمد رحمہ اللہ تعالیٰ بحیثیت استاد ایک شفیق انسان تھے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں ان کا زمانہ زرین دور کے مانند ہے جس میں انھوں نے نہ صرف تعلیم وتعلم کی طرف توجہ دی بلکہ ان کی قائدانہ صلاحیت بھی نمایاں ہوئی۔ غفران صاحب کی این آئی یو ایم میں آمد دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ شعبہ جات میں اعلیٰ فیکلٹی کا فقدان اور مقامی طور پر اس ادارے کا دہلی سے دور ہونا واقعی ایک مشکل امر تھا، جس کو آج بھی این آئی یو ایم نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اس کے نقصانات بھی جھیل رہا ہے۔ خیر! یہاں پر ڈیپوٹیشن کے لیے ادویہ میں پروفیسر کی سخت حاجت تھی۔ چونکہ اس وقت ڈاکٹر حفظ الکبیر صاحب نے اپنے ڈیپوٹیشن کو مکمل کیا تھا اور جامعہ ہمدرد واپس جانے کے خواہاں تھے۔ اس بار ڈاکٹر غفران صاحب اور ڈاکٹر شارق ظفر صاحب نے فارم بھرا ہوا تھا اور ڈائریکٹر پروفیسر مستحسن علی جعفری صاحب پریشان تھے کہ ان میں کون بہتر رہے گا جسے این آئی یو ایم بلایا جائے۔ پروفیسر جعفری کبھی بھی کوئی اس طرح کا کام اپنے صلاح کار اور تجربہ کار دوستوں سے مشورہ کیے بغیر نہیں کرتے تھے۔ بہت سارے مشورے ہوئے لیکن جعفری صاحب کسی خاص رائے پر نہیں پہنچ پائے، کبھی غفران صاحب ذہن میں حاوی ہوئے تو کبھی شارق ظفر صاحب، بہت پریشان ہوکر باقی لوگوں سے مشورہ کیا لیکن پھر بھی مستحکم رائے پر نہیں پہنچ پائے، مجبوراً استخارہ کیا اور وہ بھی ایک سے زیادہ بار اور آخر میں غفران صاحب کو بلا لیا گیا جو اس وقت لیکچرر کی حیثیت سے اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ میں کام کررہے تھے۔ یہ فیصلہ جعفری صاحب کے عمدہ فیصلوں میں سے ایک بڑا فیصلہ مانا جاتا ہے۔ پروفیسر غفران احمد مرحوم نے بحیثیت انچارج ڈپٹی ڈائریکٹر آفس کو ایک جہت عطا کی۔ آڈیٹ کے تمام تر ذیلی مشمولات کو بہتر انداز میں مرتب کیا۔ ان کا خاصہ یہ تھا کی کسی بھی فائل پر فیصلہ لینے سے پہلے اپنے آپ کو ہر طرح سے مطمئن کرتے تھے اس کے لیے سوامی کی کتاب کو حرزِ جان بنائے رکھا، وہ بھی اس طور پر کہ سب کے لیے باعث خیر خواہی ثابت ہوتی رہے۔

تعلیم وتربیت میں اساتذہ وطلبہ کے ساتھ نرمی برتی لیکن جہاں ضرورت ہوئی سختی بھی کرتے تھے۔ ان کی سختی کا اندازہ ان کی بے رخی اور بے نیازانہ گفتگو سے ہی ہوجاتا تھا۔ ان کے حصّے میں کبھی غصّے اور ڈانٹ کا نام ونشان نہ تھا۔ پورے دور میں صرف ایک آدھ بار ہی غصّے میں دیکھے گئے وہ بھی جب ان کو لگا کہ یہ غصّہ اجتماعی خیر کا باعث ہوگا۔ سیمینار میں ہمیشہ موجود ہوتے، از راہِ انکساری بہت کم بولتے اور دوسروں کو ہی موقع دیتے کہ وہ اختتامی کلمات پیش کریں۔ لیکن جب بھی وہ بولتے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ موضوع پر ان کی گرفت کتنی جاندار ہے۔ کبھی اینٹی آکسیڈینٹ اور کبھی محافظ کلیہ کی بحث اور وہ بھی کیا خوب۔ اندازِ تکلّم بھی ایسا کہ لگتا تھا یہ سب ہم بھی بول سکتے ہیں اور جب ہم لوگ کوشش کرتے تو لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ پُرکشش اور منطقی انداز ہم میں نہیں آپاتا جو غفران صاحب کے انداز تکلم میں ہوتا تھا۔

شعبۂ علم الادویہ کی بہتری کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے۔ اکثر کہتے صوفی

☆ پروفیسر وصدر، شعبۂ علم الادویہ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور، کرناٹک۔ Email:sofi114@rediffmail.com، Mob.No:9916320225۔

صاحب کچھ اچھا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیشہ پروفیسر یوسف امین صاحب کو اچھے الفاظ میں یاد کرتے اور یہ ضرور کہتے کہ کلیاتی مباحث کے ساتھ نئے تحقیقاتی ڈھنگ کی ضرورت ہے۔ اکثر طلبہ سے سوال کرتے کہ زیرہ کو سرکہ میں کیوں مدبَّر کرتے ہیں، اس میں کیا تغیّر ہوتا ہے کہ وہ بہتر دوا بن جاتی ہے۔ یہ موضوع ان کا خاص تھا۔ صیدلاتی اعمال کے بنیادی اصول کو ہمیشہ کھنگالتے۔ اکثر کہتے کہ ہم نے ایک کوشش لکھنے کی کی ہے کہ صیدلہ کو نیا ڈھنگ کیسے دیں؟ کچھ اوراق ہیں جو میرے تکیہ کے نیچے پڑے ہوئے ہیں لیکن ان کی اشاعت کا حوصلہ نہیں ہے۔ ہم لوگ وجہ معلوم کرتے تو کہتے ہیں کہ صاحبِ کتاب ہونا آسان کام نہیں۔ کوئی غلطی اگر بے خیالی میں رہ گئی اور طلبہ تک پہنچ گئی تو یہ کئی پشتوں کو غلط فہمی میں ڈال دے گی۔ افسوس یہ ہے کہ ان کی مذکورہ کتاب کی اشاعت ابھی تک ان کے نام سے نہ ہوسکی۔

وہ طلبہ کی بہتر تربیت کے لیے فکرمند تھے۔ اس کے لیے نہ صرف پڑھائی پر دھیان دیتے بلکہ ان کو لکھنے لکھانے کے آداب بھی سکھاتے تھے۔ مقالات کی ہمیشہ تن دھن سے اصلاح کرتے اور اگر کوئی طالب علم یہ کہتا کہ اس کو فلاں استاد نے دیکھا ہے تو جھٹ سے کہتے کہ پھر میرے لیے آسانی ہوگئی، اب کیا ضرورت؟ اگر پھر بھی دیکھتے تو طالب علم کو ضرور یہ ہدایت کرتے کہ اس استاد کو ضرور دکھائیں اور دیکھیں کہ ان اصلاحات کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ انھوں نے عملی میدان کو کافی بہتر کیا جس کے لیے شعبہ میں بہت سے آلات (Instruments) لانے کی تگ ودو کی اور اس میں کامیاب رہے۔ HPLC کے بارے میں خاص ذکر کریں تو نیشنل انسٹی ٹیوٹ میں یہ پہلی بڑی خریداری تھی اور وزارت کو جب لکھا گیا تو انھوں نے ایک اعلیٰ سطحی خریداری کمیٹی (Higher Level Purchase Committee) تشکیل دی، جس میں ''لوہار'' صاحب بھی آئے۔ اس کمیٹی کا مشورہ غفران صاحب ہمیشہ سراہتے تھے، جب ''لوہار'' صاحب نے ایک بنیادی لسٹ مرتّب کی اور ہدایت کی کہ یہ سب آپ کے یہاں موجود ہو تو بہتر ہوگا، اس کے بعد HPLC منگائیں اور وزارت سے ساتھ میں ایک Technician بھی ضرور منگائیں۔ بہرحال Technician تو نہ آیا لیکن HPLC کا مدَّعا آگے بڑھا۔ جب آرڈر جانے کا وقت آیا تو ڈائریکٹر صاحب مخمصے میں پڑ گئے۔ اس کا حل غفران صاحب نے یہ نکالا کہ کیمسٹری کے Expert سے ایک بار پھر رائے مانگی جائے، جس کے لیے بنگلور میں Applied Chemistry کے بڑے انسٹی ٹیوٹ سے وضاحتی خط مانگا گیا اور اس طرح سے یہ انسٹرومنٹ خریدا جاسکا۔ یہ غفران صاحب ہی جانتے تھے کہ ایسا کس طرح ممکن ہوا۔

آڈِٹ کے دوران کچھ نان کمپلائنس کا آنا بہرحال ایک عام سی بات ہے لیکن این آئی یو ایم کی روایات میں اس کو بہت ہی سنگین مانا جاتا تھا۔ غفران صاحب نے پہلی بار اس طرح کوشش کی کہ بہت ساری نان کمپلائنس خود ہی حل ہوگئیں اور وہ سب آج تک Precedence کے بطور یہاں استعمال بھی ہوتی ہیں۔

پروفیسر غفران صاحب معاشیات میں سند یافتہ تھے اور وہ بھی اوّل درجہ میں۔ اخبار The Hindu ہمیشہ پڑھتے۔ ملکی معیشت میں دلچسپی رکھتے اور ہم لوگوں سے جب اس موضوع پر بات کرتے تو ضرور کوئی نہ کوئی کاروباری کام کے لیے مشورہ دیتے تھے۔ جب ۲۰۰۸ء میں معیشت میں ڈِپریشن آنے کا تھا تو ہم لوگوں سے کہتے کہ سونا خریدو اس کی قیمت بہت اونچی جانے والی ہے۔ شیئر بازار سے بھی خاص لگاؤ تھا اور طبّی دنیا کو شیئر بازار سے متعارف کرانے والے بھی آپ ہی تھے۔ ہمیشہ اپنے آپ کو اپڈیٹ رکھتے۔ انھوں نے یہی معاملہ دینی علوم میں بھی روا رکھا تھا۔ ایک بار آپ این آئی یو ایم میں Viva لینے آئے اور ہم سب اپنی پرانی پہچان کی وجہ سے ان کے اردگرد جمع ہوئے اور حال چال پوچھتے رہے۔ بیچ میں کسی نے پوچھا کہ آپ کی داڑھی اور کم ہوئی ہے تو کہنے لگے داڑھی لباس میں آتی ہے نہ کہ احکام شرعیہ میں۔ الغرض جو کچھ کہتے اس میں ان کا اپنا ایک واضح نقطۂ نظر ہمیشہ رہتا اور ہم لوگ دلائل سے مطمئن ہوجاتے۔

طب کی زبوں حالی سے بہت رنجیدہ تھے۔ بہت سارے طبّی تراجم سے مطمئن نہیں تھے۔ اس کی وجہ مترجمین کی زبانوں پر گرفت نہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان علوم سے ناواقفیت کو مانتے تھے جو صاحب کتاب کے زمانے میں مروج تھے۔ وہ خود مدرسہ کے علوم سے بہرہ ور تھے اور ساتھ ساتھ معاشیات اور طب میں بھی

دسترس تھی اس لیے آسانی سے وہ اغلاط پکڑ لیتے جو عام قاری سے پوشیدہ رہتیں۔ القانون کے ہمدرد والے انگریزی ترجمہ سے کافی ناخوش تھے اور کہتے تھے کہ یہ صرف ایک عربی داں کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے مگر طبّی نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ ضروری ہے ورنہ مشہور طبّی اصطلاحات کا ترجمہ غیر فنّی انگریزی زبان میں ہوا رکھا ہے۔ دور حاضر کی طبّی کتب پر جب رائے دیتے تو صرف افسوس کرتے اور ایک سرد آہ بھرتے، بعد ازاں مسکراتے اور کہتے کہ ریڈر اور پروفیسر بننے کے لیے کتاب لکھنا آسان ہے لیکن ایک مستند طبّی مقالہ لکھنا مشکل ہے۔ ہم لوگ مسکراتے ہوئے دل مسوس کر رہ جاتے۔

غفران صاحب کا وطیرہ تھا کہ کوئی بھی مشورہ مانگتا تو ہمیشہ خلوص سے مشورہ دیتے۔ ہمیں جب ملازمت کے سلسلے میں مشورہ لینا ہوتا تو ہماری سوچ غفران صاحب کے اردگرد ہی گھومتی جب کہ خلوص میں ہمارے دوسرے علیگ اساتذہ کم پائے کے نہ تھے اور بارہا انھوں نے ہماری ہر ممکن مدد کی۔ غفران صاحب سے اگر مقالے کے بارے میں رائے مانگتے تو جب تک اس کو پورا نہ پڑھتے کوئی بھی رائے کا اظہار نہیں کرتے لیکن جب مکمل پڑھتے تو ان کی رائے جامع ہوتی۔ زیادہ تر ہم لوگ پھر مجبوراً کہتے سر ذرا اس کی اصلاح کریں۔ مقالہ جب واپس کرتے تو معلوم ہوتا کہ ہم نے جو پہلے مسودہ دیا وہ کتنا ناکارہ تھا۔ از راہِ انکساری ضرور کہتے کے یہ میری رائے ہے، ضروری نہیں کہ آپ اس سے متفق ہوں، اس کو ایک بار پڑھ لیں اگر صحیح لگے تو شامل کر لیں۔ مطلب صاف تھا کہ میں یہاں بحیثیت استاد جس طرح تم سے پیش آتا ہوں کوشش ضرور کرنا کہ تم لوگ بھی اپنے طلبہ سے اسی طرح پیش آؤ۔

ان کا تکلّم ظرافت سے پُر تھا۔ ہمیشہ دھیمے انداز میں نصیحت کرتے تھے اور اس میں مزاح کو روا رکھتے تا کہ دل نرمی سے پگھل جائے اور بات کا اثر بھی بھرپور ہو۔ اپنے ساتھیوں کو ہمیشہ محظوظ کرتے اور خود بہت ہی حساس تھے۔ کسی کا احسان بہت مشکل سے لیتے۔ اگر کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام کسی نے ان کا کر دیا تو لگتا جیسے اس نے عمر بھر کا احسان کر دیا ہو۔ شکریہ کے ساتھ ساتھ معذرت اور اپنی عدیم الفرصتی کو مکرّر دہراتے کہ ہم لوگ جھینپ جاتے اور شرمندہ ہو جاتے۔ دل سے پھر یہی کہتے کہ سر آپ کا کام کرنا ہمیں اچھا لگا اور واقعی اچھا لگتا تھا۔ سفر میں جاتے تو یہ خیال ضرور رکھتے کہ وہ بڑے ہیں اور ہمیں پیسہ خرچ کرنے نہیں دیتے تھے۔ ساتھ ساتھ ہماری خودداری کا لحاظ بھی رکھتے تھے۔ اس واسطے پہلے ہی کچھ رقم کسی کے حوالے کرتے اور ان سے اکیلے میں کہتے کہ ذرا قاعدے سے خرچ کرنا کوئی شکایت نہ رہے، مجھے خیال نہیں رہے گا اس لیے رکھ لو۔ لاکھ کہو کہ سر یہ پیسہ بچ گیا ہے پر مجال کہ واپس لے لیں بلکہ کہتے کہ چائے پی لینا۔

علی گڑھ کی تہذیب ان میں رچ بس گئی تھی۔ ادب سے لگاؤ اتنا تھا کہ عربی، اردو اور انگریزی اشعار اور ادب ہمیشہ سامنے رہتے۔ کبھی شیکسپیئر اور کبھی علامہ اقبالؒ۔ غالب کو خوب پڑھا تھا مگر گفتگو میں بہت کم استعمال کرتے تھے۔ ایک بار کہنے لگے کے صوفی یہاں ادبی ذوق مفقود ہے، یہ لوگ شاید کسی مصنّف کو نہیں پڑھتے۔ میں جواباً وضاحت مانگتا کہ سر شاید یہ طب کے ساتھ ہی معاملہ ہے باقی جگہ تو لوگ زندہ دل لگتے ہیں وہ مسکراتے اور ان کی مسکراہٹ میں طنز کے ساتھ شکوہ بھی رہتا کیونکہ ان سب کے دوران ہاتھوں کو مخصوص دائرے میں حرکت دیتے اور بازوؤں کو جھٹکتے۔ فلسفے سے لگاؤ کم تھا اور طب میں عملی تحقیق کے حامی تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ کلیاتی پہلوؤں میں پنہاں فلسفہ کی گتھیوں کو سلجھانا آسان نہیں ہے اس کام کو محترم یوسف امین صاحب جیسے لوگوں کو کرنے دیں۔ ایک بار علی گڑھ میں صیدلہ کی تقرری کا فارم آیا میں نے مشورہ طلب کیا کہ فارم بھروں یا نہیں۔ کہنے لگے آپ پہلے ہی پروفیسر کی پوسٹ پر ہیں، اس لیے اس پوسٹ کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ صیدلہ میں ریڈر کی پوسٹ کے لیے کیوں آ رہے ہیں، جواباً جب میں نے مطمئن کیا تو کہنے لگے صوفی ابھی رک جاؤ ادویہ میں پوسٹ آ رہی ہے اس میں درخواست بھر لینا، ہم لوگوں کے یہاں کچھ لوگوں کی ضرورت ہے جو کچھ نئے انداز میں تحقیق میں دلچسپی رکھتے ہوں اور طب کی عملی تحقیق کو آگے بڑھائیں۔ لیکن کورونا کے بے رحم لپیٹ میں آ گئے اور اپنے حقیقی رب سے جا ملے۔ کتنے خواب تھے جو ختم ہوئے اور کتنے لوگوں کو رلا گئے۔ یونانی طب کا یہ سورج کیا بجھا کہ دور دور تک کوئی شمع دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزا دے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین ثم آمین!

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

کسوف نیم روز

ڈاکٹر امان اللہ ☆

کون جانے کس گھڑی وقت کا بدلے مزاج

ساحرلدھیانوی کے اس مصرعے کی ہیبت ناک معنویت کا گذشتہ چند برسوں میں خوب مشاہدہ ہوا۔ ۲۰۲۰ء کے اوائل میں ہندستان میں کووڈ-۱۹ کی بلاخیز آمد کے بعد مشکلوں اور آزمائشوں کا جو دور شروع ہوا وہ اب تک جاری ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جسے اس عالمی وبا نے متأثر نہ کیا۔ اس مرض میں جو مبتلا ہوئے انھیں جن جسمانی وذہنی آلام کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے گھر والوں پر جو گزری، اس کا صحیح ادراک وہی کر سکتے ہیں۔ جو صحت مند رہے اور رحمت خداوندی سے ان کا گھر بھی محفوظ رہا، ان کے پاس بھی سنانے کو غم کے بہت سے قصے ہیں۔ لیکن جو اس بلا کا شکار ہوئے، ان کے لیے قیامت اور ان کے عزیزوں کے لیے قیامت صغریٰ قائم ہوگئی۔

اپریل ۲۰۲۱ء کا وسط، رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ اختتام ہفتہ پر میں دہلی سے غازی آباد اپنی ہمشیرہ کے گھر گیا۔ افطار، نمازوں اور کھانے کے بعد آرام سے سویا۔ سحری میں اٹھا تو سر درد، ہلکے بخار اور تکان کا احساس ہوا۔ کھانے کی خواہش بھی نہ ہوئی، جو کھایا اس میں کڑواہٹ محسوس ہوئی۔ ذہن نے اشارہ دے دیا کہ جناب آپ بھی گرفتار وبا ہوئے۔ ستم بالائے ستم کہ اسی وقت موبائل فون کی گھنٹی بجی اور ایک قریبی عزیز کی وفات کی اطلاع ملی۔ وہ کئی دنوں سے کووڈ-۱۹ جیسی علامات میں مبتلا تھے۔ صبح ہوتے ہی میں ہمشیرہ کے گھر سے ان کی سلامتی کی دعا کرتے ہوئے واپس اپنے گھر آیا اور ایک کمرے میں علاحدگی اختیار کر لی۔ علامات خفیف اور اوسط درجے سے آگے نہ بڑھیں۔ ۱۰-۱۲/ روز تک مرض اور طبیعت میں جنگ ہوتی رہی اور بالآخر اللہ کے حکم سے طبیعت کو فتح حاصل ہوئی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب استاذ محترم پروفیسر غفران احمد، اللہ مغفرت فرمائے، کی علالت کی خبر ملی۔ براہ راست ان سے تو رابطہ ممکن نہ تھا لیکن مشترک احباب اور وہاٹس ایپ گروپ کے ذریعے واقف حال ہوتا رہا۔ زبان ودل جب بھی اپنی سلامتی کے لیے دعا گو ہوتے پروفیسر مرحوم شامل رہتے لیکن ... رب کائنات کی حکمت اور فیصلہ کہ ان کے حوالے سے ان سطور کو اس طرح رقم کرنا مقدور ٹھہرا۔ مارچ کے اواخر میں ہی تو ان سے فون پر ایک طویل گفتگو ہوئی تھی۔ ایک گھنٹے سے زائد کی اس گفتگو کے بہت سے رنگ تھے۔ ذاتی احوال، احباب کی باتیں، یونیورسٹی کے شب وروز، کووڈ-۱۹ سے متعلق وزارت آیوش اور سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن کی سرگرمیاں اور ان کے ایک زیرِ تکمیل تصنیفی پروجیکٹ سے متعلق باہمی محسوسات۔ کسے خبر تھی کہ وہ مشفق اور رہنما آواز پھر کبھی نہ سنائی دے گی۔ بھلے ہی حلقوم سماعت میں کانٹے اگ آئیں!

ان سے تعارف وران کا التفات... اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ میں وہ میرے بہت سینئر تھے۔ غالباً میں پری طب اور وہ بی یو ایم ایس کے آخری سال، پھر میں بی یو ایم ایس اور وہ ایم ڈی (علم الادویہ) کے متعلم رہے۔ اس دوران ذاتی تعارف کا شرف مجھے حاصل نہ ہو سکا البتہ جونیئرس میں کالج کے جن ممتاز طلبہ کا چرچا تھا ان میں ان کا نام شامل رہتا تھا۔ ان کی شخصیت سے روبرو ہونے کا موقع مجھے اپنی ایم ڈی کے پہلے سال (۱۹۹۷-۱۹۹۸) میں ملا۔ اس زمانے میں ایم ڈی کے پہلے سال کا نصاب تعلیم تمام شعبوں کے لیے یکساں ہوا کرتا تھا۔ کلیات وعلم الامراض سے وابستگی کے باوجود فارمیکولوجی، جو ریسرچ میتھڈس اینڈ بایو اسٹیٹسٹکس کے ایک جزء کے طور پر میرے مضامین میں شامل تھی، کی چند کلاسیں

☆ ریسرچ آفیسر (یونانی) سائنٹسٹ-IV، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی، مدیر جہان طب، نئی دہلی۔ Email:amanullah.ccrum@gmail.com، Mob.No:9899670576۔

مرحوم نے لیں۔ گو بحیثیت استاذ یہ ان کے کیریئر کا ابتدائی زمانہ تھا لیکن نہ صرف مضمون کی حد تک بلکہ من حیث المجموع ذہن پر ایک خوش آئند اثر قائم ہوا اور خواہش ہوئی کہ شاگردی کا یہ سلسلہ طویل ہو، ایسا ہو نہ سکا اور مزید کی تشنگی باقی ہی رہی۔ ایم ڈی فرسٹ ایر مکمل ہونے کے بعد سب اپنے اپنے ڈپارٹمنٹ کے ہو رہے لیکن درسی اور غیر درسی رہنمائی کے لیے میں کبھی بھی مرحوم کی زیارت کرتا اور شادکام ہوتا۔

اردو کی تو خیر بات ہی کیا، عربی و فارسی سے مکمل واقفیت کے ساتھ انگریزی زبان میں بھی ان کو مہارت حاصل تھی۔ راقم کو بھی ان زبانوں کی کچھ شدبد ہے۔ بات ۱۹۹۸ء یا ۱۹۹۹ء کی ہے، کچھ خاص نہیں لیکن یاد آرہی ہے۔ ایک روز شعبۂ علم الادویہ کے ان کے چیمبر میں ہم دو تین ساتھی بیٹھے تھے۔ میں نے وہاں رکھے ایک جرنل کو اٹھالیا۔ یونہی ایک لفظ 'Refurbish' پر نظر پڑی۔ سمجھ میں نہ آیا تو بلا تکلف پوچھ لیا۔ ساتھیوں کے لیے بھی یہ لفظ نیا تھا۔ سَر نے نہ صرف اس کے معنیٰ بتائے بلکہ 'Refurnish' اور 'Refurbish' کے باہمی فرق کو بھی واضح کیا۔ ہم اس وقت کے ان کے شاگرد ان کا ذکر کبھی بھائی اور کبھی سر کے لاحقوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ دونوں رشتوں کی رعایت ہو جاتی ہے۔

علم الادویہ تو ان کا اختصاص تھا، یونانی طب سے ماورا بھی معلومات کا ایک خزانہ تھا ان کے پاس۔ تاریخ، ادب، دینیات اور حالات حاضرہ پر گرفت رکھتے تھے۔ ہم چند دوستوں کو ایم ڈی کے وظیفے سے حاصل ہونے والی رقم کی سرمایہ کاری کا خیال آیا۔ غفران بھائی سے رہنمائی طلب کی۔ انھوں نے جس تکنیکی انداز سے تمام امکانات کا تجزیہ کیا، میں تو حیران رہ گیا۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ بی یو ایم ایس میں داخلے سے قبل وہ بی اے کے طالب علم رہ چکے تھے اور معاشیات ان کا مضمون تھا۔ ایسے ہی تھے وہ؛ علم کے تشنہ، حکمت کے جویا، تحقیق کے رسیا اور فضل و دانش کے نقیب! شخصیت کا یہ ایک پہلو ہے... علم و فضل میں کوئی شخص کتنا ہی بڑا اور ممتاز کیوں نہ ہو لیکن اگر اعلیٰ انسانی اوصاف، شائستگی اور بہتر اخلاق کا حامل نہیں تو شاید سب عبث ہے۔ اس آفاقی پیمانے پر بھی مرحوم کی حیثیت امتیازی تھی۔ چہرے پر ذہانت، متانت، ملائمت اور معصومیت کی جو روشنی تھی وہ دراصل ان کے اندرون کا عکس تھی۔ سادگی اور وضع داری کا امتزاج آسان نہیں ہوتا لیکن ان کے یہاں یہ مشکل آسان ہوگئی تھی۔ بے جا تکلف، تصنع اور ظاہر داری سے انہیں واسطہ نہ تھا۔ ناپسندیدہ شخص کو نباہنے اور ناگوار بات کو برداشت کرنے کا صبر آزما فن انھیں آتا تھا۔ بعض دفعہ شاہد بنا میں ان کی اس خوبی کا۔

علی گڑھ چھوڑنے کے بعد، جیسا کہ ہوتا ہے، غم ذات اور غم روزگار میں ایسا الجھا کہ ان سے رابطہ منقطع سا رہا۔ سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن کی ملازمت اور اس کے ہیڈکوارٹرس میں سرگرم عمل ہونے کے بھی برسوں بعد دوبارہ روابط استوار ہوئے۔ کونسل کے لٹریری ریسرچ پروگرام اور 'جہان طب' کی دیکھ ریکھ دیگر بہت سے کاموں کے ساتھ میری اہم ذمہ داریاں ہیں۔ ان حوالوں سے اور کونسل کی میٹنگوں میں ان کی آمد سے مسلسل ربط کی صورتیں پیدا ہوتی گئیں۔ کونسل کے تحقیقی کاموں اور علمی خدمات کو وہ استحسان کی نظروں سے دیکھتے بالخصوص جن کاموں سے ان کے شاگردوں کی وابستگی ہوتی اس پر فخر کرتے، مفید مشوروں سے نوازتے اور سب سے بڑھ کر اعتماد کا اظہار کرتے۔ آخر الذکر کی اہمیت بہت زیادہ ہے بالخصوص یونانی طب کے تناظر میں۔ اعتماد چاہے وہ اپنا خود پر ہو یا کسی کا دوسرے پر ازبس ضروری ہے کہ اسی سے تمام معرکے سر ہوتے ہیں۔ جب کوئی ایسا جسے آپ آئیڈیالائز کرتے ہوں، آپ کو آپ کے کسی وصف کی بنیاد پر اعتماد سے پُر کرے تو یقین مانیے ایک خاص توانائی محسوس ہوتی ہے، فتح کرنے کا ناقابل شکست جذبہ پیدا ہوتا ہے اور پھر تمام منزلیں آسان ہو جاتی ہیں۔

گذشتہ برسوں کے دوران کئی علمی کاموں میں ان کا ساتھ اور ان کی رہنمائی حاصل رہی۔ 'اسٹینڈرڈ یونانی ٹریٹمنٹ گائیڈ لائنز فار کامن ڈزیزز' کی تدوین ایک منفرد پروجیکٹ تھا، راقم کی وابستگی رہی اس پروجیکٹ سے۔ کونسل میں تیار ہونے والے ڈرافٹ کے تنقیدی تجزیے میں مرحوم بھی شامل تھے۔ اپنے مضمون سے متعلق مواد کے علاوہ زبان و بیان اور پیش کش کے جدید اسلوب کے حوالے سے ان کی خدمات نہایت وقیع تھیں جن کی بدولت ایک نئے قسم کے طبی ادب کا رواج شروع ہوا۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی رہنمائی اور مالی تعاون سے کونسل نے طبی اصطلاحات کی معیار بندی کا ایک پروجیکٹ ۲۰۱۲ء میں مکمل کیا تھا، ہندستانی طبوں میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا کام تھا۔ بعد ازاں ڈبلیو ایچ او نے روایتی طبوں سے متعلق اصطلاحات کی معیار بندی کے کام کو وسعت دیتے ہوئے ۲۰۱۶ء میں حکومت ہند

سے اشتراک قائم کیا اور وزارت آیوش کی نگرانی میں ماہرین کا انتخاب کیا۔ مرحوم کا نام ان معدودے چند ماہرین میں شامل تھا۔ ابتدائی میٹنگوں کے بعد کونسل کے حکیم اجمل خان انسٹی ٹیوٹ فار لٹریری اینڈ ہسٹوریکل ریسرچ ان یونانی میڈیسن میں اصل پروجیکٹ پر کام شروع ہوا اور کئی برسوں کی محنت شاقہ کے بعد ایک طے شدہ فارمیٹ کے مطابق کم وبیش پانچ ہزار یونانی طبی اصطلاحات کی معیار بندی عمل میں آئی۔ اس پورے عمل کا حصہ ہونے کی حیثیت سے راقم نے تمام چیزوں کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ مرحوم نے ایک ایکسپرٹ سے بڑھ کر جس ذوق وشوق اور جذبۂ سپردگی سے تمام مراحل مکمل کرائے وہ ہم خوردوں کے لیے روشن مثال ہے۔ پروفیسر غفران احمد مرحوم اور پروفیسر سید شاکر جمیل صاحب اکثر راقم اور پروجیکٹ سے وابستہ دیگر افراد سے کہا کرتے کہ یہ صرف ایک کام نہیں بلکہ امانت ہے جس کی ادائیگی کے لیے وقت نے ہمارا انتخاب کیا ہے، بین الاقوامی برادری اور مستقبل کی نسلیں یونانی طب کو سمجھنے کے لیے جب اس کی اصطلاحات کو تلاش کریں گی تو یہ دستاویز ان کی رہنمائی کرے گی۔ سچ ہی ہے ان کی بات!

دسمبر ۲۰۱۹ء میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے آیورویدہ، یونانی اور سدّھ کی اصطلاحات کے ڈرافٹ پر بحث کے لیے بین الاقوامی ماہرین کی ایک میٹنگ کا انعقاد کیا۔ وزارت آیوش، حکومت ہند نے گجرات آیورویدہ یونیورسٹی، جام نگر، گجرات میں میٹنگ کی میزبانی کی جس میں دو درجن سے زائد ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ یونانی طب کے ماہرین میں ایران، متحدہ عرب امارات، جنوبی افریقہ، سری لنکا اور بنگلہ دیش کے نمائندے شامل تھے۔ ہندستان کی نمائندگی پروفیسر سید شاکر جمیل صاحب، پروفیسر غفران احمد مرحوم، راقم، ڈاکٹر بلال احمد اور ڈاکٹر نیلم قدوسی نے کی۔ تین روزہ میٹنگ اور چار پانچ روز کے قیام میں علمی نشستوں کے ساتھ ذاتی ملاقاتیں بھی رہیں، بہت ساری باتیں بھی ہوئیں۔ ان کی شفقتوں، عنایتوں اور حوصلہ افزائیوں سے ہم تینوں محظوظ ہوتے رہے۔ ع

نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا

جس عہد میں ہم جی رہے ہیں وہ نمائش، ریا اور نمود کا ہے۔ عام طور سے لوگ وہ کام کرنا پسند ہی نہیں کرتے جس کا شہرہ نہ ہو۔ بسا اوقات بات اس سے بھی بڑھ جاتی ہے اور 'ویُحبُّونَ أن یُحمَدوا بمالم یفعلوا' کے مصداق چاہت یہ ہوتی ہے کہ اس کام کا بھی کریڈیٹ مل جائے جو کیا ہی نہیں۔ مرحوم کے حوالے سے تجربہ یکسر مختلف ہے۔ سطور بالا میں ان کے کام کرنے کے انداز کا جو ہلکا سا ذکر ہوا، وہ دراصل وہ کام تھے جن میں وہ باضابطہ طور پر شامل تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ کسی پروجیکٹ میں باضابطہ ان کی شمولیت نہ تھی لیکن جب بھی ان کی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوئی وہ ملی، اور بھرپور انداز میں ملی۔ راقم انگریزی کے ایک اہم ڈاکیومنٹ پر کام کر رہا تھا جس کا اجرا کتاب کی شکل میں یونانی ڈے پر ہونا تھا۔ وقت کم اور کام زیادہ، اوپر سے دفتر کی روزمرہ کی مصروفیات۔ اپنے طور پر جب ڈرافٹ مکمل کرلیا تو کسی باریک بیں ایکسپرٹ کی نظر ثانی اور تصحیح کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ ممکنہ غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ استناد بھی حاصل ہوجائے۔ ذہن کے پردے پر مرحوم ہی کا نام روشن ہوا۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ صرف دو تین روز کا وقت بچا تھا اور باضابطہ گزارش کا موقع نہ تھا۔ فون پر ان سے رابطہ قائم کیا اور پوری صورت حال بیان کی۔ پہلے تو ازراہ حوصلہ افزائی انھوں نے کہا کہ تم نے کرلیا ہے تو اچھا ہی ہوگا، میرے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے، اصرار پر فوراً راضی ہوگئے۔ مزید جرأت کی کہ سر دو یا تین دن میں ڈرافٹ واپس چاہیے، وہ بھی ٹریک موڈ میں تجویز کردہ تبدیلیوں کے ساتھ۔ ان کی خوردنوازی، علم دوستی اور مان رکھنے کی ادا کہ یہ زحمت بخوشی اٹھائی۔ ورنہ... بڑوں سے تو فون پر رابطہ قائم کرنے میں ہی کئی کئی روز نکل جاتے ہیں۔ دیرینہ قربت کا دعویٰ تو نہیں لیکن جتنا التفات بھی نصیب ہوا وہ قابل رشک ہے۔

ماہ وسال کی گردش، لیل ونہار کی آمد اور صبح وشام کا آنا جانا، سب ایک نظام کے تابع ہے جس میں آفتاب کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر تبدیلی کا ایک معلوم وقت ہوتا ہے۔ اس تبدیلی کے لیے تیاریاں کی جاتی ہیں لیکن اگر آفتاب کو ہی گہن لگ جائے تو وقت ٹھہر جاتا ہے۔ زندگی اور اس کی سرگرمیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ نظام شمسی کے سورج کا گہن تو جلد دور ہوجاتا ہے لیکن خورشید صفت انسان کو اگر نصف النہار میں گہن لگ جائے تو ایک دم اندھیرا چھا جاتا ہے۔ کاش! کائنات کے سورج کی طرح یہ گہن بھی دور ہوسکتا۔

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

پیکر صدق وصفا

استاذ مرحوم

ڈاکٹر معراج الحق ☆

کورونا کی وبا نے گذشتہ دنوں جو تباہی مچائی اس سے ہم سب واقف ہیں۔ اس وبا میں ہم سب نے اپنے کسی نہ کسی عزیز کو کھویا ہے، طبیہ کالج علی گڑھ نے اس وبا میں اپنے بہت سے اساتذہ اور کارکنان کو کھویا ہے۔ استاذ مرحوم پروفیسر غفران احمد بھی اسی وبا کا شکار ہو کر ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء کی صبح ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔اللہ تعالی استاذ مرحوم اور دیگر مرحومین کی بشری خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انھیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

اس حادثے کی خبر کس قدر تکلیف دہ تھی، بیان سے باہر ہے۔ میرے لیے یہ صدمہ نا قابل برداشت تھا، کئی دنوں تک حالت یہ رہی کہ تنہائی میں جیسے ہی ان کا مشفق چہرہ نظروں کے سامنے آتا بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے مگر سچائی سے کب تک نظریں چرائی جاسکتی ہیں، آخر کار اس تلخ حقیقت کا یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر جا چکے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اب صرف ان کا وہ روشن چہرہ، مسکراتی شفقت بھی نظریں اور اپنائیت بھری آواز کی یادیں ہی ہمارے ساتھ رہیں گی۔

یوں تو مرحوم کالج کے صف اول کے اساتذہ میں سے تھے اور اپنی علمی وتحقیقی سرگرمیوں کے سبب ایک لائق وفائق استاذ کے ساتھ ساتھ طبی دنیا کی ایک انتہائی قابل، معتبر اور فعال شخصیت کے علاوہ ہندستان بھر میں نئی نسل کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتے تھے مگر میرے اور مجھ جیسے دوسرے بہت سے طلبہ، احباب اور متعلقین کے لیے ان کی شخصیت کے بے شمار رنگ ہیں اور ہر رنگ اپنے آپ میں عجب دلکشی رکھتا ہے۔ وہ ایک مشفق استاذ اور اچھے اسکالر ہونے کے ساتھ ساتھ ذاتی طور پر بڑے ہی ہنس مکھ، خلیق، ملنسار، مونس وغمخوار، مخلص دوست، اچھے سرپرست، باوفا و بامروت طبیعت کے مالک، دوسروں کے دکھ درد میں شریک رہنے اور ان کی مدد کرنے والے، حلم وبردباری اور صدق وصفا کے پیکر غرضیکہ ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جہاں اپنے بزرگوں کی عزت وتکریم کرتے وہیں اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی میں کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ معاصرانہ چشمک ان کے یہاں معدوم تھی، اگر کبھی کسی کے متعلق تبصرہ کرتے تو ہمیشہ ذاتیات سے احتراز کرتے ہوئے اصولی باتوں میں تعریف یا تنقید کرتے، کوئی بھی معاملہ اگر ان کے سامنے زیر بحث آتا تو متعلقہ افراد کے کے نقائص تلاش کرنے کے بجائے ہمیشہ معاملے کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے اور اگر خامیوں کی نشاندہی بھی کرتے تو برائے اصلاح، کسی کو ہدف تنقید بنانے کے لیے قطعاً نہیں۔

استاذ مرحوم سے یوں تو بحیثیت شاگرد براہ راست میرا واسطہ بڑے مختصر وقت کے لیے رہا مگر طالب علمی کے دوران ان سے جو رشتہ قائم ہوا وہ مرحوم کی وفات تک برابر قائم رہا۔

مرحوم سے میری پہلی ملاقات شمشاد مارکیٹ میں ان کے ایک دوست کے ساتھ ۱۹۹۵ء کے آخری ایام میں ہوئی، بڑی ہی مختصر ملاقات تھی مگر یہ ملاقات ذہن پر ایک نقش چھوڑ گئی۔ اس کے بعد ۱۹۹۷ء میں جب مجھے ایم ڈی (علم الادویہ) میں داخلہ ملا تو وہاں شعبہ علم الادویہ میں بحیثیت طالب علم ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی اور شاگردی کا یہ رشتہ جلد ہی برادرانہ تعلق میں بدل گیا اور پھر تعلیم سے فراغت

☆حکیم اجمل خان انسٹی ٹیوٹ فار لٹریری اینڈ ہسٹوریکل ریسرچ ان یونانی میڈیسن (سی سی آر یو ایم)، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ Mob.No:9315128997، Email:meraj_314@yahoo.co.in۔

کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھنے سے لے کر آج تک یہ تعلق خاطر اسی طرح قائم رہا۔

ایک مؤمن کے امتیازات کیا ہوتے ہیں اور اسے کن صفات سے متصف ہونا چاہیے، اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے مروی مختلف احادیث مثلاً "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، خیر الناس من ینفع الناس، خیر کم خیر کم لاهله وانا خیر کم لاهلی" میں ایک اچھے مؤمن کی جتنی صفات بیان کی گئی ہیں، بنیادی طور پر یہ تمام صفات انسان کی سماجی اور معاشرتی زندگی سے متعلق ہیں۔ انسان اپنی سماجی زندگی میں دوسروں کے ساتھ جس طرح کے معاملات کرتا اور اپنی سماجی ذمہ داریوں کو نبھانے میں جو رویہ اپناتا ہے اسی سے آدمی کی شناخت بنتی ہے۔ آپ ﷺ کے مذکورہ فرمودات میں 'خیر' کا ایک عملی نمونہ مرحوم کی ذات تھی۔

گذشتہ تقریباً پچیس سال کے عرصے میں جب جب میرا ان سے سابقہ ہوا تو ہر موقعے پر انھیں ایک معیاری اور مثالی انسان پایا۔ ان کے ابتدائی ایام خصوصاً علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے کی باتیں تو ان کے وہ احباب زیادہ بہتر بتا سکیں گے جو ان کے ہم سبق رہے ہوں، ان کے ہم عمر اور ان کے دوست رہے ہوں لیکن طبیہ کالج کے شعبہ علم الادویہ میں ۱۹۹۶ء میں لیکچرر کی حیثیت سے ان کی تعیناتی کے کچھ ہی دنوں بعد جب میں بحیثیت شاگرد ان سے ملا تب سے ان کی زندگی کے آخری ایام تک برابر ان سے میرا رشتہ بنا رہا۔ اس پورے عرصے میں مجھے ان کو جاننے، برتنے اور ان سے سیکھنے کے بہت سے مواقع میسر آئے اور ہر موقع پر ان کی شخصیت پہلے سے زیادہ دلکش نظر آئی۔ دراصل ان کی علمی بصیرت اور فنی مہارت کے ساتھ ذاتی زندگی میں ان کی سادگی، خلوص، شفقت و محبت اور خاکساری ایسی خوبیاں تھیں جو سامنے والے کو ان کا گرویدہ بنا دیتی تھیں۔ جو بھی ایک بار ان سے ملتا وہ ان سے بار بار ملنے کا مشتاق رہتا، رشتوں کا نبھانا کوئی ان سے سیکھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد عملی زندگی میں مطب کے بجائے درس و تدریس سے وابستگی کا فیصلہ استاذ مرحوم کی ہدایات کے مطابق ہی تھا، علی گڑھ اور کولکاتا میں مختصر وقفے تک تدریسی خدمات سے وابستہ رہنے کے بعد جب ۲۰۰۴ء میں سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن اور سی ایس آئی آر کے باہمی اشتراک سے شروع ہونے والے پروجیکٹ ٹی کے ڈی ایل کو جوائن کیا تو استاذ محترم سے روابط میں مزید اضافہ ہوا اور کونسل میں تعیناتی کے بعد بھی یہ سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہا۔ سال ۲۰۱۵ء میں جب میرا تبادلہ سی سی آر یو ایم کے ذیلی ادارہ لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، جامعہ ہمدرد، دہلی میں ہوا جو اسی سال وہاں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں منتقل ہو گیا تو اس کے بعد مرحوم سے ملاقاتوں کے مواقع بڑھ گئے۔ آپ کا جب بھی دہلی آنا ہوتا تو اکثر واپسی سے پہلے اپنے شاگردوں کو ملاقات کا موقع ضرور دیتے اور یہ مختصر سی ملاقات رشتوں کی آبیاری کے علاوہ علمی و فنی امور سے متعلق بہت سی گتھیوں کو سلجھانے اور علمی کاموں کے کرنے کا جوش اور حوصلہ دیتی۔ تقریباً ہر ملاقات میں طبی دنیا کی علمی سرگرمیوں سے متعلق ضرور گفتگو فرماتے، طب کے مستقبل کا منظر نامہ کیا ہے، اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں، وقت کے تقاضے کیا ہیں، ہمیں کس نہج پر اور کن جہات میں کام کرنے کی ضرورت ہے، یہ اور اس طرح کے دوسرے علمی امور پر ضرور روشنی ڈالتے۔ اپنے شاگردوں اور ان کی صلاحیتوں کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے اور موقع بموقع اس کا نہ صرف اظہار بلکہ فخریہ اس کا تذکرہ بھی کرتے تھے۔ شاگردوں سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ جس طرح ان کے شاگرد ان پر اپنا حق سمجھتے تھے اور جب بھی ضرورت ہوئی بلا جھجک ان سے رجوع کرتے تھے اسی طرح مرحوم بھی علمی کاموں میں ضرورت کے وقت بلا تکلف اپنے کسی شاگرد کو فون کرتے اور دریافت احوال کے بعد براہِ راست متعلقہ معلومات فراہم کرنے کو کہتے، حالانکہ عموماً یہ لاحقہ ضرور لگاتے کہ جلدی نہیں ہے، موقع ملے تو اسے دیکھ کر بتاؤ مگر عموماً ہوتا یہی تھا کہ کسی بھی کام میں صبح سے شام یا شام سے صبح تک کی تاخیر بھی بمشکل ہوتی تھی۔ مزے کی بات یہ کہ جسے بھی وہ اپنا کام سپرد کرتے، وہ کام کر کے نہ صرف خوش ہوتا بلکہ اسے اپنے لیے سعادت سمجھتا تھا۔ آپ کے اس انداز سے جہاں استاذ شاگرد کے درمیان اس روحانی رشتے کو جلا ملتی وہیں شاگرد کو مذکورہ مسائل کو ایک نئے

زوایے سے دیکھنے کا موقع ملتا اور اسے بالواسطہ مزید مطالعہ کی ترغیب بھی ملتی تھی۔ اسی طرح ایک طرف اپنے شاگردوں کے تئیں جہاں آپ اس حق سے معاملہ کرتے وہیں دوسری طرف ان کے لیے اتنے ہی فکرمند بھی رہتے اور ضرورت کے وقت ان کی رہنمائی اور مدد کے لیے ہمہ تن تیار رہتے۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ میں اپنی افتادِ طبع سے مجبور کافی دنوں تک ان کو فون نہ کر پاتا تو خود استاذ مرحوم کا فون آجاتا، یہ نہ صرف میرے تئیں ان کی فکرمندی کا اظہار ہوتا بلکہ اسی بہانے ترتیت بھی مقصود ہوتی تھی اور ساتھ ہی یہ احساس دلانا بھی کہ گھبراؤ نہیں، میں تمھارے پاس ہی ہوں اور یہ معاملہ میرے ساتھ خاص نہیں تھا بلکہ ان کے دوسرے بہت سے شاگردوں نے بھی اس چیز کی تصدیق کی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جملہ اساتذہ میں مرحوم کی ذات واحد ایسی شخصیت تھی جن سے نہ صرف میں بلکہ ان کے دیگر شاگرد بھی علمی مسائل کے علاوہ اپنے ذاتی مسائل میں بھی مشورہ کرنے میں کسی طرح کی جھجک نہیں محسوس کرتے تھے اور وہ ایک مشفق استاذ اور بڑے کی طرح بڑے ہی خلوص اور اپنائیت کے ساتھ ان مسائل کے حل کرنے میں مدد اور رہنمائی کرتے تھے۔

بحیثیت استاذ اپنے طلبہ کے تئیں مرحوم کی دلچسپی، مشکلات میں ان کی رہنمائی اور بلا کسی امتیاز کے ہر طالب علم کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا، یہ ان کے وہ اوصاف تھے جن کا ان کے رابطے میں آنے والا ہر طالب علم معترف ہوگا۔ اُس زمانے میں طبیہ کالج میں ایم ڈی میں داخلہ ہونے کے بعد تعلیم کا آغاز ہوتے ہی طلبہ تحقیقی موضوعات کی تلاش میں آپ کے کمرے کے گرد منڈلانا شروع کر دیتے اور ہر طالبعلم خواہ کالج کے کسی بھی شعبہ سے اس کا تعلق ہو، آپ کے پاس اس اعتماد سے آتا تھا کہ اس معاملے میں اس کی آپ سے بہتر کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ آپ نہ صرف ان کی رہنمائی کرتے اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے بلکہ بارہا ایسا دیکھنے میں آیا کہ اسے مطلوبہ معلومات کی فراہمی کے لیے آپ اپنا ذاتی وقت، اپنے تعلقات اور بعض مواقع پر اپنے پیسے خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ آپ کی اس سادگی، مروت اور دوسروں کی مدد کے جذبے کا بعض لوگ فائدہ بھی اٹھاتے تھے اور بہت سے ایسے کام جو آپ کے منصبی فرائض سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے تھے، ان کے لیے آپ سے درخواست کرتے اور آپ صرف مروت میں معذرت نہ کر پاتے اور پھر اس کی تکمیل میں اپنے نجی اوقات میں سے گھنٹوں کا وقت صرف کرتے اور بے نیازی کا یہ عالَم تھا کہ کبھی اس طرح کے کاموں میں اپنی شراکت کی خواہش نہیں رکھی۔ چونکہ طبعاً انتہائی صاف دل کے مالک تھے اور دوسروں کو بھی اپنی طرح ہی سمجھتے تھے اسی لیے بہت سے مواقع پر لوگ آپ کی اس سادگی کا فائدہ اٹھاتے تھے اور آپ کا بہت سا وقت اس طرح کاموں میں نکل جاتا تھا۔ جب بھی کبھی کوئی آپ کو اس جانب توجہ دلانے کی کوشش کرتا تو آپ مسکرا کر بات کو ٹال دیتے۔

طلبہ کے تحقیقی کام کے معاملے میں اصولوں کے بڑے پابند تھے اور اپنے طلبہ سے بھی اس کی امید رکھتے تھے۔ ایم ڈی کے دوران طلبہ عموماً ریسرچ کے لیے ہلکے پھلکے موضوعات پسند کرتے ہیں تاکہ وہ معینہ وقت اور محدود وسائل میں اسے بآسانی مکمل کر سکیں۔ لیکن اس کے بعد بھی بعض طلبہ مصادر و مراجع کی تلاش اور لیب کے کاموں میں تساہلی برتتے اور آخری وقت میں کوشش کرتے کہ کسی طرح مقالہ لکھ کر نگراں سے دستخط کروالیں۔ مرحوم اس معاملے میں بڑے سخت تھے، وہ تحقیقی امور میں طلبہ کی رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ ضرورت پڑنے پر خود بھی وقت دیتے تھے اور طالب علم سے یہ امید رکھتے تھے کہ وہ بھی اس معاملے میں کسی طرح کی کمی نہیں کرے گا۔ اسی لیے بعض دفعہ ایسا دیکھنے میں آیا کہ تحقیقی کام اطمینان بخش نہ ہونے پر آخری مرحلے میں بھی آپ نے اسے نقائص دور کرنے کا حکم دیا۔ آپ کا یہ معمول تھا کہ جن طلبہ کے تحقیقی کاموں میں آپ ان کے نگران کار ہوتے تو ابتداء سے لے کر تحقیقی مقالہ تیار ہونے تک ہر قدم پر آپ طالب علم کی رہنمائی کرتے، وقت وقت پر کام کی پیش رفت کا جائزہ لیتے، اگر کوئی مشکل پیش آتی تو اس کے تدارک کی سبیل کرتے اور ریسرچ مکمل ہونے تک طالب علم کی پوری طرح سرپرستی کرتے۔ موضوع سے متعلق لٹریچر کے مطالعہ پر خاص طور سے زور دیتے، مجھے یاد ہے کہ علم الادویہ کی لائبریری میں موجود قدماء کی بیشتر کتابوں کی ورق گردانی اور انھیں دیکھنے کا موقع مجھے اسی وقت ملا، طبیہ کالج لائبریری کی عربی و فارسی مصادر کے علاوہ انگریزی رسائل و جرائد اور موضوع سے متعلق دوسری

کتابوں کے لیے میں نے انہی کی ہدایت پر نہ صرف یونیورسٹی کے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج کی لائبریری، کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی لائبریری اور مولانا آزاد لائبریری کے بارہا چکر لگائے بلکہ ایمس، دہلی میں واقع نیشنل میڈیکل لائبریری بھی کئی بار جانا ہوا۔ تحقیقی مقالہ لکھنے کے مختلف مراحل میں طلبہ کی رہنمائی کے علاوہ مقالہ کے مسودہ کو آخری شکل دینے کے لیے آپ خاص طور پر وقت نکالتے اور اپنی مصروفیات کے باوجود اس بات کا پورا دھیان رکھتے کہ مقالہ بروقت تیار ہو جائے تاکہ آپ کی تاخیر کی وجہ سے طالب علم کو اس کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے۔ مجھے اچھی یاد ہے کہ جب میں نے اپنے تحقیقی مقالہ کا کام مکمل کر کے اسے لکھ کر آپ کے پاس لے کر پہنچا تو اس وقت گرمی کی چھٹیاں تھیں اور آپ بھی چھٹی پر تھے، آپ کے بچے وطن گئے ہوئے تھے، آپ نے اپنے گھر پر ہی مسلسل تین دنوں تک صبح سے دیر رات تک بیٹھ کر مقالہ کا مسودہ تیار کرایا، جب مقالہ کا مسودہ فائنل ہو گیا تو آپ نے کہا کہ اب اسے فوراً ٹائپسٹ کو دے کر آؤ۔ اس دوران آپ نے اپنی ساری مصروفیات کو معطل رکھا اور کام مکمل ہونے کے بعد ہی آپ گھر سے نکلے۔ یہ صرف میرا واقعہ نہیں ہے بلکہ بیشتر طلبہ جو اپنے کام میں دلچسپی لیتے تھے، ان کے ساتھ آپ کا یہی معاملہ رہتا تھا۔ ان کے ایک دوسرے شاگرد نے خود مجھے بتایا کہ ان کا مقالہ فائنل کرتے وقت بھی کچھ ایسا ہی معاملہ رہا، دسمبر کے آخری دن تھے، آپ شام میں کام شروع کرتے اور رات کے دو بجے تک برابر یہ سلسلہ جاری رہتا، اس طرح کئی راتوں تک یہ سلسلہ جاری رہا اور اس کے بعد آپ نے وہ مقالہ فائنل کیا۔ سال ۲۰۰۰ء کے دوران کا یہ جوش اور کام کے تئیں آپ کا یہ جذبہ ابھی بھی ویسے ہی جوان تھا۔ اس کا ایک تازہ نمونہ ان دنوں دیکھنے کو ملا جب ۲۰۱۹ء میں عالمی ادارہ صحت کے تحت جاری یونانی طبی اصطلاحات کی معیار بندی کے پروجیکٹ "WHO International Standard Terminologies on Unani Medicine" کے مسودہ کو آخری شکل دی جا رہی تھی اور اس میں آپ بحیثیت ایکسپرٹ شریک تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں ہونے والی اس چار دنوں تک جاری رہنے والی میٹنگ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے سے مسلسل رات آٹھ بجے تک آپ برابر شریک ہے اور لفظاً لفظاً ہر ایک اصطلاح کو دیکھنے کے علاوہ حسب ضرورت اصطلاحات کی وضاحت اور اس کے لیے مناسب الفاظ کے انتخاب میں ٹیم کی رہنمائی کرتے رہے۔ دلچسپ بات یہ کہ اس دوران میٹنگ میں موجود دوسرے جواں سال شرکاء تو اکثر مضمحل نظر آتے مگر آپ صبح سے شام تک بالکل تازہ دم رہتے۔

صاف دلی کا یہ عالم تھا کہ جب بھی کسی مجلس میں ان کے سامنے علی گڑھ کی روایتی غیبت شروع ہوتی تو عموماً وہ اس سے الگ رہتے بلکہ اکثر ایسے مواقع پر اگر ممکن ہوتا تو موضوع بدل کر اس سے بچنے کی کوشش کرتے ورنہ خاموش ہی رہتے۔ مزاجاً قدرے شرمیلے تھے اور عام محفلوں میں کبھی انھیں کھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا مگر نجی محفلوں میں اور اپنے بے تکلف احباب یا تلامذہ کے درمیان ہوتے تو لطیفوں اور مزاحیہ باتوں پر خوب ہنستے مگر دبی ہوئی آواز میں اور ایسے موقعوں پر اکثر ان کی آنکھ میں پانی آ جاتا۔ فرائض منصبی کے تئیں ان کی دیانت داری کا یہ عالم تھا کہ ایک ملاقات میں کالج سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سرسری طور پر میں نے یہ کہہ دیا کہ آپ آج کل یو جی کی کلاس خود نہ لے کر دوسرے افراد کو اپنی جگہ بھیج دیتے ہیں، یہ تو طلبہ کی حق تلفی ہے۔ میری اس بات کے جواب میں بلا مبالغہ مرحوم نے پندرہ منٹ تک اس کی صفائی دی اور بڑی وضاحت سے اس کی ایک معقول وجہ بتائی جس کے سبب انھیں ایسا کرنا پڑ رہا تھا جب کہ اس سلسلے میں سینئر اساتذہ کے معمولات سے ہم سبھی واقف ہیں۔

آج جہاں علمی سرقہ ترقی کا ایک لازمی جز بنتا جا رہا ہے اور اس طرح کے مشاہدات عام ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں کی علمی کاوش اپنے نام شائع کرالی یا فلاں نے اپنے عہدے یا اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے فلاں کا اس طرح استحصال کیا، ان حالات میں درج ذیل واقعہ استاذ مرحوم کی علمی دیانت داری، ایثار اور خورد نوازی کا عملی ثبوت ہے۔

یکم مئی ۲۰۱۶ء کو میں استاذ مرحوم سے ملاقات کے لیے ان کے گھر حاضر ہوا تو دوران گفتگو آپ ابونصر عطارا سرائیلی کی معروف کتاب منہاج الدکان کا تذکرہ

کرنے لگے۔ یہ صیدلی عملیات سے متعلق ایک شاہکار عربی تصنیف ہے جو آپ کی پسندیدہ کتابوں میں شامل تھی اور آپ کی خواہش تھی کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ ہوجائے تاکہ غیر عربی داں طلبہ واطباء کے لیے اس سے استفادہ ممکن ہوسکے۔ آپ نے مجھ سے کہا کہ اس کا اردو ترجمہ تو ہوگیا ہے مگر ابھی وہ نامکمل ہے، اس کے عربی متن میں کچھ اشکالات ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم اسے دیکھو اور اس کی حل طلب عبارتوں کے ترجمہ کا کام مکمل کردو۔ وضاحت کے لیے ٹائپ شدہ کچھ اوراق بھی دکھائے جس میں جگہ جگہ نقطے ڈال کر ایک دوسطر کی جگہ خالی تھی۔ ظاہر سی بات ہے یہ میرے لیے ایک بڑا اعزاز تھا، میں نے فوراً حامی بھرتے ہوئے اس کا مکمل مسودہ مانگا تاکہ میں کام شروع کرسکوں تو انھوں نے کہا کہ مسودہ تو اس وقت ٹائپسٹ کے پاس ہے، ٹائپنگ مکمل ہونے پر میں اس کا پرنٹ تمہیں بھیج دوں گا۔ مرحوم نے میری سہولت کے لیے منہاج الدکان کی ایک مطبوعہ کاپی بھی میرے حوالے کی کہ اسے اپنے پاس رکھو اور میں جلد ہی مسودہ کی کاپی بھیج دوں گا۔ دہلی واپس آنے کے کچھ ہی دنوں بعد عزیزم ڈاکٹر بلال احمد نے جو سی سی آر یو ایم میں ملازم ہیں اور میرے ساتھ ہی کونسل کے لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کام کرتے ہیں، مجھ سے ذکر کیا کہ انھوں نے کونسل کی ہدایت پر ۲۰۰۸ء میں منہاج الدکان کا اردو ترجمہ کیا تھا جو نامعلوم اسباب کی بنا پر اشاعت کے مرحلے تک نہیں پہنچ سکا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں اس ترجمہ پر نظر ثانی کروں تاکہ یہ ترجمہ کونسل سے شائع ہوسکے۔ ڈاکٹر بلال کا مکمل ترجمہ دیکھ کر میں الجھن میں پڑ گیا پھر میں نے مرحوم کو فون پر ساری صورتحال سے واقف کرایا۔ میری پوری بات سننے کے بعد ان کا فوری جواب یہی تھا کہ تم ڈاکٹر بلال کے ترجمہ کو دیکھو اور اسے فائنل کرو، میرا ترجمہ یوں بھی ابھی نامکمل ہے۔ نظر ثانی کے بعد الحمد للہ منہاج الدکان کا یہ اردو ترجمہ کونسل سے سال ۲۰۱۸ء میں شائع ہوگیا اور قبل اس کے کہ میں اس کا ایک نسخہ استاذ مرحوم کو پیش کرتا، انھوں نے خود ہی مجھے فون کرکے کتاب دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ترجمہ دیکھنے کے بعد استاذ مرحوم نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہماری حوصلہ افزائی بھی کی۔

یہ استاذ مرحوم کے تئیں میرے چند ذاتی تأثرات ہیں جو محض 'یوسف کے خریداروں میں' شامل ہونے کے لیے سپرد قلم کیے گئے ہیں، ان کی شخصیت کی گہرائی و گیرائی اس سے کہیں وسیع ہے۔ اس کے علاوہ ان کی علمی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے جو آج کے روایتی تصنیفات کی تعداد کے پیمانے پر شاید قابل ذکر بھی نہیں مگر ایک معلّم اور محقق کی حیثیت سے اپنے اس علمی سفر میں اپنی تحریروں کے علاوہ اپنے تلامذہ کی شکل میں جو قیمتی اثاثہ پیچھے چھوڑا ہے، طب اور ارباب طب اس کے لیے ہمیشہ ممنون رہیں گے اور آپ کی یہ خدمات آپ کے زادِ آخرت میں اضافہ کی موجب ہوں گی۔ باری تعالیٰ استاذ مرحوم کے حسنات کو قبول فرمائے اور محض اپنے فضل وکرم سے ان کی سیئات سے درگزر کا معاملہ فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

تعزیتی پیغام

پروفیسر غفران صاحب کے اچانک انتقال سے پوری طبی برادری بہت ہی صدمہ اور غم میں ہے۔ وہ ایک اچھے استاد اور عمدہ محقق تھے۔ پروفیسر غفران صاحب کے جلدی انتقال سے ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔ اللہ ان کے متعلقین اور اہل وعیال کو صبر دے اور ان کو اس غم کو برداشت کرنے کی قوت دے نیز ان کی مغفرت فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ آمین!

(ڈاکٹر سعود علی خان، پرنسپل، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

ISSN:2454-4507

پروفیسر غفران احمد

ایک استاذ کامل

پروفیسر نسرین جہاں ☆

کہتے ہیں کہ ایک اچھے استاذ کا ایک شاگرد کے کیریر میں بہت اہم رول ہوتا ہے۔ میں ان خوش قسمت شاگردوں میں سے ہوں جسے اللہ کے کرم سے ہمیشہ اچھے ہی استاد ملے۔اور میں اس رب کریم کی لاکھ لاکھ شکر گزار ہوں کہ مجھے اجمل خان طبیہ کالج سے علم الادویہ میں ماہر طب کرنے کا موقع ملا جہاں مشفق و ماہر اساتذہ کی کمی نہیں تھی۔ ہر ایک اپنی فیلڈ میں ماہر اور اپنی مثال آپ تھے۔ پروفیسر غفران احمد ایک محترم اور مشفق استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان اور سبھی طلبہ کے رول ماڈل تھے۔ ایک ایسے استاد جن کی شاگردی ہمارے لیے باعث فخر تھی آپ ایک استاد ہی نہیں بلکہ ایک رہنما تھے آپ کی رہنمائی صرف تدریس و تحقیق تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ ہر قدم، ہر موڑ اور ہر میدان میں آپ نے رہنمائی کی جہاں ہمیں ضرورت تھی۔ ایک استاد کی حیثیت سے آپ کے جو احسانات ہم سبھی شاگردوں پر ہیں اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ بی یو ایم ایس سال دوم میں جب آپ کی صیدلہ و دواسازی کے پہلے لیکچر میں شرکت کی، اسی دن سے آپ کی علمی وفنی لیاقت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ آپ صرف لیکچر ہی نہیں لیتے بلکہ آپ کی نظر ہمارے نوٹس پر بھی ہوتی کہ ہم صحیح لکھ بھی رہے ہیں یا نہیں لیکن افسوس کہ صرف چند ہی کلاس کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

ایم ڈی شعبہ علم الادویہ میں داخلے کے بعد جب پہلی بار اپنے تحقیقی موضوع کے سلسلے میں مشورہ کے لیے آپ سے رجوع کیا تو مشورے کے ساتھ ساتھ آپ کا فہمائشی انداز ابھی تک ہم بھولے نہیں ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ ہم داخلہ لینے کے کافی دنوں بعد اس سلسلے میں حاضر ہوئے تھے جیسا کہ عام طور سے ہوتا ہے اور ہمیں بھی اتنا اندازہ نہیں تھا کہ کب اور کس سے اس سلسلے میں بات کی جائے۔ بہر حال تحقیق کے سلسلے میں بخوبی رہنمائی کی اور عنوان بھی تجویز کیا۔ دوسری بار آپ کی ناراضگی کا شکار ہم اس وقت ہوئے جب ایم ڈی پریلیم میں دوسرے شعبہ کے شاگردوں نے امتیازی نمبرات حاصل کیے اور ہم ادویہ کے طلبہ تھوڑا پیچھے رہ گئے تھے۔ ایک اور مؤثر کن واقعہ جو میں عرض کرنا ضروری سمجھتی ہوں دراصل ہوا یوں کہ جب ہم لوگ ایم ڈی پریلیمنری کا امتحان دے رہے تھے ریسرچ میتھڈولوجی کے پیپر میں کوئی ایسا سوال آ گیا، جو پڑھایا نہیں گیا تھا، ہم سب لوگوں نے جواب غلط لکھا۔ غفران سر اتفاق سے انوجیلیشن ڈیوٹی پر تھے اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ آپ کی نظر ہماری کاپی پر رہتی تھی سب کے جوابات غلط دیکھ کر آپ برہم ہو گئے اور امتحان ختم ہونے کے بعد امتحان ہال ہی میں اس سوال کا صحیح جواب بلیک بورڈ پر پڑھانا شروع کر دیا۔ ان واقعات نے یہ احساس بخوبی کرا دیا تھا کہ آپ تدریس و تحقیق کے معاملے میں کتنے سنجیدہ تھے اور اپنے شاگردوں سے بھی وہی توقع رکھتے تھے۔ آپ کی اس صفت سے ہم متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور آپ کی شخصیت کی ایسی گہری چھاپ ہم پر پڑی کہ ہم نے اپنے آپ کو علمی اور تحقیقی کاموں میں اتنا غرق کر لیا کہ استاد محترم بھی ہم نااہلوں کی تعریف کرنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکے۔

مضمون نگاری میں دلچسپی استاذ محترم کی ترغیب سے ہی پیدا ہوئی۔ مجھے آج

☆ پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور، کرناٹک۔ Email:nasreennium@gmail.com، Mob.No:8088122327۔

بھی اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں ایم ڈی سال دوم میں تھی تو انھوں نے دور اندیش انداز میں سوال کیا کہ کچھ لکھنے کا کام کر رہی ہو یا نہیں ورنہ آگے چل کر خالی ہاتھ رہ جاؤ گی اور حبیب ہال کی ایک میگزین کے لیے مضمون لکھنے کی ہدایت کی اور مناسب عنوان بھی تجویز کیا۔ اتنا ہی نہیں میری تھیسس کا پیپر شائع کرانے میں آپ پیش پیش رہے۔ آپ ہمیشہ اپنے شاگردوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے آج میں تحریری و تحقیقی میدان میں کچھ بھی کرنے کی جسارت کر پائی ہوں تو اس کا بہت کچھ سہرا آپ کے ہی سر جاتا ہے۔

غفران صاحب کی ہمہ گیر شخصیت، اور ان کی صلاحیتوں کو اور بھی قریب سے جاننے کا موقع اس وقت ملا جب آپ پروفیسر کی حیثیت سے ڈیپوٹیشن پر دو سال کے لیے شعبۂ علم الادویہ، این آئی یو ایم، بنگلور تشریف لائے اور صدر شعبۂ علم الادویہ کا چارج سنبھالا۔ وہ میرے استاد تھے لیکن کبھی اس کا احساس نہیں ہونے دیا اور ہمیشہ ہمیں ایک ہم کار (Colleague) کی طرح سمجھا۔ لیکن جب تحفظ و سرپرستی کی ضرورت درپیش آتی تو ہر کسی سے آگے نکل جاتے۔ کبھی ایک مشفق و مربی والد کی طرح تو کبھی ایک محترم استاد کی طرح۔ جن کو ہر لمحہ فکر رہتی ہو، کہاں جا رہے ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ غرض یہ کہ ہر کوئی ان کی سرپرستی میں خود کو محفوظ اور خوش نصیب سمجھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک استاذ کا درجہ باپ کے برابر ہوتا ہے، استاد محترم اس کے مصداق تھے۔ ایک ایسا استاذ جس نے ہماری ہر طرح سے رہنمائی کی، ہر نشیب و فراز میں ہماری خیریت لی اور ہر مشکل کو آسان کیا، ہمت بندھائی اور حوصلہ افزائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی بھی آپ کا ذکر آتا ہے تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور آپ کے لیے بے شمار دعائیں نکلتی ہیں۔ اے اللہ استاذِ محترم کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کر اور تمام اہل خانہ کو سرخ رو کر، انھیں صبر اور سکون دے اور دین و دنیا دونوں جہاں کی دولت سے مالا مال کر۔ آمین ثم آمین!

پروفیسر غفران صاحب میں ایک خاص صفت یہ تھی کہ کسی طالب علم میں کوئی صلاحیت دیکھتے تو اس کا اعتراف کرتے، اسے سراہتے اور حوصلہ افزائی کرتے نیز اکثر علمی محفلوں میں اس کا ذکر کرتے۔ اپنے شاگردوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی کارکردگی کے بارے میں دریافت کرتے۔ اگر کسی سے کوئی غیر اخلاقی کام یا غیر معیاری بات سرزد ہو جاتی تو اصلاحی نقطۂ نگاہ سے اس کا ذکر کرتے اور اسے سمجھانے کی بات کرتے۔ استاذ محترم اعلیٰ اقدار کی حامل شخصیت ہونے کے ساتھ، عاجزی اور انکساری آپ کی ممتاز خوبی تھی۔ اگر کبھی کوئی کام سونپتے تو اس میں بھی ایک عاجزی ہوتی اور بھرپور وقت فراہم کرتے اور خواہ ایک ادنیٰ سا بھی کام کیا ہو، حالانکہ بحیثیت استاذ ان کا پورا حق تھا، بہت ہی مشکور و ممنون ہوتے۔

غفران صاحب حساس طبیعت کے حامل شخص تھے اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی دھیان رکھتے، آپ کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف نہ ہو۔ موصوف ایک زندہ دل، پر لطف اور نفاست پسند انسان تھے گفتگو میں ہمیشہ نرمی اور انکساری ہوتی اور یہی چیز سامنے والے میں بھی دیکھنا پسند کرتے تھے۔ آپ کو انسان کی پہچان خوب تھی اور اکثر بہت لطیف مزاق بھی کرتے تھے خواہ فون پر ہی کیوں نہ ہو۔ محترم کا ایک خاصہ تھا کہ آپ براہ راست کبھی کسی بات کی تنبیہ نہیں کرتے اور نہ ہی سامنے ستائش کرتے۔ اگر کبھی تنقید کی ضرورت محسوس ہوتی تو انداز ایسا ہوتا کہ سامنے والا سمجھ بھی جاتا اور دیگر موجود افراد کو بھنک بھی نہیں لگتی کہ نشانے پر کون تھا۔ یعنی اشاروں اور کنایوں میں کچھ ایسی باتیں کرتے کہ عقلمند کے لیے کافی ہوتا تھا۔ ہمیشہ آپ کا انداز ایک سکھانے والا ہوتا تھا۔ آپ جب این آئی یو ایم میں تھے تو طلبہ کی تھیسس کے تعلق سے یہی مشورہ دیتے کہ تم مت لکھنا بلکہ طالب علم کو خود لکھنے دو تا کہ وہ بھی لکھنا سیکھیں۔ اگر کبھی مصروفیت کی وجہ سے کوئی مسودہ چیک کرنے کے لیے دیا ہو اور اس میں تاخیر ہو گئی ہو تو بہت نادم ہوتے۔ آپ کی تحریری صلاحیت کمال کی تھی، جو جامعیت، سلاست، اور معنویت پر مبنی ہوتی تھی، میرے کچھ ایسے ریسرچ پیپرس ہیں جو صرف اور صرف آپ کے اندازِ تحریر کی وجہ سے شائع ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۱ر فروری ۲۰۱۹ء میں مجھے وزارت آیوش، حکومت ہند کی جانب سے ینگ سائنٹسٹ ایوارڈ سے نوازا گیا تو اس وقت آپ موریشس میں تھے اور وہیں سے فون کر کے مبارکباد پیش کی اور پہلا جملہ یہی

کہا کہ ایسا لگا کہ مجھے یہ ایوارڈ ملا ہے یہ جملہ استاذ اور شاگرد کے خوبصورت رشتہ کی مثال ہے جو کہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ استاذ کو اپنے شاگرد کی کامیابی پر کتنی خوشی ہوتی ہے اور ایک استاذ کا ایک شاگرد کے کیریئر میں کتنا بڑا رول ہوتا ہے۔

آج جب استاذِ محترم ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ہر ایک موڑ پر آپ کی کمی کھلتی ہے اور بے ساختہ زبان سے یہی جملہ ادا ہوتا ہے کہ غفران صاحب ہوتے تو ان سے معلوم کر لیتے۔ کیونکہ آپ کو فون کرنے میں ہمیں کبھی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ آپ پُر تپاک انداز میں بات کرتے اور بالکل صحیح مشورہ دیتے۔ اگر کسی خاص موضوع پر کوئی مشورہ درکار ہو تو اطمینان سے ایک دو دن بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے جس میں صرف اور صرف ہماری ہی بھلائی ملحوظ ہوتی۔ موصوف ایک ایسے استاذ تھے جنھیں اپنے شاگردوں سے کچھ علمی مدد لینے میں کبھی کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی تھی، آپ کو لوگوں کو معاف کرنا بھی خوب آتا تھا، کہتے ہیں کہ نام میں کیا رکھا ہے لیکن آپ پر اپنے نام کا پورا پورا اثر تھا۔ این آئی یو ایم سے آپ کو بہت امیدیں تھیں اور ہم لوگوں کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا مشورہ دیتے۔ تنقید ہمیشہ کھل کر کرتے اور غلط کو غلط کہنے میں کبھی جھجکتے نہیں تھے۔ اکثر ہم مستورات بھی آپ کی تنقید کا شکار ہوتی تھیں۔ ہمارے بارے میں آپ کی یہی رائے ہوتی کہ یہ لوگ کچھ بڑا کام نہیں کر سکتیں اور ہم لوگ سر کی اس تنقید کو ہمیشہ مثبت انداز میں لیتے اور یہ سوچ کر خود کو تسکین دے لیتے کہ سر کا یہ انداز ہے ہم لوگوں کو متحرک کرنے اور طبی دنیا میں کچھ کر دکھانے کے لیے ہے۔

استاد محترم اعلیٰ کردار کے پیکر تھے۔ آپ سے قربت اس لیے اور بھی زیادہ تھی کیونکہ آپ میرے شریکِ حیات پروفیسر عابد علی انصاری، صدر شعبۂ ماہیت الامراض، این آئی یو ایم، بنگلور کے ہم جماعت تھے۔ علی گڑھ کبھی بھی جانا ہو تو قبل اس کے کہ علی گڑھ میں قدم رکھیں، آپ کا فون آجاتا وقت اجازت دیتا تو لینے آجاتے اور رہائش گاہ پر بھی باقاعدہ اہتمام کے ساتھ بلاتے، اگر کسی وجہ سے گھر پر حاضر نہ ہو سکے تو ناراض ہوتے۔

این آئی یو ایم میں دو سال گزارنے کے بعد آپ کو یہاں سے کافی انسیت ہو گئی تھی، کسی بھی موقع پر آپ کو مدعو کیا جاتا تو ضرور آتے، آپ کا ایک خاصہ یہ بھی تھا کہ جب بھی وہ بنگلور تشریف لاتے تو سب کے بارے میں دریافت کرتے اور سب سے فرداً فرداً ملتے۔ لیکن اگر عشایہ کے لیے مدعو کرنا چاہو تو بمشکل راضی ہوتے یہاں تک کہ چائے بھی مشکل سے قبول کرتے۔ وجہ صاف تھی کہ وہ کسی کو زحمت نہیں دینا چاہتے تھے۔ آپ اکثر ممتحن کی حیثیت سے تشریف لاتے اور گھنٹوں مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہتیں کبھی اخلاقیات اور کبھی اسلامیات تو کبھی طب پر، سچ کہوں تو آپ کی شخصیت ایک انسائیکلوپیڈیا کی تھی، آپ کی صحبت پر یہ قول صادق آتا ہے کہ ۱۰ دن لائبریری میں کتابیں پڑھنے سے اچھا ہے ایک گھنٹہ کسی دانشور کے ساتھ وقت گزار لیا جائے۔ آپ کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا اور علم پر دسترس تھی اس لیے جب بھی کسی موضوع پر بولنا شروع کرتے تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتے، سننے والے محظوظ بھی ہوتے اور رشک بھی کرتے۔ این آئی یو ایم سے رخصتی کے موقع پر الوداعی تقریب میں طلبہ و اساتذہ اور انسٹی ٹیوٹ کے تعلق سے اپنے تجربات و جذبات سے معمور احساسات کا اظہار جس سلاست و روانگی کے ساتھ کیا تھا آج بھی ہم سب کے دل و دماغ میں نقش ہے۔ ہم شاگردوں کو اپنے استاذ پر ناز تھا اور ہمیشہ ایک تحفظ اور ایک طاقت کا احساس رہتا تھا جو بہت جلد ہم سے چھن گیا۔ ہمیں آپ سے بہت کچھ سننا اور سیکھنا باقی تھا لیکن افسوس کہ ایسا ہو نہ سکا۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمارے استاذ کو ہم سے جو امیدیں تھیں ہم اس پر کھرے اتریں۔ آج غفران صاحب تو نہیں ہیں لیکن انھوں نے جو راہ ہمیں دکھائی ہے اس پر چل کر ہمیں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

تو تو نہیں ہے اے میرے راہبر
تیری بتائی ہوئی رہ گزر تو ہے

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

پروفیسر عبدالحسیب انصاری☆

تاریخ کی ورق گردانی ہمیں نہ صرف ماضی سے جوڑتی ہے بلکہ ان تمام رموز و اسرار سے پردہ اٹھاتی ہے جن کے توسط سے ہم ادوارِ عالم میں ہونے والی تبدیلیوں اور اس زمانے کی نابغۂ روزگار شخصیات کے کارناموں سے روشناس ہوتے ہیں۔ اس طرح سے ہمیں یہ علم حاصل ہوجاتا ہے کہ جہاں عظیم شخصیات ایک زمانہ تک اس ارض فانی میں مشیت ایزدی سے مروجہ وغیر مروجہ علوم وفنون پر مبنی اَنمٹ نقوش چھوڑتی ہیں وہیں بہت سی ایسی نادرِ زمانہ اور نابغۂ روزگار شخصیات بھی ہوتی ہیں جو عالم جوانی میں ہی وہ سب کر جاتی ہیں جسے لوگ بڑھاپے میں کر پاتے ہیں یا ایک عمر ڈھلنے کے بعد ہی ان سے اس طرح کے کام کے کیے جانے کی توقع کی جاتی ہے۔ دنیائے فانی کے بے شمار علوم وفنون میں سے اگر ہم محض علم طب کی بات کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کے اولین ماہرین میں بہت سے ایسے اشخاص ہوئے ہیں جنھوں نے جو کچھ بھی علمی وفنی ورثہ چھوڑا وہ ہمارے لیے نہ صرف سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ وہ آج بھی لائق تقلید ہے، حالانکہ ان کی عمریں طویل تو نہ تھیں البتہ علم وفن کے بیشتر گوشوں سے معمور ضرور تھیں۔ ان میں سے اگر ہم چند ایک کا ذکر کریں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے طبی امام تھے۔ خواہ وہ سو مقالوں والی کنّاش؛ کتاب المائۃ فی الطب معروف بہ مائۃ مسیحی کا مصنف ابوسہل عیسیٰ بن یحییٰ بن ابراہیم مسیحی ہو کہ جس نے محض ۴۰ رسال کی مختصر سی عمر پائی لیکن اس کے باوصف وہ علم طب، منطق وعلوم اوائل کا فاضل تھا اور امامت کا درجہ رکھتا تھا، یا اپنی ضوفشانی سے طب ودیگر علوم وفنونِ عالَم کے ماہرین کی آنکھوں کو خیرہ کرنے والا عظیم المرتبت طبیب، مصنف، زبان داں، منطق وفلسفہ، الٰہیات، طبیعیات، ریاضیات، فلکیات، دینیات اور دیگر علوم مروجہ کا ماہر الشیخ الرئیس ابوعلی الحسین بن عبداللہ ابن سینا ہو کہ جو اپنی کم عمری کے باوجود آنے والی نسلوں کے لیے مندرجہ بالا تمام علوم میں عدیم المثال خطوط چھوڑ کر اس دنیائے فانی سے محض ۵۷ر سال کی عمر میں دنیائے جاودانی کی طرف رخصت ہوگیا۔ صرف مسیحی یا ابن سینا ہی نہیں بلکہ بیشمار ایسے اساطین فن اور اس دنیا میں اپنی شناخت رکھنے والی اہم شخصیات اپنے حصے کا کام بعجلت تمام مکمل کر کے کم عمری میں ہی داغ مفارقت دے گئیں۔ ساتھ ہی وہ اپنی استطاعت سے زیادہ مؤخرین کے لیے اتنا کچھ دے گئے کہ ان کے ایک ایک جملے ریسرچ وتحقیق کی علامت بن گئے۔

کبھی کبھی انسان قبل از وقت یا یہ کہیں کہ بروقت وہ تمام اپنے عظیم علمی وفنی کارہائے نمایاں کر چکا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیاوی مشکلات سے مزید نبرد آزما نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے اسے حیات جاودانی کی طرف بلا لیتا ہے اور وہ شخص فانی دنیا سے وداع اس حال میں لیتا ہے کہ دنیاوی جگمگاہٹ سے پوری طرح کنارہ کش ہوجاتا ہے، اپنے رشتہ داروں، اعزہ واقرباء کو روتا بلکتا چھوڑ کر داغ مفارقت دے جاتا ہے اور جب کبھی اس کا نام نامی اسم گرامی آتا ہے تو اس کا ذکر خیر کے ساتھ ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ ہمارے درمیان موجود ہے اور ابھی اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ آدھمکے گا۔ ایسا ہی کچھ حال استاذ محترم پروفیسر غفران احمد کا بھی تھا۔

علم وآگہی، ذہانت وفطانت اور یادداشت کی پختگی واستحضار یہ تمام چیزیں ترک معاصی اور پاک بازی وراست گوئی کی وجہ سے ملا کرتی ہیں جب کہ ان کے برعکس کا صدور معاصی پر اصرار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں امام شافعیؒ (ابوعبداللہ محمد بن ادریس) کے یہ اشعار جو انھوں نے اپنے استاذ امام وقت، محدث وفقیہ ابوعبدالرحمٰن وکیع بن جراح الرواسی سے شکایت کے انداز میں کہے تھے بہت عمدگی کے ساتھ ان خصوصیات، خصلت وعادات کا اظہار کرتے ہیں:۔

☆ پروفیسر، شعبۂ تحفظی وسماجی طب، مدیر، ترجمان طب، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور، کرناٹک۔ Email:ahansari001@gmail.com، Mob.No:9448258140۔

شکوتُ الیٰ وکیع سوءَ حفظی
فاوصانی الی ترکِ المعاصی
فان العلمَ نور من اللہ
و نورُ اللہ لایعطیٰ لعاصی

ترجمہ:''میں نے وکیع سے اپنی یادداشت کی کمزوری کی شکایت کی تو انھوں نے مجھے ترک معاصی کی وصیت کی، اور یہ فرمایا کہ علم اللہ تعالیٰ کا نور ہے اور نورِ خدا کسی گنہگار کو نہیں دیا جاتا۔''

استاذ محترم ان تمام صفات حمیدہ سے بطور خاص متصف تھے۔ انھیں بھی قدرت نے ذہین دماغ کے ساتھ ساتھ بہترین قوت حافظہ، نرم دل، دست معطی اور خیر و بھلائی سے متصف کر رکھا تھا۔ علم و آگہی سے ان کا سینہ بھرا ہوا تھا، ان کی ان خصوصیات پر یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے کہ:۔

واترك من الأثر الجميل علامة
تبقى بها ذكرا يتيه مفاخرا

ترجمہ:''اور اپنے بعد کوئی ایسی خوبصورت نشانی چھوڑ دو کہ جس کی وجہ سے تمھارا ذکر باقی رہے اور تم ایک قابل فخر یادگار بن جاؤ۔''

وہ بے حد صاف گو اور سادہ لوح انسان تھے، ابن الوقت کی مکاریوں سے اپنے وجود کو پاک کر رکھا تھا، اسی لیے ان کی زندگی میں اور بعد از مرگ بھی لوگ ان کا نام اچھائی کے ساتھ ہی لیا کرتے ہیں:۔

واعلم بأن الدهر يصفو للذى
عاش النقاء ولم يكن متآمرا

ترجمہ:''اور یہ جان لو کہ جس نے صاف ستھری زندگی گزاری اور سازش کرنے والا نہیں تھا اس کے لیے زمانہ بھی صاف ستھرا ہی ہے۔''

برسوں کی محنت اور لگن سے زیب قرطاس کی گئی استاذ محترم کی کتاب ''اصول دواسازی'' (غیر مطبوعہ) نہ صرف اپنے عنوان کی بھرپور وضاحت اور تفسیر کرتی ہے بلکہ انھیں اپنے عہد کے محققین و ریسرچرس میں ممتاز کرتی ہے:۔

فالعمر يمضى حلوه و مراره
سَطِّر به - قبل الرحيل - مَآثرا

ترجمہ:''زندگی تو تلخ و شیریں گزر ہی جاتی ہے لیکن اس زندگی کے ختم ہونے سے قبل ایسے کام کر جاؤ جو یادگار بن جائے۔''

استاذ محترم اس درجہ اور رتبہ تک پہنچ چکے تھے کہ انھیں استاذ الاساتذہ کہا جائے حالانکہ وہ اس خصلت کے انسان تھے کہ اس طرح کے القاب و آداب کو کبھی بھی قبول نہ کرتے کیونکہ ان کے استاذ اور استاذ الاساتذہ پروفیسر ظل الرحمٰن، پروفیسر کنور محمد یوسف امین اور پروفیسر نعیم احمد خان وغیرہم کی موجودگی میں وہ کبھی گوارہ نہ کرتے کہ انھیں کوئی اس طرح کے لقب سے مخاطب کرے جب کہ وہ اس کے بجا طور پر حقدار تھے۔

استاذ محترم سے میری ملاقات یا یوں کہیں کہ کسی حد تک شناسائی اس زمانے میں ہوئی جب میں پری طب (۱۹۸۹ء-۱۹۹۰ء) میں تھا، میرے دوست اور ہم درس ڈاکٹر قمر الدین (فی الحال ممبئی میں پریکٹس کر رہے ہیں) کے ماموں جناب اطہر کمال صاحب (اپنے بھائی ڈاکٹر ازہر کمال، [بی یو ایم ایس طالب علم] کے ساتھ) سلیمان ہال میں قیام پذیر تھے اور اسلامک اسٹڈیز میں شاید M.Phil یا Ph.D کے طالب علم تھے، وہاں ہم دو تین دوست (جن میں تیسرے ڈاکٹر محمد افضل تھے) اکثر جایا کرتے تھے، وہاں پتہ چلا کہ استاذ محترم، ڈاکٹر اطہر کمال (ماموں) کے نہ صرف دوست بلکہ جامعۃ الفلاح کے ہم سبق بھی ہیں یعنی فلاحی تعلق بھی ہے، ان کی ایک اہم عادت کا پتہ چلا کہ وہ وہاں جب کبھی آتے ہیں تو ان کی کوشش رہتی ہے کہ وہ اپنی گفتگو میں انگریزی زبان کا ہی استعمال کریں شاید اس کے پیچھے یہ وجہ رہی ہوگی کہ انگریزی میں مزید بہتری آجائے کیونکہ وہ جامعۃ الفلاح کے فارغ التحصیل تھے تو اردو اور عربی میں تو انھیں ضرور درک رہا ہوگا البتہ یومیہ کی گفتگو میں انگریزی کے استعمال سے وہ انگریزی میں بھی بھرپور درک حاصل کر لیں گے۔ بہر حال یہ بہترین فکر تھی اور اس کے تعلق سے کوشش بھی اعلیٰ قسم کی کی جا رہی تھی، اللہ نے اس کا یہ صلہ دیا کہ استاذ محترم کو جہاں طبی علوم پر بھرپور عبور حاصل تھا وہیں اردو اور عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی بطور خاص درک حاصل ہو گیا تھا اور وہ بقدر الکد تکتسب المعالی کے ہو بہو مصداق بن گئے تھے۔ اس مختصر سی معلومات سے زیادہ، ان سے ہماری کوئی رسم و راہ نہیں تھی۔

وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے گھومتا رہا یہاں تک کہ ہم تمام نے بی یو ایم ایس (۱۹۹۶ء) بھی کر لیا تب تک اس شناسائی میں شاید کچھ مزید اضافہ نہیں ہوا، پھر اللہ

کا کرم کہ ۱۹۹۷ء میں میرا داخلہ ایم ڈی-حفظان صحت (جس کا اسی سال قومی سطح پر سب سے پہلے اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں آغاز ہوا تھا) میں ہوگیا۔ حالانکہ اسی سال جامعہ ہمدرد میں بھی ایم ڈی (علم الادویہ) میں داخلہ کا مستحق بلکہ اول درجہ سے مستحق قرار پایا تھا، لیکن مادرِ درسگاہ اور ایسی عظیم الشان یونیورسٹی کو چھوڑ کر کہیں اور جانا دل نے گوارا نہ کیا لہٰذا ایم ڈی میں داخلہ لے لیا اس طرح میرا تعلیمی سلسلہ آگے بڑھا، پھر پتہ چلا کہ حفظان صحت میں کسی طرح کا کوئی وظیفہ (Stipend) نہیں ہے، بڑی مایوسی ہوئی، پھر جدوجہد شروع ہوئی نہ چاہتے ہوئے بھی اکثر اوقات ہم تین ہم سبق ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن، ڈاکٹر محمد اکرم اور راقم وظیفہ میں اضافہ اور اسے دوسرے شعبہ جات کے مماثل کرانے کی غرض سے رجسٹرار آفس کا چکر کاٹنے لگے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۰۰/روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر ہوگیا (جو بے حد کم تھا)، مزید کوشش کی گئی پھر رقم ۲۵۰۰/روپے ماہانہ تک پہنچ گئی، کوشش پھر بھی جاری رہی لیکن مزید اضافہ نہ ہوسکا، کیوں کہ راقم تقدیر کا یہی فیصلہ تھا جب کہ اس تعلق سے وزارت صحت، حکومت ہند، دہلی، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، دہلی، ہائی کورٹ، الٰہ آباد، بنارس ہندو یونیورسٹی (BHU)، بنارس وغیرہ کے بارہا چکر لگائے گئے لیکن بے سود، شاید قدرت نے اس کمی وظیفہ کے عوض ہمارے لیے آئندہ کی زندگیاں قدرے سہل کر رکھی تھیں یعنی ہماری نوکریاں مختص کر رکھی تھیں جو ہمیں فراغت کے بعد بہت جلد حاصل ہوگئیں۔ فالشکر لله

ایم ڈی کے ابتدائی ایام میں ہی میں ڈیوٹی سوسائٹی سے کمپیوٹر کی ٹریننگ حاصل کرنے لگا جس کی وجہ سے مجھے کمپیوٹر کی وہ شُد بُد ہوگئی تھی جو دیگر کلاس فیلوز کو شاید نہیں تھی۔ جس کا پتہ استاذ محترم کو چل گیا تھا، شاید ڈاکٹر انعام الدین صاحب کی معرفت انھیں یہ معلوم ہوا ہوگا (ڈاکٹر انعام الدین صاحب، پی ایچ ڈی باٹنی، ہماری کلاس کو ایم ڈی پریلیم میں Pharmacognosy پڑھایا کرتے تھے اور فورٹ سٹی میں ہم دونوں کچھ حصہ ارض پر زمینی پڑوسی تھے جس کی وجہ سے دوسروں کی بہ نسبت مجھے ان سے زیادہ قربت حاصل تھی)۔ ہوا یوں کہ علم الادویہ میں ایک پروجیکٹ چل رہا تھا جس سے استاذ محترم پروفیسر غفران احمد صاحب بھی وابستہ تھے لہٰذا انھوں نے کمپیوٹر سے متعلق مجھے کچھ کام سونپا جسے میں نے بحسن وخوبی انجام دیا جس سے وہ کافی خوش ہوئے اور میری تعریف بھی کی۔ بس یہیں سے جان پہچان کا سلسلہ آگے بڑھا اور بات شناسائی سے واقفیت تک پہنچ گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ استاذ محترم نے پریلیم میں ہماری کلاس کو Bio-assay کی کچھ کلاسز پڑھائی تھیں۔ ہماری اس واقفیت اور رسم وراہ میں میرے ہم درس ڈاکٹر محمد افضل (جو کہ میرے بہت ہی قریبی اور عزیز دوست ہیں) کے ذریعہ مزید اضافہ ہوگیا۔ اس وقت جب کہ استاذ محترم احمد نگر، علی گڑھ میں کرایہ کے مکان کے ایک حصہ (فلیٹ) میں سکونت پذیر تھے تو اتفاق سے ہمارے بیک روم پارٹنر ڈاکٹر مشتاق احمد باربورا (آسامی) بھی اسی مکان کے دوسرے حصہ (فلیٹ) میں بطور کرایہ داران کے پڑوسی تھے۔ میں اپنے سینئر روم پارٹنر سے ملاقات کی غرض سے کبھی کبھار جایا کرتا تھا تو ان سے بھی علیک سلیک ہوجاتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایم ڈی سے فراغت کے فوراً بعد حیدرآباد (اپریل ۲۰۰۱ء) میں یونانی طب پر ایک دوروزہ نیشنل سیمینار کے سلسلے میں جانا ہوا جسے آل انڈیا طبی کانفرنس، شاخ حیدرآباد نے آرگنائز کیا تھا۔ اس قومی سیمینار میں پیش کرنے کے لیے جب میں اپنا مقالہ سر کو چیک کروانے ان کے کرایہ خانہ پر حاضر ہوا تو انھوں نے مقالہ کا عنوان دیکھا پھر اختصاریہ (ایبسٹرکٹ) میں کچھ تبدیلی کروائی اور اسے بہترین انداز میں لکھوایا، مقالہ کا عنوان تھا ''حمل اور غذا: ماہرین غذا اور اطباء کے حوالے سے''۔ پھر مقالہ تحریر کرنے اور پریزنٹیشن کے لائق بنانے کے لیے اہم نکات کی طرف توجہ دلائی، اس طرح ایک بہترین مقالہ تیار ہوگیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ہم تین چار لوگ ایک ساتھ ہی اس سیمینار میں شرکت کی غرض سے بذریعہ ریل گاڑی روانہ ہوئے جس میں استاذ محترم کی معیت بھی نصیب ہوئی تو دوران سفر سر نے کہا کہ اَجی کھانے پینے کا انتظام تمھارے ذمہ ہے، میں نے اسے بشرح صدر قبول کرلیا اور بفضلہٖ تعالیٰ خوب کھاتے پیتے حیدرآباد کا سفر بحسن وخوبی مکمل ہوا بعد میں سَر نے اپنے حصے سے زیادہ ہی عنایت فرمایا۔

اسی طرح مذکورہ سیمینار کے فوراً بعد ہی شعبۂ آئی ایس ایم، وزارت صحت و خاندانی بہبود، حکومت ہند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے مشترکہ تعاون سے شعبۂ کلیات، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں ایک سہ روزہ انٹرنیشنل کانفرنس، ۲۹-۳۱/مئی ۲۰۰۱ء، کے دوران Good Health in New Millennium through Unani System of Medicine پر منعقد

ہونے جارہی تھی جس کے روح رواں پروفیسر انیس احمد انصاری صاحب تھے،تب ایک بار پھر میں سَر کے اسی در پر حاضر ہوا اور مدعا عرض کیا، اور سر کو کانفرنس کے لیے مجوزہ عنوان پر رہنمائی حاصل کرنے کے لیے دکھایا لہٰذا سر نے اس عنوان میں کچھ ترمیم کے بعد ایک بہترین عنوان "Dalk-i-Wajh (Face Massage) - A Rational Approach towards its Technique" کا انتخاب کیا اور ساتھ ہی اختصاریہ (ایبسٹرکٹ) میں کافی کچھ ترمیم واضافہ کرنے کے بعد اسے کانفرنس کمیٹی کو ارسال کرنے کے لیے ارشاد فرمایا اور پھر میرا یہ مقالہ شفوی پیشکش کے لیے منتخب کرلیا گیا، بعدہٗ مقالہ کو مکمل کرنے تک سر سے میں رابطہ میں رہا اور پھر یہ مقالہ بھی مکمل ہوگیا۔اس طرح سَر سے وقتاً فوقتاً علمی وفنی رہنمائی ملتی رہی۔

اس کے بعد کافی عرصہ تک ان سے روابط خال خال ہی رہے،البتہ کبھی کبھی فون سے رابطہ ہوجاتا تھا، پھر جب میرا سلیکشن نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں ہوگیا تو رابطہ کم سے کمتر ہوتا گیا اور بس علیک سلیک ہی تک بات رہ گئی۔لیکن جب استاذ محترم پروفیسر کی حیثیت سے ۲۰۰۷ء میں اس عظیم الشان قومی ادارہ یعنی نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور کی زینت بنے تو ان سے دوبارہ رسم وراہ ہوئی،اس رسم وراہ میں ان کے عارضی مسکن کا اہم رول تھا چونکہ انھوں نے میرے کرایہ کے فلیٹ کے نیچے ہی اسی بلڈنگ کے دوسرے فلیٹ میں رہائش اختیار کی تھی اور ان کے ہمراہ پروفیسر عبدالودود صاحب (موجودہ ڈائریکٹر،قومی ادارہ برائے یونانی طب، بنگلور) بھی رہائش پذیر تھے،لہٰذا اکثر آنا جانا رہا، اور بارہا میں نے ان کے کمرے میں انگریزی کا بہت ہی موقر اخبار "The Hindu" دیکھا جو اکثر ان کے قلم کی سیاہی کی تاب نہ لاتے ہوئے زبان حال سے یہ شکایت کرتا تھا کہ زبان کے ساتھ ساتھ دنیا سے باخبر رہنے کے لیے میری اچھی طرح مرمت کی گئی ہے۔میرے خیال میں شاید، بلکہ اس وجہ سے بھی نہ صرف انگریزی زبان بلکہ بہترین انگریزی زبان پر ان کو عبور حاصل تھا اور موجودہ عالمی، قومی اور مقامی تمام خبروں سے اچھی واقفیت بھی رہتی تھی۔ اس دوران جب کہ وہ اسی بلڈنگ میں سکونت پذیر تھے گاہے بہ گاہے دعوتوں کے بہانے بھی ملنے کی سبیل پیدا ہوجاتی تھی۔ میں مع اہل وعیال جب کہ سَر بے بال و پَر رہا کرتے تھے۔

اجمل خان طبیہ کالج میں سَر سے ملاقات اور علمی رابطہ کے بطور میرے ایک عزیز پروفیسر فقیر محمد صاحب آیا کرتے تھے۔وہ کیمسٹری میں Ph.D تھے۔ان کے تعاوُن سے سَر یونانی دواؤں کا Chemical Structure بنایا کرتے تھے اور شاید یونانی طب سے متعلق یہ واحد شخص تھے جو اس فن سے واقف تھے۔

استاذ محترم صلہ رحمی کو اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے، وہ خیر خواہی اور جود وسخا سے عبارت تھے۔ ایک بار باتوں باتوں میں مجھ سے کہنے لگے اَجی عبدالحسیب ہم لوگوں کے حالات کا تو تمھیں پتہ ہی ہوگا کہ کس طرح کے ماحول سے ہمارا تعلق ہے، کئی بار اپنے رشتہ داروں، اعزہ واقرباء کو اگر کچھ بطور قرض دے دیا جائے تو پھر وہ کب ملے، ملے بھی یا نہیں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔استاذ محترم گویا 'نیکی کر دریا میں ڈال' کو اپنا وطیرہ بنا چکے تھے۔اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ استاذ محترم نہ صرف یہ کہ مخیّر تھے بلکہ اپنے خوردوں کو اس طرح کے اعمال خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی ترغیب کے طور پر کبھی کبھی خود کردہ نیک اعمال کا ذکر کردیا کرتے تھے جس کا فیض مجھ ناچیز کو بے حد پہنچا۔

دینی مسائل میں ان کا رویہ اعتدال کا تھا،ایک بار کا ذکر ہے کہ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ عصر کا کیا وقت ہے؟ میں نے موبائل میں دیکھ کر عصر حنفی کے لحاظ سے انھیں وقت بتادیا، مسکرا کر کہنے لگے اَجی اپنا وقت (عصر اول) بتاؤ، پھر میں بھی مسکرا دیا اور انھیں عصر اول کا وقت بتادیا۔

سَر کئی بار شعبۂ تحفظی وسماجی طب بذات خود آتے اور کمپیوٹر سے متعلق یا کمپیوٹر کے ذریعہ کچھ تعاون درکار ہوتا تو مجھے کہتے اور مجھے جو کچھ بھی شُد بُد تھی اس لحاظ سے کرنے کی کوشش کیا کرتا اور ان کاموں کے لیے جو کہ بہت معمولی ہوا کرتے تھے ہمیشہ میری تعریف کیا کرتے تھے جس سے مجھے اکثر شرمندگی ہوجایا کرتی تھی۔

ریسرچ وتحقیق کے کاموں میں ان کی دلچسپی ایسی تھی کہ وہ اپنا تو کام کرتے ہی تھے، دوسروں کا کام بھی اسی دلجمعی سے کرتے تھے جیسے اپنا کام ہو۔ مجھے یاد ہے کہ ادارہ ہٰذا میں ان کی جوائننگ کے بعد استاذ محترم پروفیسر محمد ذوالکفل (اس وقت کے صدر شعبۂ تحفظی وسماجی طب) کی سرپرستی میں میں ایک ایکسٹرا میورل پروجیکٹ

موسوم بہ "Study of Normolipidemic Effects of Three Unani Drugs Formulation" تیار کر رہا تھا تو اس کی تیاری میں ایک تو انھوں نے اپنا بنایا ہوا ایک ایکسٹرا میورل پروجیکٹ ہمیں سونپ دیا نیز اس کی تمام تر تیاری کے دوران جن کوائف کی بھی ضرورت تھی ان سب کی تکمیل میں اس طرح لگے رہے جیسے ان کا اپنا ہی پروجیکٹ ہو۔ حالانکہ یہ پروجیکٹ منظور نہیں ہو سکا اس کے پیچھے کیا وجوہات تھیں؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ جب کہ اس کے سارے پریزنٹیشن بھی ہو چکے تھے۔

ان کی شفقت اور خورد نوازی میں ہمیشہ میں نے تسلسل پایا۔ ۲۰۰۳ء ۱۲/اکتوبر کو اپنی شادی پر میں نے انھیں مدعو کیا، وہ تقریب میں شامل نہ ہو سکے البتہ انھوں نے مجھے ''ٹیلی گرام'' کے ذریعہ شادی کی مبارکباد دی وہ ''ٹیلی گرام'' آج بھی میرے پاس محفوظ ہے، جس کا عکس بطور یادگار میں اس مضمون میں شامل کر رہا ہوں۔ یہ محبت اور شفقت خورد کی کتنی خوبصورت مثال ہے!

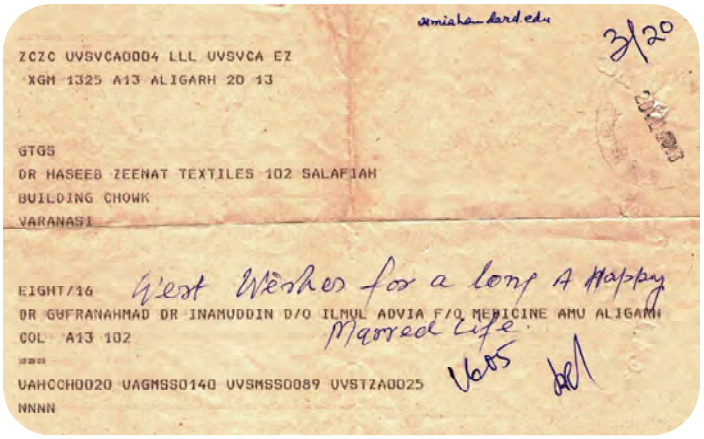

مجھے اس بات کا بے حد شدت کے ساتھ دکھ اور قلق ہے ساتھ ہی افسوس بھی ہے کہ اتنی قربت کے باوجود جو کچھ ان سے حاصل کر سکتا تھا اور جو کچھ سیکھ سکتا تھا شاید نہ حاصل کر سکا اور نہ ہی سیکھ پایا، یہ میری بدنصیبی تھی، شاید یہ ان کی شخصی وجاہت اور علمی جاہ وحشمت کا رعب تھا جس کے سبب میں ان سے گریزاں رہنے میں عافیت محسوس کرتا تھا جب کہ میرے لیے یہ قدم باعث نقصان ہی رہا ہے۔ اور میری مثال اس شعر جیسی ہوگئی کہ:

حال دل ہم بھی سناتے لیکن
جب وہ رخصت ہوا تب یاد آیا

علی گڑھ جب بھی جانا ہوا میں ان سے ملنے گیا اور بفضلہٖ تعالیٰ ہر بار ان کی مسکراہٹوں اور پُرنور آنکھوں کے ساتھ ان سے کچھ دیر کی ملاقات کا شرف ضرور حاصل ہوا۔ حالانکہ دس بارہ سالوں میں علی گڑھ میرا جانا شاید تین چار بار ہی ہوا۔ لیکن کبھی بھی ان کی عنایتوں سے محروم نہیں رہا اور نہ ہی ان کی فیاضی سے کبھی خالی ہاتھ لوٹا، یہ میری خوش نصیبی تھی۔

۲۰۱۷ء میں جب مادر درسگاہ اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں پروفیسر ان تحفظی وسماجی طب کی پوسٹ ایڈورٹائز ہوئی تو میں نے ان سے اس تعلق سے بات کی تو کہنے لگے کہ اَجی فارم بھروان شاءاللہ تمھارے حق میں بہتر ہوگا۔ جب تقریباً دو سال بعد انٹرویو لیٹر آیا اور سلیکشن کمیٹی کے سامنے پیشی کے لیے ۱۹/جولائی ۲۰۱۹ء بروز جمعہ کو علی گڑھ جانا ہوا اور انٹرویو دینے کے بعد جب انھیں پتہ چلا کہ میرا سلیکشن نہیں ہوا ہے تو انھیں کافی دکھ پہنچا، وہ میرے لیے علی گڑھ کی پروفیسر شپ کے ازحد خواہاں تھے۔ میں اگلے دن؛ ۲۰/جولائی ۲۰۱۹ء بروز شنبہ ان کے چیمبر میں بطور خاص ان سے ملاقات کی غرض سے پہنچا تو کبیدگی ان کے چہرے پر نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔ احوال وخیریت کے بعد پُرتکلف ناشتہ کرایا اور جب تقریباً ایک گھنٹہ گزار کر میں نے ان سے اجازت چاہی تو علینہ (میری بڑی بیٹی) کے لیے بطور خاص وکاس کی دو کلو بہترین قسم کی مٹھائی عنایت کی اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ ایسے تھے ہمارے استاذ!

ان سے کسی قسم کے مشورے میں رہنمائی کے ساتھ ساتھ خیر کا پہلو ہمیشہ ہی موجود رہتا تھا۔ میری بڑی بیٹی علینہ انصاری سے انھیں بڑی امیدیں تھیں کہ وہ کچھ کر لے گی، لہٰذا جب میرا ارادہ ہوا کہ اس کو نویں کلاس کا ٹسٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دلاؤں تو انھوں نے بڑے تجزیاتی انداز میں کہا کہ بنگلور کی اسکولنگ اچھی ہے اور ہائی اسکول تک کم از کم وہاں ضرور پڑھاؤ البتہ گیارھویں میں انٹرنل کا فائدہ حاصل کرنے کے لیے اسے اے ایم یو میں داخلہ دلا دو۔ مجھے ان کی بات بڑی معقول لگی اور میں نے پھر گیارھویں میں ٹسٹ دلایا بفضلہٖ تعالیٰ اس کا داخلہ اے ایم یو گرلس اسکول میں ہوگیا، جب انھیں خبر ہوئی تو کافی خوش ہوئے، لیکن کووڈ-۱۹ کی وجہ سے علینہ کی آن لائن کلاسز چل رہی تھیں، مکمل لاک ڈاؤن تھا اور اس طرح ان دو سالوں میں میرا علی گڑھ جانا نہیں ہو پایا جس کی وجہ سے سَر کے

ساتھ میں یہ خوشی بالمشافہ نہیں بانٹ سکا۔

۱۱؍فروری ۲۰۲۰ء میں جب مجھے مرکزی کونسل برائے تحقیقات طب یونانی، وزارت آیوش، حکومت ہند کی طرف سے یونانی طب میں لٹریری تحقیق کے زمرے میں بیسٹ ٹیچر کے انعام سے سرفراز کیا گیا تو میں نے استاذ محترم کو یہ خوشخبری اپنی خوشی سے بھیگی پلکوں کے ساتھ دی تو بے حد مسرور ہوئے البتہ مختصر گفتگو کی اور پھر اگلے ہی روز بہت ہی پُر ستائش اور توصیفی قسم کا خط ای میل کے ذریعہ بھیجا جس میں نہ صرف مجھے اپنی محبتوں میں شامل کیا اور سراہا بلکہ انگریزی زبان میں جس انداز کا خط ارسال کیا وہ میرے لیے اُس انعام سے بڑھ کر ہے جو ایک اہم وزیر کابینہ کے ہاتھوں مجھے تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ وگیان بھون، دہلی میں عین یوم یونانی طب کو عنایت کیا گیا، اس خط کا متن ذیل میں من وعن پیش ہے:

My Dear Dr. Abdul Haseeb

I am delighted to know that the Best Teacher award has been bestowed upon you by the Ministry of AYUSH for the year 2020. It is great news but not a surprising one for me because I know you and your phenomenal talent very well and believe that winning such an award is something that aligns well with you. Still, I am thrilled to learn that it was given to the most suitable person in the category. The hard work with 'utmost dedication' that you have put in during the last many years and the academic outcomes that have been brought out during this period are the testimony to your scholarly acumen and the quest for knowledge. Your contribution to the existing stock of knowledge of Unani Medicine has been significant and inspiring for the students and scholars.

For a true scholar like you awards are the means of momentary joy only because you will enjoy much with your work and recognition that you will receive from academia and peers. I hope your voyage of academic pursuit will continue and you will come up with many masterpieces in the coming years.

I am feeling pleasure to extend my heartfelt congratulation to you and your family on this occasion and wishing you all the best for future endeavors.

Regards

Ghufran Ahmad

یہ خط میرے لیے نہ صرف باعث مسرت ہے بلکہ جہد مسلسل کا پیام بھی ہے۔

اپریل ۲۰۲۱ء ہندستانیوں کے لیے قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھا۔ ماہ اپریل کا دوسرا نصف اور ماہ مئی کا پہلا نصف یعنی ماہ رمضان المبارک کا پہلا نصف بلکہ پورا ماہ رمضان ہی اس تعلق سے بہت ڈراونا اور خوفناک رہا کہ جب بھارت میں کووڈ-۱۹ کا قہر ٹوٹ پڑا، کیا امیر، کیا غریب، کیا تعلیم کے میدان کے سرخیل، کیا اَن پڑھ اور ناخواندہ، کیا ڈاکٹر، کیا انجینیر، غرضیکہ اس دنیائے آب وگل کا ہر ذی نفس یہ جان چکا تھا کہ اگلے پل کی کچھ خیر نہیں۔ نفسانفسی کا عالم تھا، کسی کے بیمار ہونے کی خبر ابھی کچھ دور تک ہی پہنچ پاتی تھی کہ اس کی موت کے نقارہ کی بازگشت محسوس ہونے لگتی تھی، صبح کسی آشنا کے خاک میں ملنے کی خبر آتی تو دوپہر میں کسی دوست کی موت کی خبر سے جسم میں لرزہ طاری ہوجاتا تھا، تب تک شام ہوجاتی اور رات کی تاریکی میں اپنے کسی عزیز کی المناک موت کی غمناک خبر ملتی، روز وشب

بس یہی ماحول تھا۔ بس جو بچ گیا اس کی زندگی باقی تھی ورنہ سبھی اس بھیانک وائرس کی گرفت میں آچکے تھے۔ العیاذ و الامان

اپریل ۲۰۲۱ء کے ابتدائی ایام میں میں مع اہل وعیال اپنے آبائی وطن؛ بنی پور، بنارس گیا ہوا تھا، والدین، بھائی بہن سب سے مل ملا کر چند روز بعد اکیلے ہی ڈیوٹی پر واپس لوٹ آیا کہ بچوں کا اسکول بند تھا، آن لائن کلاسز چل رہی تھیں۔ حالانکہ طبیعت میری بھی بہتر نہیں تھی، جسم میں حرارت کی وجہ سے کرب و بے چینی تھی، دافع حمیٰ دواؤں کا حسب ضرورت استعمال جاری تھا اور اسی کے بھروسے اللہ اللہ کر کے واپس بنگلور آ گیا، بنگلور آنے کے بعد بھی درجۂ حرارت میں تسلسل کے ساتھ اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ لہٰذا ادارہ ہٰذا کے اسپتال سے کچھ یونانی ادویہ جن میں حب بخار اور جوشاندہ حمیٰ، نقوع نزلہ اور عرق عجیب وغیرہ تھا لے کر اپنے فلیٹ پر واپس ہوا ساتھ میں Tab.Dolo 650mg جیسی دافع حمیٰ دوا بھی لے لیا۔ اسی کرب و بے چینی کے ساتھ دو تین دن گزر گئے، فلیٹ پر تنِ تنہا رہنا دشوار ہو گیا، اکیلا پن کاٹنے کو دوڑتا اور خاطر خواہ افاقہ بھی نہیں ہو رہا تھا، دن تو جیسے تیسے کاٹ لیا کرتا تھا لیکن رات میں بخار میں اضافہ ہو جایا کرتا تھا، دواؤں کے اثر رہنے تک درجۂ حرارت میں تھوڑی بہت تخفیف ہو جاتی تھی اور جیسے ہی دوا کا اثر کم ہوتا تھا درجۂ حرارت پھر واپس بڑھ جاتا تھا، ۱۶/اپریل ۲۰۲۱ء بمطابق ۳/رمضان ۱۴۴۲ھ، جمعہ کی رات کو جیسے تیسے سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ تقریباً ۱۱ بجے شب گھر سے بڑے بھیا کا فون آیا کہ ابو کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی ہے، یہ سنتے ہی میں پریشان ہو گیا، مانو میری روح ہی فنا ہو گئی ہو، میں نے فوراً بھائی کو کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، مجھے تیز بخار ہے، بھلا میں کیسے آپاؤں گا؟ کووڈ-۱۹ کے قہر کی وجہ سے بخار کے ساتھ ہوائی سفر پر حکومت کی طرف سے بھی پابندی عائد تھی، ساتھ ہی دل میں یہ خدشہ لاحق ہوا کہ شاید مجھے خبر مکمل نہ دی گئی ہو اور ابو ہم سب کو چھوڑ کر دنیائے فانی سے روانہ ہو چکے ہوں۔ میں نے فوراً انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور ان کی مغفرت کے لیے دست دعا دراز کر دیا اور دعائے مغفرت کے ساتھ ان کا ٹھکانہ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام ملنے کی طلب کی، کیونکہ:

زندگی فردوس گم گشتہ کو پاسکتی نہیں
موت ہی آتی ہے یہ منزل دکھانے کے لیے

اسی دوران دل میں ان کے آخری دیدار کی تمنا لیے ہوئے میں نے فلائٹ کا ٹکٹ دیکھا جو صبح کے لیے میسر تھا میں نے فوراً ٹکٹ بنالیا اور تب تک میرے اکثر احباب (وسیم، حامد الدین، عابد بھائی، اعظم بھائی وغیرہ) کو اس بات کی اطلاع مل چکی تھی لہٰذا سب حاضر ہو گئے اور مجھے تمام تر تدابیر کے ساتھ جیسے تیسے ایئر پورٹ کے لیے روانہ کر دیا، اللہ اللہ کر کے میں صبح سویرے کی فلائٹ سے تقریباً ۸/بجے گھر پہنچ گیا اور پھر اپنے والد بزرگوار کے جنازے میں نہ صرف شامل ہوا بلکہ ان کو غسل بھی دلایا اور پھر نماز جنازہ بھی میں نے ہی پڑھائی۔ (یہ شاید دونوں کے حق میں بہتری کی علامت تھی)۔ پھر میری طبیعت جو ناساز تھی پہلے سے زیادہ ناساز ہو گئی اور ہوتی ہی گئی یعنی میں بھی اس خطرناک مرض کووڈ-۱۹ کا شکار ہو گیا تھا کیونکہ وہ تمام علامات مجھ میں بھی نمایاں طور پر مشاہدہ میں آنے لگیں لہٰذا میں نے خود کو سب سے علاحدہ کر کے اپنے کمرے تک محدود کر لیا اور معروف ایلوپیتھک ادویہ کا پانچ روز کا ایک مکمل کورس یا کچھ زیادہ جسے میں نے اپنے چھوٹے برادر نسبتی؛ ڈاکٹر عبدالکلیم (ایم بی بی ایس، ایم ڈی) کی ہدایت پر استعمال کیا۔ زعفران اور ہلدی کا استعمال بھی معمول میں شامل کیا ساتھ ہی یونانی معالجین کی ہدایتوں پر بھی عمل کرتا رہا اور یونانی ادویہ بھی پابندی کے ساتھ استعمال کرنا شروع کر دیا جن میں خمیرہ مروارید، شربت اعجاز، حب ضیق النفس، حب جواہر مہرہ وغیرہ استعمال کرتا رہا اور تقریباً ۱۵/روز یا کچھ زیادہ عرصہ تک استعمال کرتا رہا، ساتھ میں بطور خاص عمدہ قسم کے گوشت پر مشتمل خوراک جاری رکھی۔ دوران مرض کبھی کبھی اس قدر شدید کمزوری لاحق ہو جاتی تھی کہ ایک قدم چلنا بھی دوبھر ہو جاتا تھا، میری حالت زار دیکھ کر میرے دونوں بڑے بھائی (عبدالحق، محمد منیب) اکثر کہا کرتے کہ چلو تمھیں کسی اسپتال میں داخل کر دیں لیکن میں کسی طور بھی تیار نہیں ہوا کیونکہ یہ تقریباً پندرہ روز کا عرصہ کووڈ-۱۹ کی شدت کا دور تھا جس میں اعزہ و اقارب، متعلقین، دوست، احباب، اساتذہ دھیرے دھیرے اس دار فانی سے دار جاودانی کی راہ لے رہے تھے۔ خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ فیملی کو چھوڑنے اور ان سے الگ ہو کر کسی اسپتال میں داخلہ کے خیال سے ہی ڈر لگتا تھا۔ بہر حال میری اہلیہ (محترمہ عقیلہ پروین) اور میرے بچوں کا ساتھ، ان کی دعاؤں، والدہ کی شفقت اور شفایابی کی خصوصی دعاؤں، دیگر اہل خانہ کی دعاؤں نے صحتیابی میں مہمیز لگائی اور

بفضلہٖ تعالیٰ کووڈ-۱۹ کی تکالیف کو مات دے کر میں روبصحت ہوگیا۔

رمضان کے مبارک ایام میں کووڈ-۱۹ کے اس قہر نے ہر طرف موت کا سا سناٹا طاری کر دیا تھا، یونانی طب کے بے حد فعال، جواں سال طبیب، ڈاکٹر ابوالحسن اشرف (متوفی ۲۱/اپریل ۲۰۲۱ء، بمطابق ۸/رمضان ۱۴۴۲ھ) کی موت سے دل بے حد غمگین ہوگیا تھا کہ شب و روز کسی نہ کسی کی موت کا اعلامیہ جاری ہوجاتا تھا، جس میں قریبی رشتہ دار بھی تھے، اسی دوران استاذ محترم پروفیسر غفران احمد صاحب کی علالت کی بذریعہ وہاٹس ایپ اطلاع ملی تو نہ جانے کیوں بے چینی سی طاری ہوگئی اور پھر ہر لمحہ ان کی شفایابی کے لیے دست دعا دراز کر دیتا تھا، ساتھ ہی ان کے احوال سے باخبر رہنے کی ہر دم جستجو میں موبائل کی اسکرین پر انگلی اٹکی رہتی تھی۔ جب جب مرض میں اضافہ اور بڑھوتری کی خبر ملتی تھی کرب و بے چینی میں مزید اضافہ ہوجاتا تھا۔ صبح و شام وابستگانِ یونانی طب کی ایک کثیر تعداد ان کی صحت و سلامتی کی دعائیں کرتی رہتی، کئی بار یہ خیال آیا کہ ان سے رابطہ کروں لیکن براہ راست رابطہ نہیں کر پایا، شاید ان کا احترام اور علمی رعب و دبدبہ درمیان میں حائل ہوجاتا تھا۔ میں ان سے بات نہیں کر پا رہا تھا، پھر بھی دوستوں، اور استاذ محترم کے آس پاس موجود ان کے شاگردوں سے کسی نہ کسی طور ان کی حالت کی خبر مل جایا کرتی تھی۔ ان دنوں کووڈ-۱۹ اور آکسیجن کا چھتیس کا آنکڑا تھا اگر کسی کا آکسیجن سچوریشن ۹۴/فیصد سے نیچے آجاتا تھا تو تشویش میں اضافہ ہوجاتا تھا اور جب پتہ چلا کہ آکسیجن کی کمی کے وہ بھی شکار ہیں تو دل وحشت میں ڈوبنے لگا، بے چینی اور بے کسی میں مزید اضافہ ہونے لگا، مجھے اپنی بیماری اور خرابی صحت سے زیادہ استاذ محترم کی شفایابی کی فکر لاحق ہوگئی۔ لیکن جب صحت میں کسی قسم کی بہتری نہ ہونے اور مرض میں مزید اضافہ کی صورت میں انھیں کنگ جارج میڈیکل یونیورسٹی، لکھنؤ ان کے برادر نسبتی؛ پروفیسر عثمان کوثر صاحب کی ایماء پر منتقل کیا جانے لگا تو تشویش بڑھنے لگی۔ اور پھر بروز جمعہ، ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء بمطابق ۱۷/رمضان ۱۴۴۲ھ کی علی الصبح ان کی رحلت کی خبر وہاٹس ایپ پر فلش کر گئی اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے قدموں تلے زمین نکل گئی ہو، کان اس خبر کو سننے اور دماغ اسے قبول کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ لیکن حقیقت یہی تھی کہ اب ان کی روح قفس عنصری کو الوداع کہہ چکی تھی، موت نے برزخی زندگی کا پیام دے دیا اور انھیں دنیائے فانی سے دنیائے جاودانی کی جانب کوچ کرنا پڑ گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اب نہیں لوٹ کے آنے والا
گھر کھلا چھوڑ کے جانے والا

بس پچھتاوا یہ ہے کہ:

بیٹھ کر سایۂ گل میں ناصرؔ
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

استاذ محترم کی رحلت کوئی آخری رحلت نہ تھی بلکہ موت کا تانڈو مسلسل جاری تھا اور اپنی گرفت میں دنیائے انسانیت کو جکڑتا جا رہا تھا، چند روز قبل ہی اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے ہمارے استاذ پروفیسر مختار حسین حکیم کا انتقال ہوگیا تھا (۲۶/اپریل ۲۰۲۱ء، بمطابق ۱۳/رمضان ۱۴۴۲ھ) جب کہ استاذ محترم پروفیسر غفران احمد کے انتقال کے اگلے روز استاذ محترم پروفیسر محمد یونس صدیقی (۱/مئی ۲۰۲۱ء، بمطابق ۱۸/رمضان ۱۴۴۲ھ) بھی کووڈ-۱۹ کی بھینٹ چڑھ گئے اور میرے ہم درس، بے حد فعال اور قریبی دوست، ڈاکٹر فرید احمد فلاحی، علیگ (۲۰/مئی ۲۰۲۱ء، بمطابق ۷/شوال ۱۴۴۲ھ) بھی کووڈ-۱۹ کی گرفت سے نہیں بچ پائے، انھیں بھی ہم سے جدا ہونا پڑا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون:

اٹھ گئیں ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لیے، کس کس کا ماتم کیجیے

یوں تو نہ جانے کتنے لوگ اس کووڈ کی وبا میں اپنی زندگی ہار گئے لیکن جو درد پروفیسر غفران صاحب کی جدائی کا ہے اس کی چبھن ناقابل برداشت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے سرفراز فرمائے۔ آمین!

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

پروفیسر غفران احمد

یادوں کے دریچے سے

پروفیسر کفیل احمد ☆

وہ بیسویں صدی کی آخری دہائی کے ابتدائی سالوں میں سے کوئی سال تھا جب ایک روز شام کے وقت میں محمد حبیب ہال سے باہر نکل رہا تھا تو ہال کی عمارت کے صدر دروازے کے سامنے دیکھا کہ میرے ہم جماعت، دوست اور روم پارٹنر خورشید عالم صاحب جو فی الوقت بھوپال کے سید ضیاء الحسن یونانی کالج کے شعبۂ منافع الاعضاء میں پروفیسر ہیں، سرِ راہ ایک خندہ جبیں، خوب رو، خوش لباس اور کسی حد تک پرکشش دکھائی دینے والے شخص سے محوِ گفتگو ہیں، جو سائیکل پر نیم سواری کے عالم میں نہایت انکساری کے ساتھ ہونٹوں پر تبسمِ پیہم لیے ہوئے ان سے ہم کلام ہے۔ قدرے متجسس قدموں سے میں بھی ان کے قریب پہنچ گیا اور رسمی سلام و دعا کے بعد ان کی گفتگو سننے لگا، جس کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ شخص ظاہری خوش نمائی کے ساتھ ساتھ انتہائی خوش کلام اور نرم خو بھی ہے، جس کے لب و لہجے سے بلاوجہ کے اپنے پن کا احساس ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد وہ صاحب رخصت ہوئے تو میں نے ڈاکٹر خورشید صاحب سے پوچھ لیا کہ کون تھے یہ صاحب؟ انھوں نے بے ساختہ اور قدرے تعجب سے کہا ''ارے! انھیں نہیں جانتے تم، یہی تو ہیں غفران فلاحی، طبیہ کالج کے وہ طالب علم جن کے سامنے میڈیکل کے طلبہ بھی کہیں نہیں لگتے۔'' یہ تھا غفران صاحب کا مجھ سے پہلا تعارف جو باوجود محض اتفاقی ہونے کے ذہن و دماغ میں ان کی ایک ان مِٹ سی شبیہ چھوڑ گیا۔ گو حتمی طور پر وہ ماہ و سال حافظے کی گرفت میں نہیں رہ سکے مگر خورشید بھائی کی زبان سے بے ساختگی کے ساتھ نکلے ہوئے یہ الفاظ جیسے ابھی بھی میری سماعت سے ٹکرا رہے ہیں۔ وہ دن اور آج کی گھڑی، خود غفران صاحب سے ملاقات ہو یا ان کا تذکرہ، ان الفاظ کی بازگشت حافظے میں ایسے ہی محسوس ہوتی ہے جیسے یہ ابھی کی بات ہو۔

اس واقعے کے بعد غفران صاحب سے گو میرا کوئی خصوصی نوعیت کا ربط نہیں رہا مگر احترام کا ایک ایسا رشتہ ضرور قائم ہو گیا کہ ان سے مل کر یا محض ان کو دیکھ کر ایک انجانی سی مسرت اور حوصلہ افزائی کا احساس ہونے لگتا۔

غفران صاحب سے دوسری ملاقات جو میری قوت حافظہ کے ذخیرے کا حصہ بنی اس کی حیثیت کچھ ایسی ہے کہ جس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ آیا اس کا تذکرہ مناسب بھی ہے یا نہیں۔ بات دراصل اس وقت کی ہے جب میں بی یو ایم ایس کے بعد ایم ڈی سال اول کا طالب علم تھا۔ ایم ڈی میں میرا تعلق شعبۂ کلیات سے تھا مگر اس وقت پی جی میں سال اول کے تمام مضامین تمام شعبہ جات کے طلبہ کو مشترکہ طور پر پڑھنے ہوا کرتے تھے۔ اصول تحقیق کا پیپر شعبۂ علم الادویہ کا حصہ ہوا کرتا تھا جس میں غفران صاحب کا نیا نیا تقرر ہوا تھا، چنانچہ ریسرچ میتھڈولوجی کے امتحان میں وہ انٹرنل ممتحن تھے اور ایکسٹرنل جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج سے کوئی صاحب آئے تھے۔ غفران صاحب کا بحیثیت استاد غالباً وہ پہلا امتحان رہا ہوگا۔ وائیوا میں میری کارکردگی بہت اچھی نہیں رہی تھی اور جو مجھے یاد ہے، غفران صاحب نے مجھ سے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا تھا کہ بتاؤ تمھیں اس وائیوا میں کتنے نمبر دیے جا سکتے ہیں، میں چونکہ اپنے جوابات سے خود مطمئن نہیں تھا اس لیے میں نے بھی اتنی ہی معصومیت سے کہہ دیا ''سر مجھے اس میں پاس نہیں ہونا چاہیے۔'' جب نتیجہ آیا تو غفران صاحب کے لیے دل میں جو احترام کا

☆ پروفیسر، شعبۂ کلیات، اسٹیٹ تکمیل الطب کالج لکھنؤ، اتر پردیش۔ E-mail:drkafilafumc@gmail.com، Mob.No:9458809029۔

جذبہ تھا اس میں یک گونہ اضافہ کا احساس ہوا کیونکہ اس میں انھوں نے انصاف کے تقاضے کو پورا کیا تھا اور کسی رؤ رعایت سے کام نہیں لیا تھا۔

اس کے بعد میرا مزید دو سال علی گڑھ میں قیام رہا، ہمارے شعبے اور مضامین الگ تھے، بہت باقاعدگی سے نہیں لیکن موقع بہ موقع جب بھی ملاقات ہوتی غفران صاحب اپنے طرزِ تخاطب اور مشفقانہ رویوں سے عجیب قسم کی اپنائیت کا احساس چھوڑ جاتے۔ کئی بار امور تحقیق اور مطالعہ کے تعلق سے رہنمائی طلب کی، انھوں نے نہایت دلجوئی کے ساتھ رہنمائی فرمائی۔ اکثر ملاقات ہوجانے پر خود ہی پوچھ لیا کرتے تھے کہ مجھ سے تو کوئی کام نہیں تھا، لہجے میں جس خلوص اور رأفت کی آمیزش ہوا کرتی وہ دل میں عظمت واحترام کے نقوش کو مزید گہرا کر جاتی۔

۱۹۹۹ء میں شعبۂ کلیات سے ایم ڈی مکمل کر کے راقم تدریس کے سلسلے میں الفاروق یونانی میڈیکل کالج، اندور سے وابستہ ہوگیا۔ اس دوران غفران صاحب کے تدریسی، تحقیقی اور تصنیفی کارناموں کی خبریں مختلف ذرائع سے ملتی ضرور رہتی تھیں مگر براہ راست رابطہ بہت کم رہا، ہاں! جب کبھی امتحان وغیرہ کے تعلق سے علی گڑھ آنا ہوتا تو ملاقات ضرور ہوتی اور یہ ملاقات چاہے کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو ان کا پرتپاک انداز اور خندہ روی، حسن اخلاق کی اثر آفرینی کا ایک تازہ نقش چھوڑ جاتی۔

تیسرا ایک اور واقعہ جو غفران صاحب کے تعلق سے پردۂ ذہن پر ابھرتا ہے وہ اس وقت کی بات ہے جب وہ این آئی یو ایم میں اپنی خدمات سے سبکدوش ہوکر واپس علی گڑھ لوٹ چکے تھے۔ غالباً ۲۰۱۰ء یا ۲۰۱۱ء کی بات ہے، نیشنل انسٹی ٹیوٹ میں اساتذہ کی ٹریننگ کا پروگرام تھا، راقم اس میں ٹرینی کی حیثیت سے شریک تھا۔ غفران صاحب علی گڑھ سے بحیثیت ٹرینر تشریف لائے تھے، انھوں نے یونانی طب میں تحقیق کی اہمیت، ضرورت اور طریقۂ کار پر ایک مبسوط لکچر دیا تھا۔ پورا لکچر انگلش میں تھا، زبان کی سہولت، سلاست اور روانی کی دل کشی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص ہمہ تن گوش ہوکر لکچر سن رہا تھا۔ پروفیسر مستحسن علی جعفری اس وقت این آئی یو ایم کے ڈائریکٹر تھے، وہ کسی وجہ سے لکچر میں تاخیر سے حاضر ہوئے تھے۔ لکچر کے بعد حسبِ روایت جعفری صاحب کمنٹ کے لیے کھڑے ہوئے اور انھوں نے جو الفاظ کہے وہ بھی غفران صاحب کے تعلق سے میری یادداشت کا حصہ بن کر رہ گئے۔

ہوا یوں تھا کہ چونکہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ کا کیمپس بنگلور میں ایک پہاڑی کے جنگل نما قطعہ آراضی پر مشتمل ہے جس میں اکثر سانپ نکلنے اور آگ لگنے کے واقعات رونما ہوتے رہتے تھے۔ اس روز بھی جب غفران صاحب کا لکچر چل رہا تھا کیمپس کے کسی حصہ میں آتش زدگی کا واقعہ پیش آگیا اور ادارے کا سربراہ ہونے کے ناطے جعفری صاحب کو وہاں جانا پڑا، بیچ میں کسی نے ان کو فون کر کے بلانا چاہا مگر وہ شاید بالکل آخر میں تشریف لائے، اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے اس موقع پر کہا تھا کہ ''میں کیمپس کی آگ میں لگا تھا اور ادھر مجھے کسی نے فون پر کہا کہ یہاں تو آیئے ادھر غفران صاحب نے ایک دوسری آگ لگا رکھی ہے اور لکچر کا آخری حصہ سننے کے بعد مجھے واقعی گھاٹے کا احساس ہو رہا ہے، میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ اس آگ سے ہونے والا نقصان بڑا تھا یا یہ نقصان جو مجھے غفران صاحب کے لکچر سے محرومی کے سبب ہوا ہے۔'' جعفری صاحب سے جو لوگ واقف ہیں وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے جیسے بے لاگ شخص کے منہ سے کسی کے لیے اس طرح کے الفاظ کیا معنی رکھتے ہیں۔ غفران صاحب کے علمی وقار اور ان کی ہر دلعزیزی کی سند رکھنے والے یہ الفاظ نقش بر حجر کی مانند اپنے پورے منظر نامے کے ساتھ لوح دماغ پر آج بھی ثبت ہیں۔

ایک عمر کی بات چھوڑ دیں تو غفران صاحب کی شخصیت اللہ کے ان مقبول بندوں میں سے ایک نظر آتی ہے جن پر اس کی جود وعطا اور رزاقیت نے بے حد فیاضی کے ثبوت دیے ہیں۔ صرف مال و دولت، دنیا کی کشادگی وفراوانی کا ہی اللہ کے رزق میں شمار نہیں ہے، بلکہ علم نافع، عمل صالح، جسمانی صحت، وجاہت، حسن سیرت، پاکی طینت، صدق و صفائے طبیعت، خلقت کے لیے جذبۂ مودت و خدمت، ضرورت مندوں کے کام آکر احساس مسرت اور سب سے بڑھ کر بندگانِ خدا کے دلوں میں مقام محبوبیت یہ سب اللہ کے رزق اور اس کی بڑی نعمتوں کی مختلف شکلیں ہیں جن میں سے بلاشبہ قدرت کی طرف سے غفران صاحب کو حصہ وافر عطا ہوا تھا۔

اپنے معاصرین میں پروفیسر غفران احمد مرحوم کو جو علمی وقار واعتبار بہت کم عرصہ میں حاصل ہوگیا تھا وہ کم لوگوں کے حصہ میں آتا ہے۔ ان کے علمی تبحر وتفوق، تدریسی، تصنیفی وتحقیقی صلاحیت اور اخلاقی عظمت کو آنکنے کے لیے کسی روایتی پیمانے

یالفظی مبالغوں کی چنداں ضرورت نہیں ہے، زبان خلق خود نقارۂ خدا بن کران کی شانِ محبوبیت ومقبولت کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے۔

اپنے حسن عمل اور خلق حسن کی بدولت لوگوں کے دلوں میں غفران صاحب نے جو جگہ پائی تھی وہ انھیں کا حصہ تھا۔ ہر دلعزیزی کی یہ نعمت ان کو زندگی کے ہر مرحلے میں حاصل رہی۔ زمانہ طالب علمی میں مدرسہ سے لے کر یونیورسٹی تک وہ جس بھی شعبہ اور مضمون سے وابستہ رہے اپنے اساتذہ اور ساتھی طلبہ میں برابر مقبول ومحبوب رہے، تدریسی زندگی میں آئے تو اپنے ہم عصر اہل علم اور اپنے طلبہ کے درمیان ان کی اس حیثیت میں اضافہ ہی ہوا، اس لیے کہ ممکن ہے کوئی ہو! مگر میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص غفران صاحب کا تصور ان کی مخصوص مسکراہٹ کے بغیر بھی کرسکتا ہے۔ ایک لطیف، دائمی اور ہمدردانہ تبسم قدرت نے ان کے ہونٹوں کا جیسے inbuilt حصہ بنایا تھا۔

اپنے بڑوں سے ایک کہاوت سنی تھی کہ ''نیک آدمی میں سب کا حصہ ہوتا ہے۔'' غفران صاحب میں بھی ہمارا ایسا ہی حصہ تھا، وہ سب کے تھے اور سب ان کو اپنا گردانتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے اس دنیا سے چلے جانے کی خبر ان سے ادنیٰ سا علاقہ رکھنے والے کے لیے بھی کسی صاعقۂ جانکاہ سے کم نہ تھی۔ ان کا جانا ہر شخص کو کسی نہ کسی حد تک اپنا ذاتی نقصان محسوس ہوتا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ ان کے اپنے پیاروں نے اس صدمے کو کس دل سے برداشت کیا ہوگا۔ اللہ انھیں صبر جمیل اور نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

کورونا کی وبا نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جس طرح تہہ و بالا کرکے رکھ دیا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ جانی، مالی، علمی، معاشرتی، اقتصادی، معاشی، صنعتی اور تجارتی کون سا شعبۂ حیات ہے جس کو خدا کے اس غیر مرئی عذاب نے درہم برہم نہ کیا ہو۔ دوسری لہر کے دوران ان تمام تباہ کاریوں کے ساتھ مادرِ علمی علی گڑھ سے متعدد اساتذہ کی رحلت کی خبریں بھی تسلسل سے آرہی تھیں، کئی جانی پہچانی شخصیات کے دنیا سے اٹھ جانے کی خبریں بھی آئیں، ان پر غم وافسوس بھی فطری امر تھا لیکن غفران صاحب کے Critical Condition میں علی گڑھ سے لکھنؤ منتقل ہونے کی اطلاع ملی تو دماغ جیسے سن ہوکر رہ گیا۔ ان کا تنومند سراپا اور متبسم چہرہ آنکھوں میں جم کر رہ گیا۔ بارگاہِ ایزدی میں دعا کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ لکھنؤ میں ہونے کے باوجود دیکھ پانے کا امکان نہیں تھا۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا اور بالآخر ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء کو وہ خبر بھی سننی پڑی جس پر یقین کرنے کو دل آج تک آمادہ نہیں حالانکہ اس کی آہٹ پہلے سے ہی محسوس ہونے لگی تھی۔ وبا کے اس دور میں قزاقِ اجل نے جن بیش بہا سرمایوں پر ڈاکہ زنی کی ہے یونانی طبی حلقوں کا شاید یہ سب سے بڑا خسارہ تھا جس کی بھر پائی اب دیکھیے کب؟ کیسے؟ اور کیونکر؟ ہو پاتی ہے۔

بھلا سکیں گے نہ اہل زمانہ صدیوں تک
تری وفا کے، ترے فکر وفن کے افسانے

☆☆☆☆☆

تعزیتی پیغام

پروفیسر غفران صاحب کا انتقال ہم سب کے لیے بہت ہی اندوہناک اور تکلیف دہ ہے۔ وہ بے حد شریف بہت تعلیم یافتہ، منکسر المزاج، متمدن اور مہذب شخص تھے۔ یہ سانحہ فیکلٹی اور طبی برادری کے لیے غیر تلافی نقصان کا باعث ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین!

(پروفیسر تاج الدین، سابق ڈین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، سابق صدر، شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

ISSN:2454-4507

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

عبداللہ زکریا☆

جیسے جیسے نسل انسانی ترقی کرتی گئی، اس کے دشمنوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور اسے اپنی بقا کی جنگ میں نئے حریفوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جن عناصر نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی اس میں عالمی وبا (Pandemic) کو تباہی و بربادی کے لحاظ سے جنگوں کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔ نسل انسانی اگر آج اس کرۂ ارضی پر موجود ہے تو اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ قدرت نے اسے ایک حیرت انگیز قوت دفاع (Immune system) ودیعت کیا ہوا ہے، دوسرے اس نے اپنے ذہنی ارتقاء سے سائنس کے میدان میں اتنی ترقی کرلی کہ وہ اس طرح کے تمام خطرات کا مقابلہ کرنے اور اسے شکست دینے میں صدی در صدی کامیاب ہوتی رہی۔ عالمی وبا کی تعریف یہ ہے کہ ''وہ بیماری جو صرف کسی ایک علاقہ، خطہ یا ایک ''نسل'' میں محدود نہ ہو بلکہ پوری دنیا میں اس کا پھیلاؤ ہو چکا ہو'' اولین وبا، جس کا تاریخی ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے، ۴۳۰ قبل مسیح پیلوپینیشن (Pelopenessian) جنگ کے دوران پھیلی۔ لیبیا، ایتھوپیا اور مصر سے ہوتی ہوئی یہ وبا ایتھنز (Athens) پہنچی اور آبادی کا ایک تہائی حصہ اس کا شکار ہوگیا۔ پھر وقتاً فوقتاً وبائیں آتی رہیں، لوگ مرتے بھی رہے لیکن نسل انسانی آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ ۱۹۱۸ء میں اسپینش فلوٗ نام کی وبا نے تو ایک وقت ایسا خطرہ پیدا کردیا تھا، لگتا تھا کہ پوری انسانی نسل ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی۔ اس وبا میں تقریباً ۵۰ ملین لوگ ہلاک ہوئے، لیکن جس انداز کی تباہی کووڈ-۱۹ نے پھیلائی ہے اس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ کیا شہری کیا بادیہ نشین، کیا مشرق کیا مغرب، تاریخِ انسانی کی ایک خونچکاں داستاں رقم ہورہی تھی۔ کتنے ہی آفتاب ہائے علم عین نصف النہار پر غروب ہوگئے۔ چنانچہ ایسے نابغۂ روزگار میں پروفیسر غفران احمد بھی تھے، دنیائے طب کا وہ شہسوار کہ جس کا رخش ابھی نہ جانے کتنے اور میدان مارتا لیکن افسوس کہ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

پروفیسر غفران کی نمود اس مٹی سے ہوئی جس کے بارے میں اقبال سہیل یہ کہہ گئے ہیں کہ ''جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیّرِ اعظم ہوتا ہے۔ اس میں کچھ مبالغہ ہوسکتا ہے لیکن حقیقی معنوں میں انھوں نے اس کو سچ کر دکھایا۔ اعظم گڑھ کی سرزمین سے اٹھا یہ ذرہ دنیائے طب میں واقعی ایک نیّرِ اعظم بن کر جگمگایا۔ ان کی تربیت، نشو ونما اور علمی فتوحات میں دو اداروں کا بڑا ہاتھ رہا۔ اولین ایشیا کی عظیم درسگاہ جامعۃ الفلاح اور دوم سرسید کا قائم کیا ہوا ادارہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ نقشِ اوّل جامعۃ الفلاح کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں کے فارغین دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم سے بھی بہرہ ور ہوتے ہیں، یہ بات پورے تیقن اور ذاتی تجربہ کی روشنی میں کہی جارہی ہے۔ راقم بھی فلاح کا ہی پروردہ ہے اور آج زندگی میں جس مقام پر بھی ہے اس کی بنیادیں فلاح کی تعلیم و تربیت پر ٹکی ہوئی ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ شخصیت کو مزید جلا دینے کے لیے یونیورسٹی کے ایکسپوزر کی ضرورت ہوتی ہے۔ پروفیسر غفران احمد کی شخصیت کی تکمیل کا یہ مرحلہ علی گڑھ جا کر پورا ہوا۔ وہ دونوں تہذیبوں کا ایک حسین امتزاج تھے، اور پوری زندگی انھوں نے دونوں قدروں کی پاسداری کی۔ طبیعت مشکل پسند تھی، اس لیے علی گڑھ جا کر انھوں نے معاشیات میں بی اے کرنے کی ٹھانی اور اپنی جانفشانی اور لگن سے اس میں بھی مہارت حاصل کرلی۔ مدرسہ سے فارغ کسی بھی طالبعلم کے لیے یہ بڑی کامیابی تصور کی جاتی ہے کیونکہ سارا مواد صرف اور صرف انگریزی میں دستیاب ہے، مزید برآں ریاضی کے اصولوں سے کماحقہٗ واقفیت بھی ضروری ہے۔ آخری عمر تک انھیں معاشیات سے بڑی دلچسپی رہی۔ شیئر مارکیٹ سے لے کر معاشیات کے دقیق مسائل کو وہ اپنی پُرعلم گفتگو سے پانی پانی کردیتے تھے۔ کرکٹ کے علاوہ یہ ان کی زندگی کی دوسری بڑی دلچسپی تھی۔ معاشیات میں بی اے کرنے کا ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انھوں نے انگریزی زبان پر اعلیٰ دسترس حاصل کرلی۔ آگے زندگی میں یہ مہارت ان کے بہت کام آئی۔ اپنے والد کے شدید اصرار پر انھیں اعداد و شمار کی خشک دنیا چھوڑنی پڑی ورنہ کوئی تعجب نہیں کہ آج دنیا انھیں ایک

☆ سابق ویڈیو جرنلسٹ، این ڈی ٹی وی، ممبئی، مہاراشٹر۔ Mob.No:7738451200، E-mail:zakabdullah1968@gmail.com۔

ماہرِ معاشیات کے طور پر جانتی۔ وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں نا کہ "Somone's loss is someones gain" تو اس طرح معاشیات کا خسارہ یونانی طب کا منافعہ بن گیا۔

حلم و بردباری اور تواضع و انکساری نے ان کی شخصیت میں ایک عجیب جاذبیت پیدا کردی تھی۔ وہ اس انگریزی مقولے کی عملی تصویر تھے کہ "The tree laden with fruits always bends low" ''تھوتھا چنا گھنا بجتا ہے'' اور وہ تو علم کا بحرِ ذخار تھے۔ ان سے مل کر کبھی کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ وہی شخص ہے جو سیمپوزیم اور سیمیناروں کی جان ہے اور جس کی ایک دنیا معترف ہے۔ خشونت اور زبردستی کا طاری کیا ہوا رعب جو عموماً پروفیسر حضرات کی شخصیت کا ایک حصہ ہوتا ہے، اس کا ہلکا سا پرتو بھی ان کے رخ پر کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہاں ایک سنجیدگی، متانت اور علمی وقار ان کے رہن سہن، چال ڈھال اور طریقۂ گفتگو میں ضرور جھلکتا تھا لیکن نہ تو وہ زاہد خشک تھے اور نہ ہی ہمیشہ سنجیدگی کی چادر اوڑھے رہتے تھے۔ حلقۂ یاراں میں جب وہ خوش گفتاری پر اترتے تو ڈمپل رخساروں میں ہی نہیں بلکہ فقروں میں بھی پڑنے لگتے۔

ان کی شخصیت کا سب سے تابناک پہلو ان کا حسن اخلاق تھا۔ وہ مکارمِ اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ ہر کسی سے خندہ پیشانی سے ملنا اور ہر کسی کے کام آنا، ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ قحط الرجال کے اس دور میں، جب کہ ہر طرف نفسا نفسی کا دور دورہ ہے اور تملق، خودغرضی اور مکاری، کامیابی کے لیے ضروری وصف شمار ہونے لگے ہیں، ان سے مل کر اعلیٰ اخلاقی قدروں پر متزلزل ایمان پھر سے قائم و دائم ہوجاتا۔ ان کے اخلاص اور اعلیٰ ظرفی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کے ایک شاگرد نے ان کے تحقیق شدہ مواد کا کچھ حصہ اپنے نام سے چھپوالیا لیکن وہ براہ راست حرفِ شکایت بھی زبان پر نہیں لاسکے بلکہ الٹا اگر کبھی کوئی اس موضوع پر گفتگو کی کوشش کرتا تو نہ صرف یہ کہ اس کو سخت ناپسند کرتے بلکہ تنبیہہ بھی کرتے کہ آئندہ کبھی یہ موضوع زیرِ گفتگو نہ لایا جائے۔ آج جب علمی اور ادبی سرقے کی ایک لہر چلی ہوئی ہے اور لوگ نمایاں ہونے کے لیے نہ جانے کیسی کیسی گھناؤنی حرکتیں کر رہے ہیں، اپنی شبانہ روز کی محنت سے یوں دستبردار ہوجانے کے لیے الگ طرح کی درویشی، استغناء اور ظرف کی ضرورت ہے۔

وہ ایک شفیق استاد اور دوراندیش مربی تھے اور ان کی تربیت کا انداز بڑا جداگانہ تھا۔ برادرارشد جمال اس ضمن میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہمارے گوش گزار کرتے ہیں۔ ہوا یوں کہ بی یو ایم ایس کے دوسرے سال میں غفران صاحب علم الصیدلہ پڑھاتے تھے۔ انٹرنل اسسمنٹ (Internal assessment) کے ۱۵/نمبر کے تین پیپر ہوتے تھے اور مروجہ طریقہ یہ تھا کہ یا تو بیسٹ آف تھری کو کاؤنٹ کرتے یا پھر مین (Mean) کے مطابق نمبر الاٹ کردئے جاتے۔ ارشد کے نمبر بالترتیب ۱۵/، ۱۴/ اور ۱۳/ تھے یعنی بتدریج ان کی کارکردگی کا گراف نیچے آرہا تھا۔ ان کے دوست احمد ندیم میں یہ ترتیب الٹی تھی۔ ان کے نمبر بالترتیب ۱۱/، ۱۲/ اور ۱۳/ تھے، یعنی ان کی کارکردگی میں بہتری آرہی تھی۔ غفران صاحب نے دونوں کا فائنل نمبر ۱۳/ کردیا، حالانکہ وہ چاہتے تو ارشد کو ۱۵/ نمبر عطا کرسکتے تھے۔ ان کے اس طرزِ عمل میں تربیت کے تین نقطے چھپے تھے۔ ارشد کو یہ پیغام دینا تھا کہ اس کی کارکردگی متاثر ہورہی ہے اور انگریزی مقولے کے مطابق "He needs to pull his socks"۔ دوسرا احمد ندیم کی تشجیع اور تالیف قلب مقصود تھی اور تیسرا یہ کہ ارشد اور ندیم دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے، اس لیے انھیں یہ گمان گزرا کہ کہیں ایک کی کامیابی دوسرے کی دل شکنی کا سبب نہ بن جائے، سو انھوں نے یہ بہتر جانا کہ دونوں کو برابر نمبر عطا کردیے جائیں۔

وہ تحقیق کے مرد میداں تھے اور چار دانگِ عالم میں ان کی شہرت کا سبب ان کا وقیع علمی اور تحقیقی کام تھا۔ بحث و تحقیق کا مادہ تو خدا کا ودیعت کردہ تھا لیکن اس کو جلا بخشنے میں ان کے استاد پروفیسر کنور محمد یوسف امین کا بڑا ہاتھ تھا۔ پروفیسر غفران مرحوم یونانی طب اور مغربی طب دونوں پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا چھوڑا ہوا وقیع سرمایہ اس پر دال ہے۔ انگریزی اور اردو کے مؤقر سائنسی جرنلز میں ان کے تحقیقی پیپر بڑی پابندی سے شائع ہوتے تھے اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ اگر ایک آدھ پیپر کسی معتبر سائنسی جرنل میں شائع ہوجائے، تو سالوں گردن اکڑائے پھرتے ہیں لیکن مرحوم کی زبان سے کبھی کسی نے فخریہ انداز میں اپنی فتوحات کا تذکرہ نہیں سنا۔ یہ ایک راز کی بات ہے کہ کتنے ہی لوگ جو یونانی طب کی دنیا میں آج جانے پہچانے جاتے ہیں، ان کی کامیابی کے پیچھے بھی بڑی حد تک پروفیسر غفران کا ہی ہاتھ ہے۔ بہتوں کے نام سے چھپے ہوئے پیپر حقیقت میں ان کی نگاہ اصلاح کی کارستانیوں کا نمونہ ہیں۔ اسی طرح بحیثیت سپروائزر ان کے دستِ غیر مرئی کی چھاپ ہر پیپر پر دیکھی جاسکتی ہے۔ بلاشبہ ان کی رحلت ان کے چاہنے والوں، شاگردوں اور خود یونانی طب کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ انھیں اپنی جوارِ رحمت میں رکھے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی

ڈاکٹر احمد سعید☆

اللہ کی مشیت کے سامنے سر تسلیم خم ہے، لیکن اس دل مضطرب کو کیسے سمجھاؤں، کس طرح یقین دلاؤں کہ میرے مشفق استاد، میرے مربی، میرے رہنما پروفیسر غفران احمد کو بھی کورونا کے عفریت نے نگل لیا، ۳۰/اپریل ۲۰۲۲ء بروز جمعہ آپ کووڈ-۱۹ سے شکست کھا گئے اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی، انا للہ وانا الیہ راجعون، اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

آپ کا سانحۂ ارتحال پوری طبی دنیا کو اداس کر گیا، آپ کے تلامذہ، مقربین، متعارفین اور احباب پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا، خاص طور سے وہ لوگ جنھیں ایک زمانے تک استاد محترم سے قربت کا شرف حاصل رہا، جو آپ کے علم فراواں سے فیضیاب ہوتے رہے، ان کے لیے آپ کی ناوقت موت کسی صاعقہ سے کم نہ تھی، ایسا کیوں نہ ہو؟ آپ اپنے شاگردوں کے لیے ایک مثالی استاد اور مربی تھے، عالم طب کی نادرۂ روزگار ہستی تھے، سرآمد فن تھے، طبی دنیا کی آبرو تھے، تعلیم و تدریس کے میدان میں لاثانی تھے، اپنے شعبے میں ہی نہیں بلکہ پورے طبیہ کالج میں آپ کو جو مقبولیت حاصل تھی وہ شاید بہت کم اساتذہ کے حصے میں آئی ہو۔

چونکہ آپ کی وفات ہوئے ابھی محض چند مہینے ہی گزرے ہیں اس لیے آپ کی یادیں، آپ کی مرافقت، آپ کی صحبتیں، آپ کی محفلیں ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے آتی ہیں اور دل کے آئینے پر خون آلود نشانات چھوڑ جاتی ہیں، احباب کہتے ہیں کہ استاد محترم کے قریبی شاگردوں میں آپ کا نام آتا ہے، آپ نے انھیں بہت نزدیک سے دیکھا ہے، ان سے متعلق اپنے مشاہدات اور تأثرات قلمبند کر دیں، میں اپنے جذبات اور احساسات کو کس طرح حیطۂ تحریر میں لاؤں جب بھی قلم اٹھاتا ہوں، آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، اداسی اور بے بسی کی ایک عجیب سی کیفیت جسم و جاں میں تیر جاتی ہے، دماغ شل ہو جاتا ہے، الفاظ اور فقرے حدود ذہن کے قریب پھٹکنے سے انکار کر دیتے ہیں، بڑی جدوجہد اور کوششوں کے بعد چند یادیں اور استاد محترم کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں کے متعلق اپنے جذبات و احساسات کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بیان کرنے کی جسارت کی ہے، تدریس، تعلیم اور تحقیق کے میدان میں آپ کی رفعت و عظمت اور علمی مقام کا تعین تو اہل علم کا کام ہے۔

چھبیس ستائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کل کی بات ہے، اجمل خان طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی میں بی یو ایم ایس کے فرسٹ پروف کا طالب علم تھا، پہلے پروف کے نصاب میں امور طبیعیہ، ادویۂ مفردہ، قوانین ادویہ کے ساتھ جدید میڈیکل سائنس کے انتہائی ترقی یافتہ مضامین اناٹومی اور فزیالوجی بھی شامل ہے، یونانی طب کی کتابوں کا اسلوب، منہج، طریقۂ استدلال، اصول قدرے قدیم اور طریقۂ تدریس بھی نسبتاً روایتی۔ طلبہ جب قدیم و جدید طب کا موازنہ کرتے ہیں تو ان کے دل و دماغ ایک عجیب سی کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر کم مائیگی اور خفت کا احساس در آتا ہے، خاص طور سے وہ طلبہ جو علوم و فنون میں مسلمانوں کی علمی خدمات اور کارناموں سے واقف ہوتے ہیں اور وہ اپنے ذہنوں میں عظمت رفتہ کا قطب مینار تعمیر کر لیتے ہیں، جدید طبی کتابوں کا منہج، اسلوب اور تحقیقات دیکھ کر وہ منارہ متزلزل ہو جاتا ہے۔

ہم طلبہ بھی یہ الجھنیں پالے ہوئے تھے، فرسٹ پروف سے سکنڈ پروف میں آ گئے، اس پروف میں طب کا اہم موضوع 'علم المرکبات' ہے، ایک دن مرکبات کی تدریس کے لیے ایک نوجوان استاد داخل ہوا، چہرے پر متانت و سنجیدگی اور وقار تھا، رنگ گندمی اور قد متوسط سے زیادہ تھا، نگاہوں میں عجیب سی چمک، آواز دل نشین اور پُر تاثیر تھی، یہ نوجوان کوئی اور نہیں تھا، ہمارے استاد پروفیسر غفران احمد تھے۔ لکچر کا موضوع جسمانی نظام پر مرکب دواؤں کی اثر پذیری اور ان کی نوعیت عمل تھا، لکچر کیا تھا، معلومات کا ایک سمندر تھا، قدیم طبی سرمایہ اور جدید سائنسی طبی

☆حکیم اجمل خان انسٹی ٹیوٹ فار لٹریری اینڈ ہسٹوریکل ریسرچ ان یونانی میڈیسن، (سی سی آر یو ایم)، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ E-mail:sayeedalig@gmail.com، Mob.No:9711385612۔

دریافتوں کا حسین امتزاج تھا، آپ نے یونانی دواؤں کا سائنسی طریقۂ استعمال، اس میں اصلاحات کی گنجائش، عصر حاضر میں تحقیقی پیش رفت کے ساتھ مستقبل میں تحقیقی امکانات اور چیلنجز کو سلیس اور سادہ زبان میں یوں بیان کیا کہ ہم طلبہ نے ڈیڑھ دو سال سے طب کے بارے میں جو تصورات قائم کیے تھے وہ پل بھر میں ہوا ہوگئے، مرعوبیت کی جو چادر ذہنوں پر تنی ہوئی تھی اسے دریدہ ہوتے دیر نہیں لگی، آپ کے اس لکچر نے ہمیں پُر اعتماد بنا دیا، موضوع پر آپ کی ماہرانہ گرفت اور تبحر علمی نے اس قدر متاثر کیا کہ اسی وقت سے ہم طلبہ آپ کے گرویدہ ہوگئے۔ استاد محترم سے یہ میرا پہلا تعارف تھا، آپ کی علمی عظمت اور کثیر الجہات شخصیت کے جو نقوش ذہن پر مرتسم ہوئے، امتداد وقت کے ساتھ یہ نقوش گہرے ہوتے گئے۔

پروفیسر غفران احمد صاحب اعظم گڑھ کے ایک معزز اور علمی خانوادے میں پیدا ہوئے، جامعۃ الفلاح اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیمی مراحل طے کیے، شرافت، نجابت، ذہانت اور فطانت خاندانی ورثے میں ضرور ملی تھی لیکن تعلیمی میدان میں اپنی راہ آپ نے الگ نکالی، مدارس کے فارغین جب عصری تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں کا رخ کرتے ہیں تو عام طور پر بی اے میں ایسے مضامین منتخب کرتے ہیں جو ان کے لیے آسان ہوں، استاد محترم نے جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا تو اقتصادیات کا مضمون منتخب کیا، جو لٹریچر کی بہ نسبت مشکل مضمون تھا، ظاہر ہے اس کے لیے آپ نے انگریزی زبان اور ریاضی میں بھی استعداد بہم پہنچائی، بی اے آپ نے امتیازی نمبرات سے پاس کیا، اس کے بعد آپ نے یونانی طب کا رخ کیا اور اجمل خان طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی سے بی یو ایم ایس اور ایم ڈی کیا اور اسی میدان کو اپنی علمی دلچسپیوں کی جولان گاہ بنایا، اسی کالج میں آپ کی تقرری پہلے عارضی اور بعد میں مستقل ہوئی۔

ایم ڈی (کلیات) کے پہلے سال میں مجھے آپ کی خدمت میں حاضری دینے اور آپ کی شخصیت کے مختلف رنگوں کو قریب سے دیکھنے کے مواقع نصیب ہوئے، ایم ڈی سال آخر میں آپ سے کسبِ فیض کے مزید مواقع حاصل ہوئے، راقم کی جب شعبۂ کلیات میں عارضی تقرری ہوئی اور تدریسی میدان میں قدم رکھا تو استاد محترم ہی تھے جنھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی، مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ آپ اس کم علم کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے۔

مبدا فیاض نے آپ کو گوناگوں صلاحیتوں، اخلاقی اقدار اور محاسن سے نوازا تھا کہ ایک شخص میں اتنی خوبیوں کا اجتماع مشکل سے نظر آتا ہے، تدریس کے میدان میں معاصر اساتذہ کے درمیان آپ کی شخصیت منفرد اور ممتاز تھی، اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ عربی و فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان و ادب پر آپ کی گہری نظر تھی نیز آپ کو طب کے قدیم و جدید علوم میں بھی دسترس حاصل تھی۔

بی یو ایم ایس کے طلبہ کو آپ صیدلہ (فارمیسی) پڑھاتے تھے، یہ موضوع ایک سمندر ہے۔ گزشتہ صدیوں میں صیدلہ نے ترقی کے بے شمار مدارج طے کیے ہیں، جن کی تفاصیل ہزاروں صفحات پر محیط ہیں، دوسری طرف بکثرت یونانی مفرد و مرکب دوائیں، ان میں برتے جانے والے قدیم صیدلاتی اعمال اور جدید طریقہائے فارمیسی۔ یہ استاد محترم کا ہی کمال تھا کہ قدیم و جدید معلومات کو اس طرح ہم آہنگ کر کے پیش کرتے کہ معلوم ہوتا کہ جدید صیدلاتی اعمال رازی، قلانسی اور اسرائیلی کی صیدلہ کا ہی ایک تسلسل ہے۔ آپ جب بھی علم و آگہی کے موتی بکھیرتے، طلبہ آپ کے دروس کو حرف بحرف لکھ لیتے، یہ دروس نوٹس کی شکل میں ہندستان کی دیگر یونانی درس گاہوں میں بھی متداول تھے اور طلبہ و اساتذہ ان سے یکساں مستفید ہوتے تھے۔

تحقیق اور اصول تحقیق سے آپ کو خصوصی لگاؤ تھا، ایم ڈی کے طلبہ کو یہ موضوع پڑھاتے، آپ کی صلاحیتوں کا اصلی رنگ یہاں دیکھنے کو ملتا، آپ نے اس موضوع پر کتابوں کا ایک بڑا اور قیمتی ذخیرہ جمع کیا تھا، شعبۂ کلیات میں تقرری کے بعد مجھے آپ کے اس کتب خانے سے استفادے کا خوب موقع ملا، آپ کی یہ خصوصی عنایت تھی کہ اکثر موضوعات پر میرے لیے خود کتابیں منتخب کر دیتے، جہاں کہیں دشواری پیش آتی اسے حل کرتے بلکہ باضابطہ پڑھاتے، ایگریکلچرل سائنس کے تحقیقی اصولوں سے متعلق بھی کافی کتابیں آپ کے زیر مطالعہ رہتیں۔ تدریس، طلبہ کے درمیان گھرے رہنے اور درون خانہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے باوجود آپ کی وسعت مطالعہ کی داد دینی پڑتی ہے۔

تحقیق کا ذوق فطری تھا، علم الادویہ میں ایم ڈی کے دوران ماہرین فن سے تحقیق کے بنیادی اصول سیکھے، پروفیسر یوسف امین صاحب حفظہ اللہ کی تربیت اور رہنمائی نے آپ کے اس ذوق کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا، تحقیق میں جدید سائنسی معیارات کو بروئے کار لانے پر نہ صرف زور دیتے تھے بلکہ خود اس پر سختی

سے کاربند تھے، آپ کے تحقیقی مضامین اس کے شاہد ہیں۔ اطباء کے اسطوری مزاج، علاج ومعالجہ میں مبالغہ آمیز دعوے، عطائیانہ کلچر، اور غیر سائنسی رجحانات اور تعصّبات کے سخت مخالف تھے اور اپنے اسکالرز کو اس سے بچنے کی ہمیشہ تلقین کرتے تھے۔ طب میں تحقیق کے نئے نئے اصول متعارف کراتے، نئے تجرباتی ماڈلز تیار کراتے، آپ کے زیرنگرانی مقالے اور تھیسسز اس کے گواہ ہیں، اس طرح نئی نسل میں ریسرچ اور تحقیقی ذوق پیدا کر کے آپ نے یونانی طب کو نئی سمت عطا کی۔ آپ کی یہ عظیم خدمت طبی دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی ہے۔

قلم وقرطاس سے جڑے طلبہ کے لیے آپ کی ذات نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ آپ نے اپنے اردگرد کوئی حصار نہیں کھینچا تھا، ہر طالب علم کی رسائی آپ تک آسانی سے ہوجاتی تھی، ہر شخص پر آپ کی توجہ ہوتی بشرطیکہ اسے لکھنے پڑھنے کا شوق ہو۔ طلبہ کی خام صلاحیتوں کو پختہ کرنے، خفتہ لیاقتوں کو بیدار کرنے، انھیں نکھارنے، سنوارنے کا ہنر اور سلیقہ خوب آتا تھا، علمی ذوق رکھنے والے طلبہ آپ سے اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے کسبِ فیض کرتے۔ اس دور میں آپ کو اس میدان میں جو مرجعیت اور مقبولیت حاصل تھی وہ قابل رشک تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ طلبہ کے تحقیقی ذوق کی آبیاری کے لیے آپ نے خود کو وقف کردیا تھا، آپ نہ صرف طلبہ کے تحقیقی مضامین اور تھیسسز کو باریک بینی سے چیک کرتے بلکہ انھیں قابل اشاعت بناتے۔ یونانی طب کی تدریس، ریسرچ اور تحقیق کرنے والوں کے لیے ان کی تحریر کا ایک اقتباس ذیل میں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں، حکیم محمد طیب صاحب پر لکھے گئے اپنے مضمون ''پروفیسر حکیم محمد طیب'' مطبوعہ ''رازیٔ ہند-پروفیسر حکیم محمد طیب''، صفحہ ۹۸-۹۹ میں آپ رقم طراز ہیں:

> ''یہ بات ہمارے ذہن میں رہنی چاہیے کہ یونانی طب کی تدریس وتحقیق اور افہام وتفہیم کے لیے اردو، عربی، انگریزی، فارسی اور ہندی زبان سے آگاہی کے علاوہ منطق وفلسفہ اور کم ازکم ہائی اسکول کے معیار کی سائنس (خاص طور سے باٹنی، زولوجی، کیمسٹری اور بایوکیمسٹری) سے واقفیت اور ایک خاص درجہ کی ذہانت مطلوب ہوتی ہے، اوسط علمی استعداد کے حاملین یا کم ذہین لوگوں کے لیے یہ مضمون نہ صرف مشکل ہے بلکہ خود ان کی شخصیت اور سماج کے لیے باعث مضرت ہوسکتا ہے۔''

یہ تأثرات تو انھوں نے اپنے استاد کے تئیں تحریر کیے تھے، لیکن اس کے مصداق وہ خود تھے۔

آپ کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ مطالعہ کے سلسلے میں طالب علم کی استعداد، پسند وناپسند اور ذوق کا لحاظ رکھتے، جو بھی کتاب پڑھتے اس کا ذکر اپنے قریبی طلبہ سے کرتے اور اظہار خواہش پر وہ کتاب عنایت بھی کردیتے، مجھے یاد ہے کہ جب سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی بھدرک (اڑیسہ) یونٹ میں میری پہلی پوسٹنگ ہوئی تو آپ نے اپنے اردو ادب کے ذخیرے سے خوب صورت انتخاب اور شب خون کے خصوصی شمارے بھدرک بھجوائے۔

آپ کی تربیت وپرداخت، اشراف ونگہداشت نے بہتیرے شاگردوں کو مضمون نگاری، تحقیق وتصنیف کی دنیا سے روشناس کیا۔ افرادسازی کے لیے ہمہ وقت کوشش کا جذبۂ فراواں میں نے استادمحترم کی طرح کسی اور شخص میں نہیں پایا۔ طلبہ کے تئیں آپ کے اخلاص، فکرمندی وکاوشوں نے بہتوں کے کیریر کو بلندیوں سے ہمکنار کردیا، لیکن فروتنی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ کبھی اشارتاً یا کنایۃً بھی اپنے شاگردوں کو احساس نہ ہونے دیا کہ ان کی ترقی یا کامیابی میں ان کا کوئی عمل دخل ہے۔ انھیں اپنی علمیت کا زعم چھو کر بھی نہیں گزرا تھا، علمی مسائل پر اپنے طلبہ سے مکالمے کرتے، طب کے کلیاتی مسائل اور تاریخ طب کے بارے میں اس کم علم سے دریافت کرتے، اس تعلق سے وہ میرے بارے میں بڑے خوش گمان تھے، حالانکہ اپنے مبلغ علم سے میں خوب واقف ہوں، وہ میرے محبوب استاد تھے جواب نہ دینا بھی بے ادبی تھی۔

آپ کے لبوں پر سدا ہلکی ہلکی مسکراہٹ تیرتی رہتی، گفتگو کا انداز نہایت سلجھا ہوا اور متوازن تھا، مزاجاً بذلہ سنج تھے، لیکن ظرافت اور بذلہ سنجی آپ کے چند احباب تک ہی محدود تھی، طلبہ کی مجلس میں کبھی کبھی ظرافت آمیز ادبی جملے ضرور بول دیتے۔ میں نے آپ کی معیت میں کئی سال گزارے مگر کبھی بھی کوئی مبتذل یا معیار سے فروتر گفتگو آپ کی زبان سے نہیں سنی۔ انھوں نے تدریس ومعلّمی کی تقدیس وحرمت پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔

آپ کے عزیز ترین دوست پروفیسر سمیع اختر صاحب کا ایک اقتباس نقل کرنا یہاں مناسب سمجھتا ہوں، آپ استادمحترم کے بارے میں اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں نے بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ کسی نئے اور انجان شخص سے پہلی ملاقات کے دوران ہی ان کی گفتگو کے انداز میں ایسی اپنائیت ہوتی کہ وہ شخص

آپ کا گرویدہ ہوجاتا اوران کو اپنا قریبی دوست اور ہم راز سمجھنے لگتا، ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی اور سب سے بڑا کمال یہی تھا کہ ہر شناسا شخص ان کو اپنا قریبی دوست سمجھتا اور مرحوم بھی اسے کبھی مایوس نہیں کرتے۔''

میں نے آپ کی اس خوبی کا بارہا اور کئی سال تک مشاہدہ کیا، آپ کا ہر شاگرد خود کو آپ کا عزیز ترین شاگرد سمجھتا، اس کی وجہ خلوص وایثار اور دوسروں کے تئیں قربانی کا جذبہ تھا، آپ کا حلقہ نہایت وسیع تھا، ان میں اساتذہ، شاگردان اور احباب سب ہی تھے اور آپ سے مستفید ہونے والوں کی تعداد بھی اتنی ہی وسیع تھی۔ آپ کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے تھا، آپ مشرقی اقدار کے پروردہ تھے، وضعداری، مہمان نوازی اور خوش اخلاقی آپ کے مزاج کا حصہ تھی، گھر پر ہمیشہ مہمانوں کی آمد و رفت رہتی، آپ کا دستر خوان وسیع اور پُرتکلف ہوتا، انواع و اقسام کے کھانوں سے ضیافت کرتے اور خوش ہوتے، ایک یا دو افراد بھی ہوتے تب بھی کھانا پُرتکلف ہوتا۔

آپ ایک مثالی اور مقبول ترین استاد، بہترین انسان، اعلیٰ پایہ کے محقق تھے، اس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، مختلف زبانوں خصوصاً انگریزی اور اردو ادب کے شناور تھے، البتہ انگریزی میں لکھنا زیادہ پسند کرتے تھے اسی لیے آپ کے تصنیفی سرمایہ کا بیشتر حصہ انگریزی میں ہے جو تحقیقی مقالوں اور ریسرچ پیپرز پر مشتمل ہے۔ اردو ادب کا بہترین ذوق تھا، مطالعہ بھی بہت وسیع تھا، خاندانی ماحول میں اردو رچی بسی تھی، اردو میں بھی بہت اچھا لکھتے تھے، حکیم محمد طیب صاحب کا جو خاکہ آپ نے لکھا ہے وہ فنی اور ادبی اعتبار سے اعلیٰ درجے کا ہے۔ یہ خاکہ سلیس و رواں عبارت، محاوراتی وٹکسالی زبان، چبھتے ہوئے ظریفانہ جملے اور حکیم طیب صاحب کی زندگی کے ہر پہلو کو سمیٹے ہوئے ہے جسے دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر اردو میں کچھ اور لکھتے تو اردو ادب میں اہم اضافہ ہوتا۔

اعلیٰ صلاحیتوں اور متعدد زبانوں پر عبور کے باوجود اردو زبان میں آپ کی زیادہ تخلیقات منظر عام پر نہ آسکیں، جس کی ممکنہ وجوہات آپ کی تحقیقی مصروفیات، تدریسی فرائض، علمی رہنمائی کی خاطر اسکالرس کی ہر وقت آمد و رفت، طلبہ کے مقالات ومضامین کی اصلاح وغیرہ تھیں، بامروت اتنے تھے کہ کبھی کسی کو نہ انکار کیا اور نہ ٹال مٹول کی، یہ معمول روزانہ کا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں خواہش کے باوجود تصنیف وتالیف کا وقت کہاں سے ملتا۔

آپ کے احباب کا پیہم اصرار اور طلبہ کی خواہش تھی کہ صیدلہ کی اردو زبان میں ایک مفصل کتاب لکھیں تاکہ طبی کالجز کی نصابی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اس مضمون کے عملی و اطلاقی پہلوؤں سے طلبہ کو روشناس کرایا جاسکے، اس اصرار پر آپ راضی ہوگئے۔ راقم کو یہ سعادت حاصل رہی کہ کتاب کی تیاری کے ابتدائی مراحل کا وہ شاہد رہا ہے۔ سال ۲۰۰۳ء کے اخیر سے ہی آپ نے مواد کی ترتیب کا کام شروع کردیا تھا، ترتیب کا طریقہ یہ تھا کہ عموماً جس موضوع پر کلاس لیتے اس کی تفاصیل لکھ کر مجھے دے دیتے، آپ ان کو برجستہ لکھتے، ایسا لگتا کہ آپ کو ساری تفاصیل ازبر ہیں، میں ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوتا کہ اسی دوران کئی کئی صفحات لکھ کر حوالہ کردیتے، کبھی بول کر بھی لکھوادیتے، بعض عنوانات پہلے سے تیار تھے۔ میں اسے جناب حسنین صاحب سے ٹائپ کرواتا اور پروف خوانی کے بعد آپ کے حوالہ کردیتا۔ سال ۲۰۰۶ء میں سی سی آر یو ایم میں انتخاب کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں میں بھدرک (اڑیسہ) چلا گیا، میرے بعد میرے دو عزیز دوستوں نے یہ ذمہ داری سنبھالی، بہرکیف اس عرصہ میں تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل کتاب تیار ہوگئی، آپ اس کتاب میں مسلسل حذف واضافہ، ترمیم اور قطع و برید کرتے رہے، اسی دوران آپ بنگلور چلے گئے، جس کی وجہ سے تکمیل وطباعت معرضِ التوا میں پڑگئی۔ کمال پسندی کی وجہ سے آخری وقت تک اس میں اضافہ کا سلسلہ جاری رہا اور اس کی ضخامت بھی دوگنی ہوگئی، آپ کی ناگہانی موت کی وجہ سے آپ کی حیات میں یہ کتاب شائع نہ ہوسکی۔ کتاب کے ان صفحات کی میں نے کئی مرتبہ قراءت کی ہے، اس کے موضوعات اور محتویات انتہائی معلوماتی ہیں، آپ نے اصطلاحات کی معیار بندی کی ہے، قدیم سرمایہ کی عظمت کا اعتراف اور اس کی معنویت کا بیان، عصر حاضر میں اس کی اہمیت، تحقیق کے ساتھ تنقید اور اصلاحات، علمی، فنی اور تحقیقی انداز میں نظریات کی توثیق اور تردید، تحریر رواں اور سلیس، ساتھ میں زبان وادب کی چاشنی، بہرحال موضوع کی قدیم وجدید تمام جزوی تفاصیل کو سموئے ہوئے اپنے فن میں لاجواب اور شاہکار کتاب ہے۔

آخر میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں، دنیا سے جانے والے تو تو چلا گیا، اللہ تیری مغفرت فرمائے، تیری خوبیاں، تیری کرم فرمائیاں، تیری یادیں ہمیشہ ہمیں رلاتی رہیں گی۔

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

پروفیسر غفران احمد کے تحقیقی امتیازات

ڈاکٹر وسیم احمد☆

دنیا میں انسانوں کی آمد و رفت کا ایک معمول سلسلہ ہے جو رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ ماضی قریب میں وباء کی ایک قسم کووڈ-۱۹ نے کروڑوں انسانوں کو لقمۂ اجل بنالیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہنستی کھیلتی بستیاں ویران ہوگئیں، خوف کا یہ عالم کہ لوگ اپنے اعزہ واقرباء کے جنازے میں شرکت سے بھی گریز کرنے لگے اور بمشکل اپنے گھر سے باہر نکلتے تھے۔ اس پُر آشوب وبا نے جہاں عام لوگوں کو اپنا شکار بنایا وہیں ایسی شخصیتوں کو بھی سپرد اجل کیا جن کی رحلت نہ صرف ان کے اہل خانہ و دیگر وابستگان کے لیے صدمہ جانکاہ تھی بلکہ ان کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا سے منسلک علوم وفنون بھی بے یار و مددگار ہوگئے۔ چناچہ ایسی ہی شخصیتوں میں یونانی طب کے نقیب پروفیسر غفران احمد مرحوم کی مرجع خلائق ذات بھی تھی جو کورونا کے ہاتھوں سپرد خاک ہوئی۔ یقینی طور پر ان کی مرگ ناگہاں اہلیان طب کے لیے ایک ایسا خسارہ ہے جس کی بھرپائی حال فی الحال میں ممکن نظر نہیں آتی۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم تمام وابستگان طب کے لیے ایک شجر سایہ دار تھے۔ متعلمین و معلمین طب کے لیے آپ کا بیش قیمتی وقت صرف ہوتا۔ لوگوں کی خیرخواہی، خیراندیشی اور بھلائی کے لیے برابر فکرمند رہتے۔ آپ کے مزاج میں کسی کے لیے 'نا' نہیں تھا۔ آپ حلقہ طب کی نہ صرف علمی معاونت کرتے بلکہ ان کی معاشی، سماجی، عائلی اور فکری ترقی کے لیے بھی کوشاں رہتے۔ ان کے پاس اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے بالکل وقت نہیں رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہر بڑے آدمی کا وقت اور ان کی ذاتی مصروفیات قوم وملت کے لیے امانت ہوتی ہیں جیسا کہ مولانا آزاد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب ان کی شادی ہوئی تو انھوں نے اپنی رفیقۂ حیات سے اپنے تیار کردہ اصولوں کے مطابق ڈھلنے کے لیے کہا اور شاید وہ اس میں ڈھل بھی گئیں۔ مولانا جب احمدنگر میں اسیر زنداں تھے تو ان کی اہلیہ کی روح راہی جنت ہوگئی اور وہ ان کی تجہیز وتدفین میں بھی شامل نہ ہوسکے۔ کم وبیش پروفیسر غفران صاحب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اپنے طلبہ کے ساتھ دو، دو، تین، تین بجے رات تک ان کے ریسرچ کے کاموں کے لیے بیٹھے رہتے۔

استاد محترم شرافت، جذبہ ایثار، انکساری وعاجزی، حلم وبردباری اور نہ جانے ایسے کتنے دیگر اوصاف حمیدہ سے متصف تھے۔ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ جالینوس کی وضع کردہ مزاجی تقسیم میں مزاج معتدل حقیقی سے موجودہ زمانے میں اگر کسی کی ذات قریب تر نظر آتی ہے تو وہ استاد محترم کی ذات اقدس تھی۔ استاذ محترم سے مجھے یو جی میں تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ ان کے پڑھانے کا معیار اتنا بلند اور معروضی ہوتا تھا کہ کم استعداد کی بنا پر تتبع کرنا آسان نہیں تھا۔ میں نے شعبہ کلیات و علم الامراض، اجمل خان طبیہ کالج سے پوسٹ گریجویشن کی تعلیم حاصل کی۔ جب میری تعلیم مکمل ہوگئی تو میں نے بزبان انگریزی ایک مضمون لکھا۔ سر سے میں نے نظر ثانی کے لیے کہا، سر نے بخوشی اس کی اصلاح وتصحیح کردی۔ یو جی کے بعد سر سے یہ میرا پہلا ذاتی تعارف تھا۔ غالباً ۲۰۰۹ء کی بات ہے، اس وقت میں قرول باغ طبیہ کالج میں تدریس سے وابستہ تھا۔ ایک دن میں مع اہل وعیال نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر تھا، اچانک سر کہیں سے نمودار ہوئے، پوچھا وسیم کہاں کا سفر ہے۔ میں نے کہا 'سرعلی گڑھ'، پھر ان کی نظر میری اہلیہ اور بچوں پر پڑی، فوراً اپنی جیب سے کچھ پیسے نکالے اور دے کر کہا کہ ان کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان لے آؤ۔ سر کے ساتھ سفر کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا جو نہایت ہی مختصر مگر بہت متأثر کن تھا۔ اس کے بعد

☆اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ کلیاتِ طب، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور، کرناٹک۔ E-mail:drwasimkulliyat@gmail.com، Mob.No:7204750516۔

میں قرول باغ سے بنگلور آ گیا۔ مجھ سے وہ اور زیادہ شفقت ومحبت کا اظہار کرنے لگے۔ یہ تعلق کیوں رکھتے تھے یہ تو میں نہیں جانتا لیکن وہ میرے لیے ہمیشہ فکرمند رہتے۔ جب بھی بنگلور آتے پیشگی اطلاع کرتے اور واپس علی گڑھ پہنچنے کے بعد اپنی خیریت سے ضرور باخبر کرتے۔

استاذ محترم سے میری آخری ملاقات ۲۰۱۹ء میں ہوئی تھی جب وہ پروفیسر ملک محمد وامق امین اور پروفیسر تنزیل احمد کی معیت میں بنگلور تشریف لائے تھے۔ میں نے سر سے اس وقت درخواست کی تھی کہ آپ میرے گھر پر عشائیہ کے لیے تشریف لے چلیں۔ لیکن وہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور وقت کی قلت کی وجہ سے اس وقت نہ آ سکے، البتہ یہ وعدہ کیا کہ آئندہ جب بھی بنگلور آؤں گا تو میں تمھارے گھر ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن یہ ان کا ایسا وعدہ تھا جو اب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ ؎

فقدناك فِقْدَانَ السحابة لم يزل
لها أثر يثني به السَهْلُ والوعرُ
مَساعيكَ حَلىٌ لِلَّيالي مُرَصَّعٌ
وذِكرُكَ في أَرادنِ ايامها عِطْرُ

ترجمہ: ''ہم نے مینہ برسانے والے بادل کی طرح آپ کو کھو دیا، جس کے نیک اثرات کی مدح سرائی وادی کے نشیب وفراز سبھی کرتے ہیں۔ آپ کی کوششیں راتوں میں جڑے زینت کے نگینے ہیں اور مرور ایام کے ساتھ آپ کی یادوں کی خوشبو مزید تیز ہوتی ہے۔''

میرے ساتھ آپ کی خوردنوازی اور شفقت اس حد تک تھی کہ میرے ایک ہم سبق رفیق کے سامنے کہنے لگے کہ وسیم میرا شاگرد ہے، این آئی یو ایم میں اس سے میری ملاقات ہوئی اور اس سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔ اس قدر محبت کا اظہار کوئی عظیم المرتبت آدمی ہی کر سکتا ہے۔ مجھے جب بھی کوئی مشورہ درکار ہوتا، کوئی مسئلہ درپیش ہوتا، کوئی ضرورت محسوس ہوتی تو آپ ہمیشہ میرے لیے ایک عظیم ستون کی حیثیت سے تھے، جواب نہیں رہے۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ عربی کے یہ اشعار ان کی مفارقت کی عکاسی کے لیے پیش ہے: ؎

فِي ذِمَّةِ اللّٰهِ ما ألقىٰ وما أجِد
أهٰذِهِ صَخْرَةٌ أم هٰذِهِ كَبِدٌ
قد يَقْتُلُ الْحُزنُ مَنْ أحْبَابُهُ بَعُدُوا
عنه فكيف بِمَن أحْبَابُهُ فُقِدُوا

ترجمہ: ''جو رنج والم مجھے ملا ہے اسے میں اللہ کی امان میں دیتا ہوں، کیا یہ چٹان ہے یا یہ جگر ہے، احباب کی دوری کا غم ہی قاتل ہوتا ہے تو ان کا کیا حال ہوگا جن کے احباب ان سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ہوں۔

مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ غبار خاطر میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''جہاں تک طبیعت کی سیرت اور عادات وخصائل کا تعلق ہے میں اپنی خاندانی اور نسلی وراثت سے بے خبر نہیں ہوں۔ ہر انسان کی اخلاقی اور معاشرتی صورت کا قالب نسل وخاندان کی مٹی سے بنتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ میری عادت وخصائل کی مٹی بھی اسی مٹی سے بنی ہوئی ہے۔ ہر خاندان اپنی روایتی زندگی کی ایک انفرادیت پیدا کر لیتا ہے اور وہ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں صاف محسوس کرتا ہوں کہ اس روایتی زندگی کے اثرات میرے خمیر میں رچ بس گئے ہیں اور میں ان کی پکڑ سے باہر نہیں جا سکتا۔ میری عادت وخصائل، چال ڈھال، طور طریقہ، امیال و اذواق سب کے اندر خاندان کا ہاتھ ہے جو صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔ یہ خاندانی زندگی کی روایت مجھے میرے ددھیال اور ننیہال دونوں سلسلوں سے ملی اور دونوں پر صدیوں کی قدامت اور تسلسل کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بہر حال میرے حصہ میں آنی تھی ان کے قبول کرنے میں یا نہ کرنے میں میری خواہش وپسند کا کوئی دخل نہ تھا۔''

مولانا آزاد کی طرح پروفیسر غفران احمد مرحوم کا خاندان بھی کچھ خصوصیات اور اچھی روایتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ استاد محترم کے دادا شاہ حامد حسین کا گھرانا نہایت دیندار اور سیرت ساز تھا۔ اس گھرانے میں کردار ڈھلتے تھے، وضع داری پروان چڑھتی تھی، اخلاق کریمانہ، حسن کردار، جود وسخا، مہمان نوازی ان کے نمایاں

وصف تھے۔ گاؤں کے لوگ ان کی بڑی عزت وتوقیر کرتے تھے، گاؤں کے ملی و سماجی مسائل میں ان کا بڑا عمل دخل تھا، یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے سماجی معاملات میں ان کا فیصلہ قول محکم ہوتا تھا اور ہر شخص اسے راضی بہ رضا قبول کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ انھیں ادب سے قاضی صاحب پکارتے تھے۔ ظاہر ہے اسی ماحول میں پروفیسر غفران احمد کی پرورش و پرداخت ہوئی تھی۔ بچپن کی چیزیں آپ نے دادا اور والدین سے اخذ والتقاط کی تھیں۔ اس کو جوانی اور اس کے بعد تک اپنے حسن کردار اور قول لین سے اساتذہ وطلبہ کے مابین بکھیرتے رہے۔ آپ بے حد شیریں کلام تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ آپ کی زبان میں شہد ہے، گفتگو میں شائستگی اور نرمی کچھ اس طرح تھی کہ ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔'' ان کا صاف ستھرا لباس، ان کی نفاست اور ذوق لطیف کا آئینہ دار تھا۔ وہ علم واخلاق کی بلند ترین چوٹی پر فائز تھے اور خوش مذاق انسان تھے۔ اقبالؔ نے سچ کہا تھا ''شعلۂ حیات دوسروں سے مستعار نہیں لیا جاسکتا ہے، وہ صرف اپنی روح کے آتش کدہ میں روشن کیا جاسکتا ہے۔''

راہ دیکھا کرے گا صدیوں تک
چھوڑ جائیں گے یہ جہاں تنہا

پروفیسر غفران احمد مرحوم کو اللہ تعالی نے بیک وقت کئی خوبیوں سے نوازا تھا۔ اردو اور انگریزی زبانوں پر آپ کو قدرت کاملہ حاصل تھی۔ تاہم اظہار بیان کے لیے اکثر و بیشتر آپ انگریزی زبان کو ترجیح دیتے تھے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ فی زمانہ انگریزی زبان کو سائنٹفک اظہار کے لیے زیادہ موزوں اور مونس قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کے صد فی صد مقالات ریسرچ وتحقیق سے جڑے ہوئے ہیں۔ لٹریری ریسرچ میں آپ کو دلچسپی کم تھی۔ اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک تو آپ کا اختصاص شعبہ علم الادویہ سے تھا جس میں فارماکوگنوسی، فارماکولوجی، فارمیسی، فائٹوکیمسٹری، فائٹوفارماسیوٹیکلس، ریورس فارماکولوجی، پولی فارماکولوجی، مارفوٹیکسونومی وغیرہ ہیں۔ اس میں ریسرچ وتحقیق کا طریقۂ کار پری کلینکل بنیادوں پر ہے۔ دوسری وجہ جو آپ کی خواہش تھی کہ طب کو کسی طرح جدید دنیا کے سامنے بہتر طور پر متعارف کرادیں۔ اسی وجہ سے آپ کی ریسرچز متواتر طور سے معیاری اور معتبر جرائد ومجلّات میں شائع ہوتی تھیں لیکن دو سال قبل آپ نے کلیات گائیڈڈ کانفرنس کا انعقاد کرکے اپنا ارادہ ظاہر کردیا تھا اور طب میں ریسرچ و تحقیق طبی اصول وقوانین کی بنیادوں پر چاہتے تھے۔ اس طرح آپ طب میں نئے امکانات کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ میں نے مرحوم سر سے کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ طب میں کلیات لائق اعتنا نہیں ہیں۔ اخلاط اور مزاج سے تو ہم لوگ بھی واقف ہیں۔ اس پر مرحوم کا جواب نہایت مثبت اور معنی خیز تھا کہ 'طب میں پڑھنے کا اصل مضمون تو کلیات ہی ہے، جس سے نہ صرف طب کی شناخت باقی رہے گی بلکہ اس کی مدد سے امکان کے نئے باب وا ہوں گے۔ اس کے علاوہ پروفیسر مرحوم نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن سے بحیثیت پروفیسر وابستہ ہونے کے بعد ریسرچ وتحقیق میں کلیات کو بھی برتتے رہے۔ انھوں نے اپنی تحقیقات میں نہ صرف مرکب سالمات کی تجزیہ وتحلیل پیش کی ہیں بلکہ کلیاتی اصول و قوانین کی روشنی میں اطباء کے ذریعہ ذکر کردہ افعال ومحل استعمال کا بھی جائزہ لیا ہے۔ آپ نے یہاں سے جانے کے بعد ریسرچ کے اس منہج کو علی گڑھ میں بھی جاری رکھا۔ مناسب تو یہ تھا کہ مضمون ہذا میں ان کے تمام تر شائع شدہ مقالات کی روشنی میں ان کے تحقیقی منہج کا جائزہ لیا جاتا لیکن چونکہ ایسا کرپانا ایک وقت طلب امر ہونے کے ساتھ ساتھ صفحات کی ضخامت کا بھی متقاضی ہے لہٰذا اپنی حد بندیوں کا لحاظ کرتے ہوئے یہاں پر NIUM میں ان کے زیر نگرانی ہوئے کاموں کے جائزے پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن میں قیام کے دوران پروفیسر غفران احمد کے ماتحت چار طبی ادویاتی تحقیقات ہوئیں، جس میں پہلا کام سلیٰ جبیں وائی کا تھا، جن کے ریسرچ کا عنوان "Evaluation of nephroprotective effect of Khurfa in chemically induced nephrotoxicity" تھا۔ اطباء نے خرفہ کو قابض، حابس، مدمل قروح، مبرد، مدر، مقوی گردہ قرار دیا ہے اور دافع تعفن ہونے کی بنیاد پر شدائد بول، التہاب گردہ ومثانہ اور احتباس بول میں استعمال کرنے کی سفارش کی ہے۔ فاضل محقق نے انہیں بنیادوں پر اس کی پری

کلینکل اسٹڈی البینو ریٹس میں کرائی۔ چونکہ محافظ گردہ اثرات رکھنے والی بہت سی ادویات کا اس سے پہلے مطالعہ کیا جا چکا ہے لیکن ابھی تک کسی Standard محافظ گردہ دوا کی مستقل شناخت نہیں ہوسکی تھی، اس لیے اس ریسرچ میں کوئی Standard گروپ نہیں بنایا گیا۔ گردہ کی Toxicity کو خون میں بڑھے ہوئے مختلف حیاتیاتی مارکرس مثلاً سیرم کریٹنین، بلڈ یوریا اور پیشاب میں البیومن کے کثرت ارتکاز سے دیکھا گیا، Acute Nephrotoxicity پیدا کرنے کے لیے انجکشن Gentamicin دیا گیا اور مزمن کلیہ کے لیے انجکشن Doxorubicin کا استعمال کیا گیا، گروپ A اور گروپ B میں تحفظی تدابیر کے طور پر، انجکشن Gentamicin کے دینے سے پہلے تخم کرفس ۲۳۰ ملی گرام فی کلوگرام کے مطابق دیا گیا، اس علاج سے سیرم کریٹنین میں کمی آئی، پیشاب میں بڑھے ہوئے البیومن کے ارتکاز میں کمی دیکھی گئی، البتہ بلڈ یوریا میں کوئی کمی نہیں آئی۔ Pre-treated test group B میں تخم کرفس ۳۹۰ ملی گرام فی کلوگرام کے مطابق دیا گیا اور بلڈ یوریا، سیرم کریٹنین اور پیشاب میں البیومن کے ارتکاز میں کمی پائی گئی، اس سے یہ نتیجہ بآسانی نکالا جاسکتا ہے کہ ٹیسٹ ڈرگ کا اثر Dose dependent یعنی مقدارِ خوراک پر منحصر ہے۔ اس کے برعکس Post-treated گروپ A اور B جس میں معالجاتی پہلو سے گفتگو ہے اور اس کا تقابل Plain گروپ سے کیا گیا ہے، اس گروپ کو انجکشن Gentamicin دینے کے بعد ٹیسٹ ڈرگ دی گئی، جس کے نتیجہ میں بلڈ یوریا اور سیرم کریٹنین دونوں مارکرس میں کمی آئی، البتہ پیشاب میں البیومن پر معمولی اثرات تھے۔ اس مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ٹیسٹ ڈرگ مؤثر ہے۔ اس کے علاوہ اس کی دونوں مقدار خوراک معالجاتی نقطۂ نظر کے بالمقابل تحفظی نقطۂ نظر سے زیادہ مؤثر اور کارگر ہیں جیسا کہ اوپر کے بیان سے واضح ہے۔ درحقیقت ٹیسٹ ڈرگ میں بہت سارے حیاتیاتی محرک اجزاء مثلاً فینولس، بیٹا کیروٹین، الکلائیڈس، گلائکوسائڈس، ایسکاربک ایسڈ اور اومیگا فیٹی ایسڈ پائے جاتے ہیں جو دوا کے اثرات کو صادر کرنے میں اپنا مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ فینولک الکلائیڈس مثلاً Oleracin اے، بی، ای خصوصیت کی بنیاد پر 1,1-diphenyle-2-Picryl-hydroxyl radical کی غلاظت کو اعضاء سے پاک کرتے ہیں کیونکہ اس کے اندر ایک مضبوط Scavengering activity radical Superoxide پائی جاتی ہے، جو اعضاء میں موجود فاسد مادوں کے اجتماع کو روکتی ہے، اس کے علاوہ یہ دوا Hydrogen peroxide induced Lipid peroxidation کو بھی روکتی ہے۔ نیز اس کے اندر Caffeic acid بھی پایا جاتا ہے جو بیک وقت بہت ساری خصوصیات مثلاً Antiinflammatory، Antihypercholesterolemic، Antioxidant اور Antiperoxidant activity کا حامل ہیں۔ موجودہ مطالعہ میں بہت سارے گروپس مثلاً Curative، Preventive اور Concomitant بنائے گئے، البتہ کوئی Standard گروپ نہیں تھا کیونکہ اس وقت Prototype Nephroprotective گروپ دستیاب نہیں ہوسکا، اس کمی کی بھرپائی کے لیے اتنے سارے گروپ بنائے گئے جس سے اس مطالعہ کا مقابلہ ومقارنہ بآسانی ممکن ہوسکے، اطباء تحفظ اور بحالی قوت سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اعضاء اپنی ساخت اور ترکیب کے اعتبار سے درست رہیں جس کے نتیجے میں ان سے صادر ہونے والے افعال بھی درست رہیں گے، کیونکہ اس صورت میں اعضاء میں فاسد مادوں کا اجتماع نہیں ہوگا۔ گویا کہ تحقیق یہ ثابت کرنے میں کامیاب ٹھہری کہ فری ریڈیکلس جو درحقیقت گردے میں فاسد مادوں کے اجتماع کا سبب ہیں اور اعضاء کو نقصان پہنچاتے ہیں، ٹیسٹ ڈرگ میں پائے جانے والے مدر اور دیگر خواص ان کو زائل کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

اس سلسلے کی دوسری تحقیق "Evaluation of anti ulcer effect of Tukhme kishneez in experimental animals" تھی، جس پر ڈاکٹر شگفتہ نکہت نے کام کیا تھا۔ یونانی طب میں قرحہ معدی واثنا عشری کی نسبت سے بہت سی مفرد ومرکب ادویہ کا تذکرہ ملتا ہے لیکن ان میں سے بیشتر کے فارماکولوجیکل اثرات وافادیت کا جائزہ نہیں لیا جاسکا ہے، تخم کشنیز بھی ان میں سے ایک ہے، البتہ اس کا قرحہ معدی کی خصوصیت کو بنیاد بنا کر

بہت سے تجرباتی ماڈل کے ذریعہ تجربہ کیا گیا ہے،لیکن Stress induced model کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے، اطباء کے یہاں یہ دوا بہت سے امراض معدہ مثلاً حموضت معدی، قرحہ معدی، نفخ شکم، اپھارہ، جلن، سہر، اضطرابِ نفسانی میں مستعمل ہے۔ موجودہ تحقیق میں مخدر، منوم، مانعِ اضطراب جیسی تاثیرات سے مماثلت کی بنیاد پر Cold and restraint Water immersion induced اور Chemically (Aspirin) induced gastric ulcer models کو بنیاد بنا کر قرحہ معدی میں اس دوا کا تجربہ کیا گیا۔ٹیسٹ ڈرگ کو دو مختلف مقدار خوراک پر curative اور preventive اثرات کا جائزہ لینے کے لیے اینملس کے مختلف گروپس مثلاً پلین کنٹرول گروپ، نگیٹیو کنٹرول گروپ، پری اینڈ پوسٹ ٹریٹیڈ ٹیسٹ گروپس، (A&B) اور اسٹینڈرڈ گروپ بنائے گئے، اس کے علاوہ دو پیرامیٹرس مثلاً Ulcer score اور Ulcer index کے ذریعہ anti-ulcerogenic اثرات کا جائزہ لیا گیا، Single dose کی مدد سے ulcer score اور ulcer index میں کافی کمی پائی گئی، جب کہ دوا کے double dose کی مدد سے اس سے بھی بہتر نتائج برآمد ہوئے، پلین کنٹرول گروپ میں کوئی اہم پیش رفت نہیں ہوئی، اسی طرح pre-treated test گروپ A میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں پائی گئی، preventive regimen میں دوا کی زیادہ مقدار خوراک ہی مؤثر ثابت ہوئی، جو اسٹینڈرڈ ڈرگ کے بالکل مساوی تھی۔ البتہ post-treated گروپ میں ٹیسٹ ڈرگ کی دونوں خوراک مؤثر ثابت ہوئیں،ٹیسٹ ڈرگ کے ذریعہ curative group میں نتائج کو اسٹینڈرڈ ڈرگ کے بالکل مساوی دیکھا گیا۔موجودہ مطالعہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ دوا کی زیادہ مقدار خوراک معالجاتی نقطہ نظر سے زیادہ مفید اور زیادہ کارگر ہے، مستقبل میں اس کے maximum higher dose کا بھی مطالعہ کیا جانا چاہیے جس سے کہ اس کی زود تاثیر مع بے ضرر تعین ہو، لیکن aspirin induced ulcer میں ٹیسٹ ڈرگ صرف معالجاتی گروپ میں مؤثر پائی گئی ہے جب کہ protective group میں یہ کوئی خاص اثر نہیں دکھا سکی۔ فارماکولوجیکل سالمات مثلاً Unsaturated fatty acids اور quercetin کی وجہ سے یہ دوا محافظ معدہ ہے نیز یہ دونوں سالمات ایک دوسرے کے لیے synergestic اثرات رکھتے ہیں۔quercetin دافع التہاب ہے، کیونکہ یہ lipoxygenase کو سست رو بنا کر leukotrienes کے اخراج کو بند کر دیتا ہے، اس کے علاوہ یہ سالمہ mucous، flavonoids: flavones & flavonols، bicarbonate اور prostaglandin کے اخراج کو بڑھا دیتا ہے جس سے کہ معدہ کی ساخت محفوظ (cytoprotective) ہو جاتی ہے، چونکہ تخم کشنیز میں اینٹی آکسیڈینٹ خصوصیت پائی جاتی ہے اس لیے یہ reactive stress کو کم کر کے ہسٹامین کو کم کر دیتا ہے جس کی وجہ سے ایسڈ کا اخراج بھی کم ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ یہ مدمل قروح ہونے کی وجہ سے stress سے پیدا ہونے والے زخم کو بھی مندمل کر دیتا ہے۔

تیسری تحقیق جو پروفیسر غفران احمد مرحوم کے زیرنگرانی انجام پذیر ہوئی وہ ڈاکٹر شبیر احمد پرّے کی تھی، جس کا عنوان "An experimental study of *Tukhme Sudab* to evaluate its efficacy in diet induced hyperlipidimia and atherosclerosis in rabbits" تھا۔فرط تدسم دم، تصلب شرائین کے لیے بنیادی سبب مانا گیا ہے جس کے اسباب میں LDL کا اپنے تناسب سے متجاوز ہو جانا ہے۔ یونانی طب میں سداب کی بڑی اہمیت بتائی گئی ہے، یہ ملطف، مفتح، محلل اور مدر ہونے کی حیثیت سے متعدد امراض مفید پایا گیا ہے۔ یہ اپنے انھیں افعال کی بنیاد پر دسومتِ دم، سمن مفرط، تصلبِ شرائین وغیرہ میں تجرباتی طور پر مفید پایا گیا ہے۔ زیرنظر تحقیق میں دوا کی مذکورہ افادیت کی تصدیق کی گئی اور یہ پایا گیا کہ اس میں موجود کیمیاوی اجزاء مثلاً rutin، quercetin، furanocumarins، lemonins اور دیگر flavonoids کی بنیاد پر اس میں دافعِ تصلب، دافعِ فربہی، دافعِ فرط تدسم فی الدم، دافعِ تصلب شرائین خواص پائے جاتے ہیں۔تخم سداب اپنی ملطف خصوصیت کی بنیاد پر فاسد مواد کو رقیق بنا کر تحلیل کرتا ہے، مفتح خصوصیت کی وجہ سے شرائین کے lumen کو کشادہ کر کے اخلاط کے دباؤ کو کم

کرتا ہے، محلل خصوصیت کی بنا پر ان مادوں کو تحلیل کر دیتا ہے جو plaques بنانے میں معاون ہوتے ہیں، مدر خصوصیت کی بنا پر فاسد مواد کو جسم سے باہر نکالتا ہے۔ اطباء کا یہ میکانیہ جدید سائنس سے کافی مطابقت رکھتا ہے کیونکہ rutin اور quercetin دونوں دافعِ التہاب اور مانعِ تکسید ہیں۔ دافعِ التہاب ہونے کی وجہ یہ تمام التہابی مارکرس مثلاً histamine، serotonin اور prostaglandin کو کم کرتا ہے، نیز مانعِ تکسید ہونے کہ وجہ سے یہ اعضاء کی غلاظت کو پاک کرتا ہے۔ تخم دم میں calcification اور condrocytes کا بننا خطرناک مانا جاتا ہے۔ تخم سداب اسے بھی کم کرتا ہے نیز یہ خون میں HDL کی سطح کو بھی بڑھاتا ہے۔ کولسٹرول کی زیادتی اور پیدا ہونے والے بہت سارے فری ریڈیکلس کو یہی HDL کم کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں تخم سداب TGL، LDL، VLDL کی سطح کو بھی کم کرتا ہے۔ اس تحقیق کا امتیاز یہ تھا کہ ماڈل میں Plaques بنا کر Dye سے اس کو پہچاننا تھا جو یونانی طب کے لیے اپنی نوعیت کا پہلا قدم تھا۔

اس سلسلے کی چوتھی تحقیق ڈاکٹر تبارک حسین کی ہے، جن کے مقالے کا عنوان "Evaluation of Lithotriptic activity of *Tukhme Karafs* in experimental animals" تھا۔ یونانی میڈیسن میں مستعمل ادویات عام طور سے مزاج یا اپنی مخصوص خصوصیت کی بنا عمل کرتی ہیں مثلاً مفتتِ حصات قسم کی دوا ایک خاص درجہ میں حرارت لیے ہوتی ہے جو کسی بھی قسم کے پیدا ہونے والے حصات کو ان کے تکوینی مراحل میں ہی تحلیل کر دیتی ہے کیونکہ شدید حرارت ان کے جوہر کو مزید سخت بنا کر حصات کا سبب بنتی ہے، اس زاویہ سے تخم کرفس دوسرے درجہ میں گرم خشک ہے۔ اطباء نے اسے تنہاء و دیگر ادویات کے ساتھ استعمال کرایا ہے لیکن اس سے متعلق کوئی سائنٹفک رپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے فاضل محقق نے اس پر تجرباتی ریسرچ کرائی جس سے کہ یونانی اطباء کے دعوؤں کو مزید تقویت مل سکے، کہ تخم کرفس ایک بہترین قسم کا مفتتِ حصات ہے۔ اس کے لیے دو تجرباتی ماڈل بنائے گئے جس میں سے ایک ماڈل سے اس کا مُدر اثر دیکھا گیا، چوہوں کے مثانے میں Zinc Disc کی تنصیب کی گئی، حصات Zinc Disc کے اردگرد جمع ہوگئے جو طبعاً کیلیشیم آکزیلیٹ قسم کے تھے۔ جب اس کا مقابلہ نگیٹو کنٹرول گروپ سے کیا گیا تو ٹیسٹ ڈرگ کے استعمال کے بعد شماریاتی تجزیہ کے مطابق حصات کے سائز میں کافی کمی دیکھی گئی۔ جب کہ اسٹینڈرڈ ڈرگ سسٹون کے استعمال سے سائز میں بہت زیادہ کمی نہیں آئی، البتہ نگیٹو کنٹرول گروپ کے مقابلہ میں سائز میں کافی کمی تھی، لیکن تخم کرفس کے دونوں خوراک (سنگل اور ڈبل) کے استعمال سے حصات کے وزن اور سائز میں کافی کمی پائی گئی، مجموعی طور سے اسٹینڈرڈ ڈرگ کی افادیت ٹیسٹ ڈرگ کی افادیت کے قریب قریب مثلاً سائز میں کمی یعنی ۶۱ رفیصدی اور ۶۵ رفیصدی بالترتیب تھی، جب کہ ٹیسٹ ڈرگ کی زیادہ مقدار خوراک (higher dose) سے نتیجہ کافی امید افزا تھا اور حصات کے سائز میں ۸۲ رفیصد کمی پائی گئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ٹیسٹ ڈرگ حصات کے سائز اور وزن کو کم کرنے میں سسٹون سے کافی بہتر ہے اس کے علاوہ ٹیسٹ ڈرگ کی زیادہ مقدار خوراک کم مقدار خوراک کے بالمقابل زیادہ مؤثر ہے، گرچہ تخم کرفس کی دونوں مقدار خوراک سسٹون کے استعمال سے زیادہ بہتر اور مؤثر پائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ نگیٹو کنٹرول گروپ میں مثانہ کے انسجہ کے histopathological examination میں حاد اور شدید قسم کی تبدیلی پائی گئی، جب کہ کنٹرول اور ٹیسٹ ڈرگ گروپ میں مذکورہ علامات کافی کم تھیں یعنی زخم مندمل ہو چکے تھے۔ مثانہ میں ورم اور حاد قسم کی تبدیلی کی بنیادی وجہ Zinc Disc کی تنصیب اور اس کے اردگرد جمع ہونے والے حصات تھے۔

تخم کرفس محلل اور مدر خصوصیت کی بنیاد پر مانع تکوین حصات کلیہ ہے۔ کلیہ کے histopathological examination میں کنٹرول گروپ A اور کنٹرول گروپ B میں جو تھوڑی بہت بہتری پائی گئی وہ auto-healing کے نتیجہ میں تھی، جب کہ کنٹرول اور ٹیسٹ ڈرگ گروپ میں ورم قریب قریب ٹھیک ہو چکے تھے۔ ٹیسٹ ڈرگ چونکہ مفتت اور محلل خصوصیت کی حامل ہے اس لیے یہ حصات کا وزن اور سائز کم کرنے کے ساتھ ساتھ crystalluria کو بھی کم کرتی ہے۔ Animals کا وہ گروپ جنھیں دس دن تک کیمیکل دیا گیا اس کے نتیجہ میں Calcium oxalates پیدا ہوئے لیکن ٹیسٹ ڈرگ کی وجہ سے حصات کے

اجزاء ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوکر پیشاب کے راستہ گزر گئے۔ علاوہ ازیں standard group، ٹیسٹ گروپ A اور ٹیسٹ گروپ B کا مقابلہ جب پلین کنٹرول گروپ سے کیا گیا تو ان کے پیشاب میں Sodium chloride کی مقدار زیادہ پائی گئی۔ اس سے تخم کرفس کی Saluretic activity کا بھی پتہ چلتا ہے جو اس دوا کے مدر اثرات کی وجہ سے پائی گئی۔ اس کے علاوہ یہ دوا اپنی مدر خصوصیت کی وجہ سے Lithotriptic activity کی بھی حامل ہے جس کے ثبوت میں کچھ ادویات مثلاً *Ammi visnaga*, *Aerva lanata*, *Raphanus sativus*, *Zea mays*, *Vedippu chunnam* وغیرہ بھی اپنے مدر اثرات کی وجہ سے مفتت حصات ہیں، یہ مطالعہ یونانی میڈیسن کے اطلاقی قوانین کی توثیق کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مدرات مفتت حصات بھی ہیں۔ ایلوپیتھی میں Thiazides عام طور پر Urolithiasis کے لیے Hypocalciuric effects کی وجہ سے مستعمل ہیں۔

Glycosaminoglycans نظام بول کو حصات سے محفوظ رکھتا ہے اگر کسی وجہ سے متاثر ہوجائے تو جراثیمی عمل کے نتیجہ میں stone nidus پیدا ہوجاتا ہے اس طرح یہ حصات کی تکوین کے لیے پیش خیمہ ہے۔ نیز کچھ ادویات مثلاً Arctium lappa، Andrographis paniculata، Equisetum arvense وغیرہ Anti-lithogenic effects کی حامل ہیں۔ کیونکہ یہ کلیہ میں بننے والے microcalculus کو اپنے antiseptic activity کی وجہ سے روکتے ہیں، مذکورہ ٹیسٹ ڈرگ بھی اسی خصوصیت کی حامل ہونے کی وجہ سے Anti-lithogenic effect رکھتی ہے۔ جیسا کہ طب میں تخم کرفس کو دافع تعفن اور محلل ورم بتایا گیا ہے۔ Phycocyanin ایک مشہور Antioxidant effect کی وجہ سے یہ دوا anti-urolithiatic effect کی حامل ہے اور اسی وجہ سے یہ دوا Calcium oxalates کے سائز اور وزن کو کم کرتی ہے۔ anti-urolithiatic effect کی بنیادی وجہ دو pharmacological مرکب سالمات مثلاً 7-hydroxy2',4',5'-trimethoxyisoflavone اور 7-hydoxy-4'-methoxy isoflavone جسے animal rats کے مطالعہ کے دوران Heart wood of Eysenhardtia polystachya سے اس کا extract الگ کیا گیا، اس extract کے استعمال کی وجہ سے animal rats میں حصات کا سائز کافی کم ہوا، تخم کرفس میں بھی دیگر flavonoids کے ساتھ مذکورہ دونوں سالمات پائے جاتے ہیں۔ ان سالمات کو تخم کرفس سے isolate کیا جائے اور Lithotriptic activity کا جائزہ لیا جائے۔ اس کے علاوہ اس دوا میں دیگر بہت ساری کیمیاوی اجزاء مثلاً Lupeol, triterpene, anthraquinones وغیرہ پائے جاتے ہیں جو Calcium oxalate, carbonate, phosphate, uric acid کے حامل خصوصیات کی بنیاد پر حصات کے خلاف مؤثر ہیں۔

ان تحقیقات میں پروفیسر موصوف نے شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ دوا کے اثرات کے تجزیہ کے لیے محکم تحقیقی خاکہ بنایا جائے جس کی مدد سے تاثیرات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے اور اس کی روشنی میں ان کا بالاستیعاب تجزیہ و تحلیل کیا جائے۔ موصوف کی نظر مقویات پر گہری تھی اس وجہ سے مقوی گردہ کی جو بحث انھوں نے ان مقالوں میں کی ہے وہ نہ صرف پڑھنے کے لائق ہے بلکہ یونانی طب کے ہولسٹک زاویہ کو سمجھنے کی ایک بہترین کوشش بھی ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر موصوف نے ادویہ کی ریسرچ و تحقیق میں جس طرح طب کے تمام انضباط کو برتا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ ریسرچ کے تقعید اور انضمام کیا ہیں؟ نیز قدیم و جدید طبوں کا انطباق کیونکر ممکن ہے؟ کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ وہ طالبان طب کے لیے ایک مشعل راہ ہے۔ آخر میں اللہ رب العزت سے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بشری خطاؤں اور لغزشوں کو درگزر فرمائے، حسنات کو قبول فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

تنہا تھا جو صحرا میں مسافر کا سہارا
چڑیوں کو بہت آس تھی اس بوڑھے شجر سے

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

جس کی کتاب زیست کا ہر اک ورق گلاب تھا

ڈاکٹر وسیم احمد ☆

فغاں کہ گشت نیوشندہ سخن خاموش
دگر چہ گونہ تسلی کنم من ایں لب و گوش

استادمحترم پروفیسر غفران احمد صاحب سے میری ملاقات ۱۱/اپریل ۲۰۲۱ء کو ان کے گھر پر ہوئی تھی، احساس ہی نہیں ہوا کہ یہ ان سے میری آخری ملاقات ہے۔ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ آج بھی یاد ہے۔سر کی خصوصیت تھی کہ ہمیشہ خوش رہتے اور دوسروں کو بھی خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے،ان سے مسلسل ربط بحال رکھتے اوران کی خوشحالی کے لیے ہمیشہ دست بدعا رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میراجب بھی علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوتا سر سے ملاقات ضرور کرتا، وہاں پہنچ کر میری پہلی خواہش ہوتی تھی کہ سر سے ملاقات ہوجائے پھراس کے بعد دوسرے کاموں کی انجام دہی کا خیال آتا تھا۔ یہ صرف ان کی بے پناہ محبت اور لگاؤ کی وجہ سے تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس بیٹھنے سے کچھ نہ کچھ علمی گفتگو بھی ہوتی رہتی جوفکری تشنگی کو بجھانے کا کام کرتی تھی۔اتفاقاً ۱۰/اپریل کو میں علی گڑھ پہنچا لیکن دردِسر کی وجہ سے اس دن ملاقات نہ ہوسکی، دوسرے دن یعنی ۱۱اپریل بروز اتوار تقریباً ۱۱/بجے کسی ضرورت کے تحت میں ان کی رہائش گاہ کے بالکل قریب تھالہذا میں نے سوچا کہ سر سے مل لوں ورنہ آج بھی ملاقات نہیں ہو پائے گی۔ میں نے اجازت کے لیے پہلے فون لگایا لیکن موبائل بند تھا پھر میں ان کے گھر گیا اور ڈوربیل بجائی تو سر کے بڑے صاحبزادے عزیزی نصران (فارض) نے میرا استقبال کیا، میں نے سر کے موبائل آف ہونے کے بارے میں بتاتے ہوئے ان کی گھر پر موجودگی کے حوالے سے سوال کیا تو انھوں نے بتایا کہ ابو گھر پر ہی ہیں اور اسٹڈی روم میں کچھ کام کررہے ہیں، آپ بیٹھیں میں خبر کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ جانے دیں کچھ اہم کام میں مشغول ہوں گے میری وجہ سے شاید کچھ خلل واقع ہو۔مگر پھر بھی انھوں نے سر کو میرے آنے کی خبر دے دی۔سر ڈرائنگ روم میں تشریف لے آئے، یہی میری سر سے آخری ملاقات تھی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا موبائل بند ہے تو کہنے لگے کہ کچھ ضروری کام کررہا تھا اس لیے موبائل کو بند کررکھا تھا کیونکہ کام کے دوران فون کی وجہ سے بڑا خلل ہوتا ہے۔ میرے ساتھ میرا بیٹا محمد ضمام بھی تھا جس سے سر نے کافی باتیں کیں اور اسے کیک اور چاکلیٹ بھی لاکر دیا۔سر کے یہاں ضیافت کا بڑا اہتمام رہتا تھا،ان کی اہلیہ اکثر کیک، مٹھائی، نمکین اوراسی طرح کی دوسری اشیاء جوضیافت میں عموماً کام آتی ہیں تیار کرکے رکھا کرتیں تھیں۔سر اپنی اہلیہ (محترمہ صوفیہ صاحبہ) کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ صوفیہ میرے لیے اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہیں۔ میرے خیال میں اس توصیف کے جہاں دوسرے اسباب ہوں گے وہیں پران کی ضیافت بھی ایک بڑا سبب رہی ہوگی۔ میں نے بر بنائے تکلف عرض کیا کہ سر آپ کسی اہم کام میں مشغول ہیں میں کسی اور وقت حاضر ہوتا ہوں یہ کہتے ہوئے میں جلد ہی وہاں سے رخصت ہوگیا۔ مجھے آج بھی افسوس ہے کہ کاش یہ میری ان سے آخری ملاقات نہ ہوتی اور اگر تھی بھی تو اتنی مختصر نہ ہوتی۔گیارہ تاریخ کی وہ مختصر ملاقات اس وعدے کے ساتھ ختم ہوئی تھی کہ ۱۲/اپریل کو بعد نماز ظہر شعبۂ علم الادویہ میں ملاقات ہوگی۔ چونکہ صبح میں ڈاکٹر شمشاد کے لیے Stage-II کے حوالے سے شیخ الجامعہ کے ساتھ میٹنگ تھی، نکلتے نکلتے سر نے کہا کہ میں فون کروں گا تم آجانا، چنانچہ ۱۲/اپریل کو میں انتظار کرتا رہا مگر سر کا فون نہیں آیا، پھر ۱۳/اپریل کو ڈپارٹمنٹ گیا لیکن سر اپنے چیمبر میں موجود نہیں تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید کہیں میٹنگ میں مصروف ہوں گے، کیونکہ اکثر انتظامی امور کی میٹنگ میں مصروف رہا کرتے تھے پھر میں نے سر کو دوپہر میں فون

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ، محمدیہ طبیہ کالج، مالیگاؤں، مہاراشٹر۔ E-mail:drwasim@gmail.com، Mob.No:9371566384۔

کیا لیکن بات نہیں ہو پائی۔ شام ۵/بجے کے قریب میں اپنے اس مکان کو دیکھنے گیا جس کی تعمیر کا کام سر کی سرپرستی میں چل رہا تھا، وہیں پر سر کی کال آ گئی۔ سر نے کہا کہ تمھارا فون آیا تھا پر بات نہیں ہو پائی، میں نے عرض کیا کہ کل ۱۴/اپریل کو مجھے مالیگاؤں جانا ہے آپ سے ملاقات نہیں ہو پائی اس لیے آج آیا تھا مگر آپ موجود نہیں تھے اس لیے فون کیا تھا۔ فی الوقت میں گھر کی طرف آیا ہوں کچھ دیر میں حاضر ہوتا ہوں، قبل اس کے کہ میری بات مکمل ہوتی سر بول پڑے کہ نہیں میرے پاس بالکل بھی مت آنا میری طبیعت کچھ خراب ہے میں نے فی الحال اپنے آپ کو isolate کرلیا ہے۔ پھر بتایا کہ کل سے مجھے بخار ہے، میٹنگ میں میرا جانا نہایت ضروری تھا ورنہ اساتذہ کے پروموشن کا کام التواء میں پڑ جاتا اس لیے وہاں بھی دوا کھا کر ہی گیا تھا، آج پورے بدن میں شدید درد ہے اور ساتھ میں بخار بھی ہے اس لیے ابھی ملاقات کے لیے ہرگز نہ آنا۔ ایسا کرو کل تم چلے جاؤ پھر ان شاء اللہ ملاقات ہوگی، گھر پر تو قطعی مت آنا۔ میں واپس مالیگاؤں آ گیا اور ساتھ ساتھ سر کے لیے دعاء بھی کرتا رہا کہ اللہ جلد از جلد ان کو شفاء عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے۔ مالیگاؤں آجانے کے بعد کئی دفعہ فون لگایا مگر بات نہ ہوسکی۔ ادھر سر کی طبیعت بھی ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' کے مصداق بگڑتی چلی گئی۔ بیماری کی حالت میں بھی سر جب تک گھر پر رہے مستقل لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہے۔ ڈاکٹر بلال احمد صاحب (CCRUM) نے بتایا کہ سر اس دوران بھی علمی کاموں میں مصروف رہے اور کچھ مواد بذریعہ E-mail انہیں ارسال بھی کیا۔ طبیعت جب زیادہ خراب ہوئی تو میڈیکل کالج ہاسپٹل منتقل ہوگئے، ڈاکٹر شمشاد حتی المقدور سر کی خدمت میں لگے رہے، ایک دن ڈاکٹر افضل صاحب نے موبائل کے ذریعہ سر کو دکھایا، دیکھ کر دل بھر آیا اور بے ساختہ آنکھیں نم ہوگئیں۔ اللہ سے ان کی صحتیابی کی ڈھیروں دعائیں کی۔ میرے والد محترم (ڈاکٹر فیاض احمد صاحب مرحوم) کو سر کی بیماری کے متعلق جب سے خبر ہوئی تھی ان کے لیے مستقل دعاؤں کا ایک خصوصی سلسلہ جاری تھا، حالت جب مزید خراب ہوئی تو سر کو کووڈ وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا، رات میں آکسیجن کی کمی کے سبب سر نے کئی لوگوں کے پاس اس تعلق سے فون کیا مگر آکسیجن کی فراہمی کسی طور بھی ممکن نہ ہوسکی۔ حالت پہلے کے مقابلے مزید خراب ہوگئی، سحر کے وقت ڈاکٹر شمشاد نے بتایا کہ آکسیجن بالکل ختم ہوچکی ہے آکسیجن کا ایک سلینڈر بھی تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکا، میں نے بھی اپنے شناسا لوگوں سے آکسیجن کی فراہمی کے لیے بات کی مگر ساری کوششیں لاحاصل رہیں پھر سر کو لکھنؤ کنگ جارج میڈیکل کالج ہاسپٹل میں ان کے برادر نسبتی پروفیسر کوثر عثمان صاحب کے زیر نگرانی شفٹ کیا گیا مگر حالت دن بدن بگڑتی چلی گئی اور بالآخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس نے ساری طبی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء کو جب یہ خبر آئی کہ سر اس دار فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے ہیں تو ایسا لگا کہ جیسے آج مجھ سے استاد محترم ہی جدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ ایک مشفق باپ اور ایک محسن جدا ہوگیا، اس طرح یونانی طب کا ایک اور درخشاں ستارہ غروب ہوگیا۔

سر ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جس کی اکثریت معترف تھی، خواہ وہ ان کے چاہنے والے ہوں یا نہ ہوں۔ میرے والد محترم سر کو بچپن سے جانتے تھے، وہ بلریا گنج میں مطب کیا کرتے تھے اور سر کے نانیہال کے فیملی فیزیشین تھے۔ سر کے نانا مرحوم کا علاقے کے باعزت لوگوں میں شمار تھا۔ والد صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ سر کے نانیہال اور دادیہال دونوں گھرانے بہت نیک نام، باعزت اور سماج میں ایک اہم مقام کے مالک ہیں چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم اور عز و شرف کے لحاظ سے سر نجیب الطرفین تھے۔ میرے والد سر کے اخلاق سے بہت متاثر تھے، یہی سبب تھا کہ ان سے بہت لگاؤ رکھتے تھے۔ ان سے والد صاحب کے تعلق کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جب فروری ۲۰۱۷ء میں میری فیملی علی گڑھ منتقل ہوئی تو وہ اکثر کہتے تھے کہ غفران صاحب تمھارے استاد ہیں اور سرپرست بھی، لہٰذا انہیں کے آس پاس ہی رہنے کا بندوبست رکھو۔ کرایے کے مکان کی تلاش میں سر نے کافی مدد کی اور بالآخر انھیں کے توسط سے اجمل خان طبیہ کالج کے پیچھے ایک فلیٹ کرائے پر مل گیا۔ والد صاحب ۲۰۱۸ء کے اوائل میں علی گڑھ تشریف لائے، برسبیل تذکرہ میں نے بتایا کہ سر کی قلعہ کے پاس زمین ہے تو فوراً کہنے لگے کہ وہیں پر تم بھی لے لو اور ان کے گھر کے پاس ہی اپنا بھی گھر بنوانا۔ کچھ عرصہ بعد جب ابا کو یہ خبر ہوئی کہ سر بدر باغ اپنے مکان (Duplex) میں شفٹ ہوگئے ہیں تو کہنے لگے کہ تم بھی اسی duplex میں گھر لے لو۔ میں نے سر سے ابا کی اس خواہش کا ذکر کیا تو سر نے اس کو اس طور سے عملی جامہ پہنایا کہ اسی

duplex میں ایک گھر کی جگہ خالی تھی جس پر میرے گھر کی تعمیر کا سلسلہ اپنی حیات ہی میں شروع کروادیا جوان کے احسان اور اللہ کے فضل سے اب تقریباً اختتام کو ہے۔

سر کے ساتھ میرا ایک عجیب ہی رشتہ تھا، چھوٹی چھوٹی چیزوں سے لے کر بڑی اور اہم باتوں تک کے سلسلے میں میں جب تک سر سے بات اور مشورہ نہ کرلیتا تب تک نہ تو تشفی ہوتی تھی اور نہ ہی دل کو سکون ہو پاتا تھا۔علمی باتیں تو چھوڑیے، خانگی ضروریات کی معمولی چیزوں تک کے لیے بھی ان کا مشورہ ضرور لیتا تھا مثلاً برتن، چولھا، اسکوٹر، کار، فریج، واشنگ مشین، اے سی، غرضیکہ ہر چیز جسے خریدنا ہوتا تھا سر سے مشورہ کیے بغیر اطمینان نہیں ہوتا تھا۔سر کو ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں بھی کافی معلومات تھیں، بڑی دلچسپی سے وہ ان تمام چیزوں کی خوبیاں اور نقائص بتاتے تھے جس سے ہمیں چیزوں کے انتخاب میں کافی مدد ملتی تھی اور دل مطمئن بھی ہوجاتا تھا۔اب اس طرح کے تمام معاملات میں ان کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔

سر کے اندر بہت سی ایسی خداداد صلاحیتیں موجود تھیں جو عام انسانوں میں بڑی کمیاب ہوتی ہیں۔ان کی اکثر و بیشتر خصوصیات ان کی خاندانی تربیت کا نتیجہ تھیں، وہ بلند اخلاق کے مالک تھے، حال یہ تھا کہ اگر اپنے چیمبر میں کسی کام میں مشغول ہوتے اور اسی دوران کوئی آگیا تو کام کو مؤخر کر کے اس کی طرف ضرور متوجہ ہوتے تھے، اطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے اور ہم کلام شخص کو ذرا بھی احساس نہ ہونے دیتے تھے کہ ان کی آمد سے کام میں کسی طرح کا کوئی خلل ہوا ہے۔جب بھی کبھی کوئی ان سے ملنے جاتا تو چائے اور اس کے لوازمات کا خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔ڈپارٹمنٹ میں اکثر اوقات دوسرے لوگوں کے کام ہی نمٹانے میں اپنا وقت صرف کردیتے تھے، وہاں اپنا علمی کام وہ کم ہی کر پاتے تھے چنانچہ گھر پر روزآنہ پانچ چھ گھنٹہ مطالعہ کا معمول تھا۔اپنے اساتذہ اور سینئرس کی بطور خاص عزت کرتے تھے، طلبہ اور اپنے سے چھوٹے لوگوں سے شفقت سے پیش آتے تھے، اپنے ہر شاگرد سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے، اہم بات یہ تھی کہ ہر ایک کو یہی لگتا تھا کہ سر کی خاص توجہ اسے ہی حاصل ہے اور سب سے زیادہ اسی کو مانتے ہیں۔اگر کبھی مجھے فون کرنے میں تاخیر ہوجاتی تو خود ہی فون کر کے احوال دریافت کرتے تھے، نیز ڈاکٹر محمد ساجد، ڈاکٹر ارشد جمال، ڈاکٹر محمد شاکر اور ڈاکٹر جاوید احمد خان وغیرہ کی خیریت معلوم کیا کرتے تھے۔وہ اس بات کے بڑے خواہاں رہتے تھے کہ ان کے شاگرد جہاں بھی رہیں ایمانداری کے ساتھ کام کریں اور اپنی فیلڈ میں مہارت پیدا کریں۔پڑھنے لکھنے کی ہمیشہ تاکید کرتے، اگر کبھی وسائل کی کمی کی شکایت سامنے آتی تو کہا کرتے تھے کہ جو بھی موجود ہے اس سے جو کچھ بہتر کرسکتے ہو وہ کرو مگر خالی نہ بیٹھو، محنت سے کام کرتے رہو۔اگر کوئی تحقیقی مضمون سر کو تصحیح کے لیے میں بھیجتا تو سر اس سے بہت خوش ہوتے تھے، اس کا بغور مطالعہ کرتے اور تعریف کرتے تھے کہ بہت اچھا لکھا ہے، پھر اس کے بعد کمیوں اور خامیوں کی بڑی نرمی سے نشاندہی کرتے اور اسے مزید بہتر بنانے کی تدابیر کی طرف رہنمائی فرماتے تھے۔اپنے شاگردوں اور جاننے والوں کی بہتر تقرری اور ترقی پر بہت خوش ہوتے تھے۔استاد کے تعلق سے یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ روحانی باپ ہوتا ہے، سر کی شخصیت اسی روحانی باپ کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھی۔ان کے انتقال پر ان کے سب سے چھوٹے برادر نسبتی نے بتایا کی ہم لوگوں سے اکثر آپ سبھی کا ذکر خیر کرتے رہتے تھے اور اپنے شاگردوں سے بڑا خاص لگاؤ رکھتے تھے۔

معاشرے میں ایک عام رویہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اکثر لوگ کسی نہ کسی تعلق سے ایک دوسرے کی برائیوں کا ذکر نکال بیٹھتے ہیں، مگر سر کے اندر یہ ایک بڑی اہم خصوصیت تھی کہ وہ لوگوں کے اندر سے ان کی خوبیوں کو تلاش کرتے اور اس کا تذکرہ کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کے لوگ انھیں پسند کرتے تھے، سر اکثر کہا کرتے تھے کہ لوگوں کو اچھا مشورہ دینا بھی ایک نیکی ہے اور یہ نیکی انھیں مستقل حاصل ہوتی رہتی تھی۔

سر کی علمی بلندی کا عالم یہ تھا کہ ان کے اساتذہ بھی اس کا برملا اظہار و اقرار کرتے تھے۔غالباً جنوری ۲۰۰۴ء کا واقعہ ہے جب سر لیکچرر تھے اور میں ایم ڈی کا طالب علم تھا پروفیسر کنور محمد یوسف امین صاحب کے ہم زلف، جناب منور پیر بھائی، صدر، غلام محمد اعظم ٹرسٹ، اعظم کیمپس پونے بعض اہم امور کی تکمیل کے لیے علی گڑھ تشریف لائے تو پروفیسر محمد یوسف امین صاحب نے یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات، ہاسٹل اور مرکزی لائبریری وغیرہ دکھانے کی ذمہ داری مجھے سونپی۔چنانچہ دوسرے دن جب میں انھیں لے کر شعبۂ علم الادویہ میں داخل ہوا

تو ڈاکٹر غفران صاحب شعبے سے باہر نکل رہے تھے، پروفیسر محمد یوسف امین صاحب نے ان کا تعارف یوں کروایا "He is Dr Ghufran. He is a Lecturer but Professor material"۔ سر نے اس تعارف پر خاکساری کے ساتھ اپنے استاد کے سامنے سر جھکا لیا لیکن مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور فخر بھی ہوا کہ میں ایک ایسے استاد کے زیر نگرانی اپنا کام کر رہا ہوں جو بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے، جس کا اعتراف ان کے اساتذہ کو بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ زبان سے نکلا ہوا جملہ کب قبول ہو جائے کوئی نہیں جانتا، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ غالبا 2007 میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسین، بنگلور کے شعبہ علم الادویہ میں پروفیسر کی جگہ نکلی اور اس وقت کے ڈائریکٹر کسی کام سے علی گڑھ تشریف لائے ہوئے تھے تو سر سے ملاقات ہوئی۔ تذکرۃ انھوں نے فرمایا کہ ہمارے یہاں پوسٹ آئی ہے آپ بھی درخواست بھیج دیں پھر سر نے اس پوسٹ کے لیے اپلائی کر دیا۔ قدرت کا کرشمہ دیکھیں کہ لیکچرر سے ڈائریکٹ پروفیسر ہو گئے، حالانکہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے جلد ہی وہاں سے واپس علی گڑھ آ گئے۔

سر ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت محنتی بھی تھے، زمانۂ طالب علمی میں اکثر اپنا روم مقفل کر کے پڑھا کرتے تھے۔ تدریسی زمانے میں بھی جب ڈھیروں ضروری کام ہوا کرتے تھے تو باہر سے روم بند کروا کر پڑھتے تھے۔ سر کو اردو زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی کافی مہارت حاصل تھی، بی اے کی تعلیم کے دوران شیکسپیر وغیرہ کو پڑھ چکے تھے۔ غالباً ۱۹۸۴ء میں جب سر کا داخلہ بی اے اکنامکس میں ہوا تو اس وقت کے صدر شعبہ نے سر کی سابقہ تعلیم مدرسہ سے ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے چیمبر میں بلا کر سبجکٹ کو تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ مضمون انگلش میں ہونے کی وجہ سے تمھارے لیے بڑا مشکل ہوگا بہتری اسی میں ہے کہ تم اسے تبدیل کر لو لیکن وہ حوصلہ نہیں ہارے اور انتہائی جد و جہد اور محنت و لگن سے اسے پڑھنے میں لگے رہے چنانچہ جب پہلا sessional test ہوا تو کلاس میں سر نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کیا جس کے فورا بعد صدر شعبہ نے سر کو بلا کر بڑی تعریف و توصیف اور حوصلہ افزائی کی اور آئندہ کامیابیوں کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کیں اور پھر بعد میں گریجویشن کی تکمیل پر فیکلٹی آف شوشل سائنس میں سب سے زیادہ نمبرات کے حصول کی بنیاد پر سر کو گولڈ میڈل سے بھی نوازا گیا۔ ان کی انگریزی زبان دانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے کسی سینیر کی ایم ڈی تھیسس کا انٹروڈکشن سر نے لکھا جس کے وہ Co-guide تھے اور پروفیسر یوسف امین صاحب گائیڈ۔ اس طالب علم نے جب پروفیسر محمد یوسف امین صاحب کو یہ انٹروڈکشن دکھایا اور بتایا کہ ڈاکٹر غفران صاحب نے اسے لکھوایا ہے تو یوسف امین صاحب برجستہ بولے کاش یہ میں نے لکھا ہوتا۔ حالانکہ ڈاکٹر غفران صاحب نے خود انھیں کی سرپرستی میں ایم ڈی کی تکمیل کی تھی۔ کسی استاد کے اپنے شاگرد کے لیے اس طرح کے توصیفی کلمات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور یہ کسی سند سے کم نہیں ہوتے ہیں۔

اپنے تدریسی مضمون میں سر کو بڑی مہارت حاصل تھی، اس کے علاوہ طب کے دیگر مضامین میں بھی انھیں کافی دستگاہ تھی یہی وجہ تھی کہ سائنس فیکلٹی اور میڈیکل کالج کے طلبہ و اساتذہ بھی استفادہ کی غرض سے ان کے پاس اکثر آیا کرتے تھے۔ سر ان تمام ہی لوگوں سے بڑی ہی محبت اور شفقت سے پیش آتے، ان کے مسائل کو بہت غور سے سنتے اور ان کا حل بتاتے تھے۔ سر کو طب، سائنس، ٹکنالوجی، کامرس، مینجمنٹ، معاشیات، سیاسیات، اسلامیات اور تاریخ و فلسفہ وغیرہ پر کافی دسترس حاصل تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً وہ تمام موضوعات جو عصر حاضر میں مقبول و معروف ہیں سبھی پر ان کی اچھی نظر تھی، اسی وجہ سے وہ ہر کسی کے سوالات خواہ وہ کسی بھی طرح کے مضامین سے متعلق ہوں کا تسلی بخش جواب مرحمت فرماتے تھے۔

سر کی خانگی زندگی بہت خوشگوار تھی، گھر میں اہلیہ اور بچوں سے ہمیشہ نرم خوئی کا معاملہ رکھتے، کبھی کچھ ناگوار لگا تو اشارۃً اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ چھوٹی بیٹی جو تقریباً چودہ سال کی ہیں کسی بھی موقع پر سخت لہجے میں ان سے بات کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ انھوں نے اپنے بچوں کو بہت ہی اچھی تربیت سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ وہ بچوں کی تربیت اور ان کی تعلیم کے لیے نہایت فکرمند رہتے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ایک توازن برقرار رکھتے تھے۔ دوستوں سے بھی بڑا خاص لگاؤ رکھتے، ان سے ملنا، فون پر خیریت لینا، ان کی پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا ان کا معمول تھا۔ ان کے ایک دوست جو شعبۂ عربی سے پی ایچ ڈی تھے اکثر ان سے ملنے آتے، جو کافی پریشان حال تھے، سر اکثر ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ مرحوم

پروفیسر جلیس احمد صاحب، سابق پرنسپل، زیڈ وی ایم کالج، پونے سے انھیں خاص لگاؤ تھا اسی وجہ سے اکثر امتحانات کے سلسلے میں پونے آنے کے لیے تیار ہوجایا کرتے تھے اور جب پونے آتے تو مجھے ضرور فون کیا کرتے کہ تم آرہے ہو کہ نہیں۔

بی یو ایم ایس کے طالب علمی کے زمانے میں جب ہم فرسٹ پروفیشنل میں تھے سر کا تقرر بحیثیت استاد شعبۂ علم الادویہ میں ہوا۔ سیکنڈ پراف میں پہنچے تو سر نے علم الصیدلہ کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھایا، جب سر پڑھاتے تھے پوری کلاس کے طلبہ بڑی خاموشی سے ان کے لکچر کو سنا کرتے تھے کیونکہ جو علمی مواد وہ بتاتے تھے وہ نصابی کتابوں میں اکثر میسر نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے کے نوٹس آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔ وہ طب کے مضامین کو سائنسی نقطۂ نظر سے پڑھانے اور سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ سوالات بھی اسی انداز سے پوچھتے تھے کہ طالب علم کا ذہن سائنسی نکات کو سمجھنے کے لیے تیار ہوجائے۔ انھیں جس طرح سے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کا خیال تھا بالکل اسی طرح سے اپنے شاگردوں کی تعلیم وتربیت پر بھی خاص دھیان دیتے تھے۔ جب بھی کوئی طالب علم کوئی سوال کرتا تو ایسا لگتا کہ ان کے اندر علم کا پنہاں سمندر اچانک ٹھاٹھیں مارنے لگا ہے اور وہ اس کو پوری طرح انڈیل دینا چاہتے ہیں۔ بی یو ایم ایس کے زمانۂ طالب علمی میں سر سے ادب اور لحاظ میں بہت قریب ہونے کا موقع نہیں ملا لیکن بعد میں جب شعبۂ علم الادویہ میں ایم ڈی میں داخلہ ہوا تو ہمارے بڑے بھائی جناب ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب (جو اس وقت شعبۂ سیاسیات میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے) نے کہا کہ تمہیں شعبۂ علم الادویہ میں جناب غفران صاحب کے زیر سرپرستی علمی سفر طے کرنا ہے اور پہلی بار وہی مجھے سر کے گھر بغرض ملاقات لے گئے تھے۔ اس وقت وہ احمد نگر، دودھ پور میں کرایے کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے میرا علی گڑھ آنا اور خصوصیت سے طبی تعلیم کا حصول اشتیاق بھائی کا ہی رہین منت ہے اس لیے ان کے مشورہ پر عمل کتنا میں نے اپنے لیے فرض جانا۔

ایم ڈی کے زمانۂ طالب علمی میں زندگی کے اکثر پہلوؤں کو سر سے سیکھنے کا موقع ملا۔ تھیسس کے عنوان سے لے کر اسٹڈی ڈیزائن اور پھر Experimentation غرضیکہ چھوٹی سے لے کر ہر بڑی علمی ضرورت میں انھوں نے میری مدد کی۔ وہ سوالات پوچھتے اور پھر اشکالات دور کرتے ہوئے تسلی بخش جواب بھی دیتے تھے۔ مضامین لکھنے کے فن سے میں بالکل ہی عاری تھا، جب پہلی بار کالج میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس کے لیے اختصاریہ لکھنا ہوا تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا لکھوں۔ سر سے مشورہ کیا تو فرمایا کی جو بھی لکھنا چاہتے ہو وہ لکھ کر لے آؤ۔ سینیرس نے بتایا کہ لکھ کر لے جاؤ پھر سر خود ہی رہنمائی کریں گے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ پہلا اختصاریہ جو میں نے لکھا تھا سر نے پڑھنے کے بعد کہا کہ کیا کہنا چاہتے ہو جو تیار کر کے لے آئے ہو اس سے بات پوری طرح سے واضح نہیں ہو پارہی ہے چنانچہ میں نے اپنی بات رکھی پھر سر نے اس کی اصلاح فرمائی۔ ان کی اصلاح کے بعد وہ اختصاریہ بالکل ہی الگ تھا، میرے سارے جملے غائب تھے۔ پھر سر نے مجھے اختصاریہ لکھنے کا طریقہ بتایا، ٹھیک یہی حال مضامین کے لکھنے کے تعلق سے بھی تھا۔

دوران ایم ڈی میں ڈاکٹر محمد عامر اور ڈاکٹر سعود الظفر کے ساتھ دوپہر کے بعد بھی شعبے میں ایکسپیریمنٹ اور تھیسس کی تکمیل کے لیے رکا کرتا تھا۔ اس وقت یونیورسٹی کے تقریباً تمام شعبہ جات دو بجے تک بند ہوجایا کرتے تھے۔ ہم لوگ اکثر مغرب یا کبھی کبھی عشاء تک رکتے تھے۔ سر بھی بیشتر اوقات ڈپارٹمنٹ میں موجود رہتے اور ذاتی و شعبہ جاتی علمی کاموں کی تکمیل میں مصروف رہتے۔ ایک بار وہ شعبہ میں شام کے وقت موجود تھے، ہم لوگ بھی ان کے چیمبر میں پہنچ گئے، باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ یونیورسٹی کے جتنے بڑے سائنٹسٹ ہیں یا جن کا اپنے متعلقہ مضامین میں بڑا نام ہے ان کی اپنی اولادیں اکثر بہت کامیاب نہیں ہو پارہی ہیں۔ اس حوالے سے وہ اپنا تجزیہ بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ شعبہ میں زیادہ وقت گزارنے سے ان حضرات کی خانگی زندگی بھی کہیں نہ کہیں متاثر ہوتی تھی۔ اسی لیے سر کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ پیشہ ورانہ اور خانگی دونوں طرح کی ضروریات میں توازن واعتدال کو برقرار رکھیں۔

سر کا کہیں لکچر ہوتا تو بھرپور تیاری کر کے جاتے اور موضوع سے متعلق جملہ معلومات کو مجتمع کر کے اس کا معروضی جائزہ لیتے نیز اس کے اطلاقی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتے تھے۔ چونکہ ان کا انداز بیان بہت سلیس اور دلچسپ ہوتا تھا اس لیے ہر کوئی ان سے متاثر ہوتا تھا۔ کلاس لکچر بھی وہ بغیر تیاری کے نہیں لیتے تھے۔ اگر کبھی

کسی ضروری مصروفیت کے سبب لکچر نہ لے پاتے تو ڈپارٹمنٹ میں موجود رہنے کے باوجود Casual leave لے لیتے تھے۔ اپنے ذاتی مصارف کے لیے شعبے کی چیزوں کو کبھی استعمال میں نہیں لاتے تھے۔ مطالعے کا شوق انھیں اپنے والد صاحب سے ورثے میں ملا تھا، ذہین بھی بلا کے تھے اسی وجہ سے جو کچھ پڑھتے کبھی نہیں بھولتے تھے۔ حالانکہ اپنی ضروریات کی چیزیں ان سے اکثر فراموش ہو جاتی تھیں۔ بتاتے تھے کہ دوران سفر کچھ نہ کچھ ضرور چھوٹ جاتا ہے۔ نزدیک کا چشمہ استعمال کرتے تھے، اپنی اسی عادت کی وجہ سے کئی ایک چشمہ بنوا کر رکھتے تھے تاکہ اگر ایک کہیں چھوٹ گیا تو دوسرا استعمال میں آسکے۔

مالیگاؤں پہلی بار ۲۰۰۸ء میں منعقد ہونے والی نیشنل کانفرنس میں تشریف لائے تھے اور آخری بار ۲۰۱۲ء کے اواخر میں پی جی کا امتحان لینے کی غرض سے آئے تھے۔ سر کی آمد ہمارے لیے مسرت کا پیغام لے کر آئی۔ حتی المقدور ان کی پُرتکلف ضیافت کی کوشش کی گئی لیکن وہ سادگی اور بے تکلفی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ آخری بار جب وہ مالیگاؤں آئے تو واپسی میں ہم انھیں منماڑ ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے گئے۔ راستے بھر انھوں نے ہم سبھی سے تعلیم و تدریس سے متعلق مختلف طرح کے علمی سوالات کرتے رہے اور پھر خود ہی ہمارے اشکالات کے تسلی بخش جواب بھی دیتے رہے۔ پھر علی گڑھ پہنچنے کے بعد انھوں نے بذریعہ ای میل ایک خط بھی روانہ کیا تھا جو اپنے آپ میں ایک دستاویز ہے۔ مالیگاؤں کے علاوہ وہ زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج، پونے بھی بطور ممتحن اکثر تشریف لے جاتے تھے، علاوہ ازیں وہاں پر وہ مختلف پروگراموں میں ریسورس پرسن کی حیثیت سے بھی تشریف لایا کرتے تھے۔

سر کو طبی مضامین لکھنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ صرف دواؤں کے scientific validation کے قائل نہیں تھے بلکہ طبی نقطۂ نظر کو سائنٹفک بنیادوں پر ثابت کرنے کی کوشش بھی کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے طبی و تحقیقی مضامین دیگر اطباء کے مضامین سے نمایاں اور ممتاز ہوتے تھے۔ ان کے مضامین کا ہر حصہ بہت جامع ہوتا لیکن خصوصیت سے ڈسکشن انتہائی جامع اور مدلل لکھتے تھے جس میں عموماً پہلے طبی نقطۂ نظر بیان ہوتا پھر اس کی سائنسی توجیہ و توضیح پیش کی جاتی۔ ان سے منسلک طلبہ و اساتذہ اپنے مضامین اور مقالات کی اشاعت سے قبل سر سے ان کی اصلاح کو ضروری سمجھتے تھے، وہ بڑے ہی انہماک اور شوق سے ان کے نوک و پلک کو سنوارا کرتے تھے۔ بعض حضرات اپنے انتظامی خطوط کی بھی اصلاح لیا کرتے تھے، بعض اساتذہ کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے شاگردوں کی تھیسس بھی سر سے چیک کرائے بغیر مطمئن نہیں ہوتے تھے، میں بھی اپنے تلامذہ کی synopsis، research design، protocol سے لے کر طباعت کے مراحل تک میں سر سے مشورہ لیتا رہتا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ ہزار مصروفیات کے باوجود کبھی بھی بے رغبتی یا جھلاہٹ کا اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ لوگوں کی مدد کر کے ان کو خوشی ہوتی تھی۔ طلبہ کی تھیسس بہت انہماک سے چیک کرتے تھے، کوشش کرتے کہ کوئی بھی نقص نہ رہ جائے اور معمولی سے معمولی غلطیوں کے ازالہ کو بھی یقینی بناتے تھے۔ یونیورسٹی کے صد سالہ جشن کے موقع پر طبیہ کالج کی تاریخ پر ان کا تحریر کردہ مضمون جب تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا تو ایک روز سر کے پاس اس کے مدیر اعلیٰ کا شکریے کے لیے فون آیا، انھوں نے فرمایا کہ آپ کا مضمون ہی ایک ایسا مضمون تھا جس میں کاما اور فل اسٹاپ لگانے تک کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اسی طرح کا پرفکشن وہ اپنے طلبہ میں بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک دفعہ میں علی گڑھ گیا تو انھیں ایک ضروری کام میں مصروف پایا، پوچھنے پر بتانے لگے کہ وہ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب کی خواہش کے مطابق ان کی تمام کتابوں کی تلخیص انگریزی زبان میں تیار کر رہے ہیں۔

سی سی آر یو ایم سے طبع ہونے والے Hippocratic Journal of Unani Medicie (HJUM) کی اشاعت کی ذمہ داری جناب ڈاکٹر وی کے سنگھ صاحب کے پاس تھی جو علی گڑھ میں ہی رہتے تھے۔ جب تک وہ اس منصب سے جڑے رہے تمام مضامین سر سے ہی ریویو کرواتے تھے۔ سر بڑی محنت سے ان کو قابل اشاعت بناتے اور جنرل کو وقت پر شائع ہونے کے لیے ہر ممکن تعاون کرتے تھے۔ فیکلٹی آف یونانی میڈیسن سے شائع ہونے والے جنرل؛ یونانی میڈیکس کے آپ پہلے اسوشیٹ ایڈیٹر تھے پھر بعد میں ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس کے جتنے بھی شمارے اب تک نکلے ہیں ان کی اشاعت میں سر کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ مضامین کے ریویو اور اصلاح سے لے کر طباعت کے مراحل تک کے کام سر کی نگرانی میں ہی انجام پاتے تھے۔ وہ اپنے ماتحت افراد کا بہت خیال رکھتے تھے نیز

علمی کام کرنے والوں کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔

عموماً کسی کو جب کوئی اعزاز ملتا ہے تو بہت فخر کے ساتھ اس کا اشتہار کرتا ہے لیکن سر کی انکساری کا یہ عالم تھا کہ جب بھی کوئی اعزاز ملتا تو اس سے بالکل عام بات کی طرح ہی مطلع کرتے، ہم لوگ خوشی کا اظہار کرتے تو کہتے ارے! یہ کوئی بڑے اعزاز کی بات نہیں ہے۔ اکثر لوگ اپنے ایوارڈس کو بطور اظہار ڈرائنگ روم کے ڈسپلے میں لگاتے ہیں لیکن اس طرح کی نمائش سر کو بالکل پسند نہیں تھی۔ منسٹری آف آیوش کے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کا ملنا ایک بڑے اعزاز کی بات ہے لیکن اس کی خبر سر کے قریبی رشتہ داروں کو بھی تقریباً دو سال بعد ان کی رحلت سے کچھ ماہ قبل ہوئی تھی کہ انہیں اس ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا ہے۔ ایک بار کہنے لگے کہ مجھے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کے لیے ابھی اپلائی نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ میری وجہ سے بعض سینیر ٹیچرس اس اعزاز سے محروم رہ گئے ہیں۔ All India Institute of Medical Sciences (AIIMS), New Delhi سے ملنے والے Institutional Award اور اسی طرح کے دیگر اہم ایوارڈ کے تعلق سے بھی سر کا یہی رویہ تھا۔ اپنی مختصر سی اکیڈمک لائف میں انھوں نے کئی بڑے کام کیے لیکن ان کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انھوں نے طلبہ میں سائنٹفک ٹمپرامنٹ پیدا کرنے اور علمی فکر کو پروان چڑھانے کا کام کیا۔ سر طب سے متعلق کئی اہم جرنلس بطور خاص Journal of Ethinopharmacology کے reviewer تھے۔

ایم ڈی کے میرے ابتدائی زمانہ میں ایک روز سر بہت خوش تھے، انھوں نے شعبے کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے بتایا کہ ہمارا ایک ریسرچ پیپر جو ڈاکٹر محمد افضل کی تھیسس کا ہے Journal of Ethnopharmacology میں accept ہوگیا ہے۔ میں اس وقت میں پیپر اور پبلکیشن کی اہمیت سے ناآشنا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ کوئی اتنی اہم بات تو نہیں ہے پر سر اتنا خوش کیوں ہیں؟ اس خوشی کو میں نے اس وقت محسوس کیا جب سر کے اصرار پر میں نے اپنا ایک پیپر Indian Journal of Traditinal Knowledge میں بھیجا جو تقریباً دو سال کے طویل عرصے میں خط وکتابت کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد accept ہوا۔

سر اپنے اساتذہ بطور خاص پروفیسر کنور محمد یوسف امین صاحب کی بے پناہ عزت کرتے اور ان سے ہر طرح کا مشورہ کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر انعام الدین صاحب جو سر کے ساتھ ایک پروجیکٹ میں Pharmacognocist کے طور پر منسلک تھے اور لیبیا سے ریٹرن ہوکر علی گڑھ میں شفٹ ہوگئے تھے، کی سر سے بڑی قربت تھی، ڈاکٹر انعام الدین صاحب سر کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح مانتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سر سے جو بھی کسی نہ کسی وجہ سے جڑ گیا وہ ان کا دلدادہ ہو ہی جاتا تھا۔

پروفیسر نعیم احمد خان صاحب سر کے بڑے مداحوں میں سے ایک ہیں، سر بھی آپ کی بڑی عزت وتکریم کرتے تھے، تحقیق کے دقیق مسائل کو سمجھنے کے لیے اکثر طلبہ کو سر سے ملنے کی صلاح دیا کرتے تھے، جس کی بجا آوری سر اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جناب ڈاکٹر محمد آصف صاحب جو کہ میڈیسنل کیمسٹری کی پوسٹ سے بحیثیت استاد شعبۂ علم الادویہ سے ریٹائر ہو چکے تھے، اکثر سر سے ملنے ڈپارٹمنٹ میں آیا کرتے تھے، دونوں حضرات میں بے تکلفانہ مراسم تھے، جناب صفدر سلطان اصلاحی صاحب بھی آپ کے دیرینہ رفیقوں میں سے تھے، علمی اور دینی موضوعات پر آپ سے گھنٹوں گفتگو ہوتی رہتی تھی۔

علم الصیدلہ میں سر کو بڑی مہارت حاصل تھی، اس میدان میں وہ قدیم و جدید کا ایک بہترین سنگم تھے اور اس حوالے سے عملی میدان میں بھی قدم رکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میری اہلیہ (ڈاکٹر فہمیدہ زینت) کا جب علی گڑھ میں عارضی تقرر ہوا تو کہنے لگے کہ اگر وہ مستقل ہو جائے تو تم ملیگاؤں چھوڑ کر علی گڑھ آجاؤ۔ ہم لوگ مل کر ایک فارمیسی اسٹیبلش کر لیں گے، میں گائیڈ کروں گا اور تم فارمیسی دیکھنا۔

سر جب NIUM میں اپنی تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے اس وقت مجھے وہاں کئی ROTP میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ بنگلور پہلی بار جانا ہوا تو انھوں نے مجھے ریسیو کرنے کے لیے ڈاکٹر خورشید کو ایرپورٹ بھیجا۔ ایک بار میں اپنی اہلیہ کے ساتھ گیا تو ڈاکٹر عمران کو اسٹیشن بھیجا اور تاکید کی کہ رکنے کے لیے کسی اچھے ہوٹل کا انتظام کروا دینا۔ اکیلے ہونے پر وہ اپنے گھر پر ہی ٹھہرانے کا اہتمام کرتے تھے۔ NIUM میں سر کی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کو پروان چڑھنے کا

بھرپور موقع ملا۔ NIUM کے اکثر اساتذہ، طلبہ و طالبات اور غیر تدریسی عملہ ہر ایک آپ کے اخلاق و کردار اور طریقہ کار کا دلدادہ تھا۔ شعبہ میں پروفیسر عبدالودود صاحب ریڈر تھے اور آپ پروفیسر و صدر شعبہ، لیکن چونکہ زمانہ طالب علمی میں وہ آپ سے سینئر تھے لہٰذا ہمیشہ ان کے مرتبے کا خیال رکھتے، ان کی عزت کرتے اور کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ ایچ او ڈی ہیں۔ ابتدائی دنوں میں پروفیسر مستحسن علی جعفری صاحب جو ان دنوں انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر تھے سر سے زیادہ واقف نہیں تھے لیکن جیسے جیسے ان کی صلاحیتوں سے آشنا ہوئے ان کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔

شعبہ کی صدارت حاصل کرنے کے لیے اکثر اساتذہ آپس میں الجھ جاتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے ہر ممکن تگ و دو کرتے ہیں لیکن سر کو یہ پسند نہیں تھا کہ اپنے کسی استاد کی موجودگی میں وہ صدر شعبہ بنیں۔ ۲۰۱۹ء میں اجمل خان طبیہ کالج میں روٹیشن کی بنیاد پر سر کو شعبہ علم الادویہ کی صدارت کا عہدہ ملنا تھا تو انھوں نے آرڈر نکلنے سے قبل ہی انتظامیہ سے معذرت کرلی، بعد میں جب ان کے اساتذہ شعبہ سے ریٹائر ہوگئے اس کے بعد ۲۰۲۰ء میں یہ ذمہ داری قبول کی۔

سر دوسروں کی خدمت کرکے بہت خوش ہوتے تھے، ہر کسی کے کام آتے، ہر کسی کی مدد کے لیے تیار رہتے۔ کبھی کسی کو کرائے کا مکان تلاش کرنا ہے، کسی کو زمین یا گھر خریدنا ہے تو اس کی رہنمائی کیا کرتے تھے، کسی کا ایڈمیشن کروانا ہے، کسی کو فارم بھرنا ہے، کسی کے لیے کچھ دنوں کے رکنے کا انتظام کرانا ہے گویا ہر قسم کی زحمت اٹھانے پر آمادہ رہتے تھے۔ ۲۴/مارچ ۲۰۲۰ء کو جب کووڈ کی وجہ سے لاک ڈاؤن لگا تو فون کرکے بچوں کی خیریت دریافت کرتے۔ ایک دن سر کا فون آیا، پوچھنے لگے علی گڑھ میں آٹا نہیں مل رہا ہے، اپنے گھر پر معلوم کرو کسی اور اشیائے خوردنی کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔ میں نے معلوم کرکے بتایا کہ سر فی الحال کوئی بھی دقت نہیں ہے ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ گوشت مل رہا ہے یا نہیں، میں نے کہا سر وہ کہاں ملے گا ویسے اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہے۔ دو دن بعد اہلیہ کا فون آیا کہ گھر کی بیل بجی، دروازہ کھولنے پر دیکھا کہ سر ایک کیری بیگ میں کچھ لیے کھڑے ہیں، فوراً میرے حوالے کرکے چلے گئے، اس میں بکرے کا گوشت ہے۔ اہلیہ کافی شرمندہ تھیں، کہنے لگیں کہ مجھے قطعاً اچھا نہیں لگا، آپ نے سر سے کہا تھا کیا؟ میں نے بتایا کہ میں نے تو نہیں کہا تھا لیکن سر پوچھ رہے تھے۔ پھر میں نے سر کو فون کیا اور شرمندگی کا اظہار کیا تو کہنے لگے کوئی بات نہیں، ایک جگہ کچھ لوگوں نے اجتماعی طور پر ایک جانور ذبح کروایا تھا تو میں نے اپنے ساتھ ساتھ تمھارے لیے بھی تھوڑا سا لے لیا تھا۔ مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہوئی کہ کاش سر نے یہ زحمت نہ اٹھائی ہوتی۔

غالباً ۲۰۱۹ء کے ابتدائی مہینوں کی بات ہے، سر کا فون آیا کہ تم کو پی جی کے طلبہ کا پریکٹیکل اگزام لینے کے لیے علی گڑھ آنا ہے اور ایک تاریخ بتادی۔ میں نے بہ خوشی اپنی رضامندی دے دی۔ اتفاق سے مجھے اس سے پہلے ممبئی جانا تھا، لہٰذا میں وہیں سے علی گڑھ چلا گیا اور امتحان لے کر واپس بھی آ گیا۔ کچھ دنوں بعد جب دوبارہ علی گڑھ گیا تو سر نے بتایا کہ جس دن تم وائیوا کے لیے آئے تھے اسی روز میرا WHO کا ایک انٹرویو تھا اور اسی کے لیے منسٹری آف آیوش سے بار بار فون آرہا تھا۔ استفسار پر انھوں نے بتایا کہ میں نے WHO کے ہیڈ کوارٹر، جینیوا میں Alternative Medicine کی ایک اہم پوسٹ کے لیے اپلائی کر رکھا تھا جس کی تنخواہ ڈالرس میں تھی، بغیر ویزا کے پوری دنیا میں کہیں بھی سفر کرسکتے تھے، سال میں دو بار گھر آنے کے لیے مع فیملی فری ٹکٹ بھی ملتا اور ایک بار جانے اور آنے کا لگیج چارج بھی ملتا لیکن بچوں کی تعلیم و تربیت کے خیال نے مجھے وہاں جانے سے روک دیا۔ مجھے بہت دکھ ہوا کہ کاش میں اس دن امتحان لینے نہ جاتا تو ممکن ہے کہ سر انٹرویو دینے چلے جاتے۔

سر کو موریشس حکومت کی درخواست پر بحیثیت سرکاری مہمان وہاں جانے کا موقع ملا۔ سر وہاں ایک ہفتہ تک رہے، اس پورے ہفتے کے دوران انھیں یونانی طب کے تعلق سے وہاں کی حکومت کو آگاہی فراہم کرنی تھی اور وہاں پر اس کے فروغ کے لیے مواقع تلاش کرنا تھا لہٰذا سر نے پورے ایک ہفتے کا پروگرام، اس کا مکمل خاکہ اور لائحہ عمل لکچرس کی شکل میں تیار کر رکھا تھا جس کے لیے انھوں نے مہینوں تیاری کی تھی۔ وہاں پر روز آنہ سر کے مختلف سیشنز ہوتے جس میں مقامی حکومت کے ذمہ داران موجود ہوتے تھے۔ موریشس کے قومی پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا نے اس کا خوب کوریج بھی کیا تھا۔ وہاں سے واپس آکر سر بہت مطمئن تھے، ان لوگوں کی ضیافت سے بہت متأثر تھے اور مستقبل میں یونانی طب کے مواقع کے

لیے بہت پرامید تھے۔ سرلندن میں ہونے والے ایک آن لائن کورس میں ریسورس پرسن کے طور پر لکچر بھی لیتے تھے جس کی ایک مکمل سیریز آن لائن پیش کی جانی تھی۔ ان کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری اب پروفیسر غلام الدین صوفی صاحب اٹھا رہے ہیں۔

سر کے اندر انتظامی صلاحیت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی تھی، ان کی اسی خوبی کی وجہ سے فیکلٹی کا ہر ڈین مختلف پروگرامس میں انھیں مجلس مشاورت میں ضرور شامل کرتا اور سر بھی ہمیشہ بہترین مشوروں سے نوازتے تھے۔ تحقیقی اداروں اور کالجز کے لیے ان کے ذہن میں ایک بڑا اہم خاکہ تھا جس کو وہ عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ Departmental Reasearch Support (DRS-II) پروگرام کو لانے کے لیے سر نے بہت محنت کی تھی، جس کے نتیجہ میں شعبہ کو تقریباً سوا کروڑ روپئے کی یو جی سی گرانٹ منظور ہوئی تھی۔ سر شعبہ کو Advanced Study center بنانا چاہتے تھے۔ شعبہ کے اساتذہ کے ساتھ کالج اور یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے اساتذہ کی ایک بڑی تعداد سے بھی سر کے بہت اچھے مراسم تھے۔ تمام ہی لوگ سر کو بہت پسند کرتے تھے اور ان کے اخلاقی محاسن اور علمی صلاحیتوں کے قدردان تھے۔

ایم ڈی کے زمانۂ طالب علمی میں ہم طلبہ نے محسوس کیا کہ اصول دواسازی کے نام سے صیدلہ سے متعلق سر ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔ جو کتاب فن دواسازی کے عنوان پر ایک بڑی اہم کتاب ثابت ہوگی کیونکہ اس میں سر نے قدیم صیدلی اعمال کو جدید سائنس کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ بعد میں مسودے کے بعض حصوں کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ سر نے اس کتاب میں ہر اس سوال کا جواب فراہم کیا ہے جو صیدلہ کے طالب علموں کے ذہنوں میں یونانی ماخذ کے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے۔ صیدلہ کے جدید فن کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ جب میں نے ۲۰۰۶ء کے اوائل میں علی گڑھ کو خیرآباد کیا تو اس کا مسودہ کتابی شکل لے چکا تھا لیکن سر اس میں مستقل حذف واضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ NIUM چلے گئے اور پھر وہاں سے واپس علی گڑھ آگئے۔ اس درمیان انھوں نے اس مسودے کو اپنے بعض شاگردوں کو پروف ریڈنگ کے لیے دیا۔ میرے ذمے اس کتاب میں شامل ہونے والے آلات کی اسکیچنگ اور فوٹو ڈیزائننگ کا کام تھا جس کو کتاب میں عین موضوع کے پاس سیٹ کرنا تھا۔ پھر اس کی طباعت کی بات NCPUL سے چلی لیکن بات نہ بن سکی بالآخر سر نے اسے خود سے ہی شائع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت سر پورے طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ اس کتاب کو طباعت کے لیے بھیج دیں۔ ہم لوگ بھی بہت دنوں سے اصرار کررہے تھے کہ کتاب کو جلد از جلد چھپ جانا چاہیے تاکہ وہ استفادہ عام کا سبب ہو۔ اس کتابی مسودے کی کچھ کاپیاں بعض قریبی شاگردوں کو بغرض مطالعہ اور انٹرویو کی تیاری کے لیے بھی مرحمت کیا تھا۔

۹ر فروری ۲۰۲۱ء کو صبح ۸ر بج کر ۴۱ر منٹ پر سر کا فون آیا جو معمول کے بالکل برعکس تھا کیونکہ وہ اکثر شام کو فون کیا کرتے تھے۔ میں اس وقت کالج جانے کی تیاری میں تھا، میں نے فون اٹھایا اور بات شروع ہوئی تو سر نے کہا کہ تین چیزیں بتانے کے لیے فون کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ تمھارے Duplex کا کام آج سے شروع ہوگیا ہے، دوسرے کسی پیپر کے تعلق سے کچھ بتایا پھر کہا کہ تیسری بات یہ ہے کہ میری صیدلہ والی کتاب چھپ گئی ہے۔ میں بہت خوش ہوا اور سر کو مبارکباد دی، لیکن لگا کہ سر خاموش ہیں، پھر کہنے لگے کہ اس پر نام کسی اور کا آگیا ہے۔ مجھے لگا کہ شاید ٹائٹل پیج میں کوئی غلطی ہوگئی ہے، میں تیزی سے بولے جارہا تھا کہ پبلشر سے کہہ کر اس کو درست کروادیا جائے گا مگر جب انھوں نے بتایا کہ اصل میں ان کے ساتھ ان کے ہی ایک بہت قریبی شاگرد کے ذریعہ خیانت کی گئی ہے تو مجھے بہت صدمہ پہنچا۔ وہ اس واقعے سے بے حد آزردہ تھے، تقریباً دو دنوں تک گھر میں بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا، بس رنجیدہ رہتے تھے پھر کافی اصرار پر اہلیہ کو بتایا اور اپنا غم ہلکا کرنے کے لیے اپنے چند شاگردوں کو بھی مطلع کیا جن میں میں بھی شامل تھا۔ بالآخر اسی غم اور صدمے کی حالت میں وہ کووڈ سے متاثر ہوئے اور اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کی خدمات کو قبول کرے، ان کی علمی تحقیقات کو صدقۂ جاریہ بنائے، ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا کرے، ان کی اہلیہ اور بچوں کے لیے ہر طرح کی آسانی پیدا کرے، ان کی قبر کو کشادہ کرے، اس کو نور سے بھردے، ان کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت کرے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، اور یونانی طب کو ان کا بہترین نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین! ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

آنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اٹھا

ڈاکٹر محمد ارشد جمال ☆

یہ کیا ہوائیں گزرتی ہوئی ابھی گئی ہیں

ماضی قریب میں دنیائے انسانیت نے ایسی ناگفتہ بہ ساعتوں کا مشاہدہ کیا ہے جسے حقیقی معنوں میں ''سانسیں تنگ ہوجانے'' کی عملی تصویر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔کورونا کی عالمی وباء نے جس انداز سے ماحول کو مسموم کردیا تھا گویا اس نے ہواؤں کے بدن پر کانٹے اگادیے ہوں جو ہر ذی روح کی قبا سے ریشم ادھیڑنے کے کام پر مامور ہو۔گویا ہواؤں نے اپنے ہاتھ میں پتھر اٹھالیے ہوں اور چن چن کر ہر ذی نفس کو زخمی کردینے کے درپے ہوں۔کوئی بھی نفس ایسا نہیں تھا جو اس وباء کی ستم سامانیوں سے محفوظ رہ سکا ہو۔کوئی اس سے تحفظ کے حصول کے لیے اذیت کی خاک پھانکنے پر مجبور تھا، کوئی مرض کی زد میں آکر بے حال تھا، کوئی اس کے عوارضات سے زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا، کسی پر اعزہ واقرباء کی رحلت کا صدمہ پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑا تھا، کسی پر اپنے سرپرست کو کھودینے کا غم مسلط تھا تو کسی کو اپنے سہارے کی لاٹھی کے ٹوٹ جانے کا رنج کھائے جارہا تھا۔غرضیکہ پورا عالم ایک عجیب طرح کی بے سروسامانی اور وحشت سے دوچار تھا، ایک عجیب ہُو کا عالم تھا جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔معیشت سے لے کر معاشرت تک انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جو اس کی زد میں آنے سے محفوظ رہ سکا ہو۔ ؎

منظور دل کو شرح غم داستاں نہیں
بتلائیں کیا کہ درد کہاں ہے کہاں نہیں

سخن سراؤں سے زہرہ جبیں چلے گئے ہیں

کورونا کی عالمی وباء نے جہاں زندگی کے ہر دوسرے شعبے کو متاثر کیا وہیں اس نے انسانی جانوں کے ضیاع کی ایک طویل فہرست بھی مرتب کی ہے۔کیا عام، کیا خاص، کیا امیر، کیا غریب، کیا تاجر، کیا مزدور، کیا شرفاء، کیا اتقیاء، کیا محلات، کیا جھوپڑپٹیاں، جہاں جہاں اور جس جس تک اس کی رسائی ہوئی اس نے موت کے پنجے گاڑنے میں کسر نہیں چھوڑی۔اس ام الوباء کی تباہ کاریوں کے طفیل بے شمار علمی وادبی شخصیات نے اس جہان فانی سے اپنے رشتے کو منقطع کرلیا اور اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔متعدد ایسی شخصیتیں، جن سے علم وفن اور تہذیب و ثقافت کی بازیافتیں منسوب تھیں، داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئیں۔کئی ایسے چاند جو سر آسماں اپنی روشنی بکھیرنے میں منہمک تھے نہ صرف یہ کہ ماند پڑ گئے بلکہ شاخ فلک سے تعلق کو بحال رکھ پانے میں بھی ناکام رہے۔ادباء وشعراء، اطباء ومحققین، علماء و سائنس داں غرضیکہ علوم وفنون سے جڑے افراد کی ایک بڑی کھیپ آن کی آن میں ہم سے بچھڑ کر خون کے آنسو رونے پر مجبور کرگئی اور ہم ''میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو'' کی تفسیر بن کر رہ گئے ہیں۔ ؎

کیا جانے وہ ستارہ جبیں کون لوگ تھے
محراب شب میں نور بچھا کر چلے گئے

جو محبتوں کی اساس تھے وہی لوگ ہم سے بچھڑ گئے

کووڈ کی وبا میں ہم نے بہتوں کو کھویا، بہتوں نے ہماری جبینوں پر مفارقت کے داغ ثبت کیے۔ہمارے والدین نے ہم سے ہاتھ چھڑالیا جن کی انگلی تھام کر قدم آگے بڑھانے کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا، ہم سے ہمارے ان رشتہ داروں نے ناطہ توڑ لیا جو ہمارے خونی شریک تھے، ہمارے وہ رفقائے کار ہم سے دامن چھڑا گئے کہ پیشہ ورانہ زندگی میں جن کی پل پل معیت ہمیں نصیب تھی، ہمارے وہ دوست واحباب زندگی سے روٹھ گئے جن کے دم سے ہمیں خوش حالی وشادابی کے لمحات میسر تھے، ہمارے ان اساتذہ نے اپنے سینے میں موجود سانسوں کی لڑی توڑ کر پھینک دی جنھوں نے ہمیں رہ زیست کے انمول قرینوں سے متصف کیا: ع

☆ اسوشئیٹ پروفیسر، شعبۂ امراض جلد وتزئینیات، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور، کرناٹک۔E-mail:sarimnium@gmail.com، Mob.No:7767993333۔

کس کس کو یاد کیجئے کس کس کو روئیے

بچھڑنے اور زندگی سے روٹھ جانے والے احباب کی اس گونا گونی میں چند ایسے لوگ بھی ہیں جن کے ہجر کا غم ہنوز سینے کا الاؤ بنا ہوا ہے اور ساعت بہ ساعت شرر بار ہو کر روح کو زخمی کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب بھی ان کی یادوں کے بجھے ہوئے چراغ سے مٹی اڑائی جاتی ہے ذہن وخیال کی دیواروں سے روشنی کی تہیں لپٹ جاتی ہیں۔ستارے، چراغ، انجم ومہتاب حقیقی معنوں میں ان کی ذات کے استعارے ہیں۔رنگ ونور، خوشبو، پاکیزگی اور حلاوت جیسی صفات جن کی عادات واطوار کے جھرنوں سے تراوش پانے والے مظاہر ہوتے ہیں جنھیں محسوسات کی بساط پر دور تک اور دیر تک بنے رہنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی ہی شخصیات میں یونانی طب کی ایک قد آور شخصیت پروفیسر غفران احمد مرحوم کی ذات بھی تھی جن کی رحلت کے سبب ہماری روحیں کلیجہ تھامیں کھڑی ہیں اور ہم کانٹوں سے اپنے زخموں کی رفوگری میں لگے ہوئے ہیں۔ ؎

آسماں کے رخ پہ اپنی ضوفشانی چھوڑ کر
چاند رخصت ہوگیا یادیں سہانی چھوڑ کر

وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی

پروفیسر غفران احمد مرحوم عصری طبی تاریخ کا ایک روشن اور تابندہ باب تھے۔ ان کی ہستی شہرت اور مقبولیت کے مدارج سے کہیں آگے محبوبیت کے مقام پر فائز تھی۔ وہ اذہان کے دریچوں میں قندیل بن کر جگمگاتے رہنے کی تاثیر سے مملو تھے۔ ان کی ذات دراصل اجالوں کی ایک ایسی برق تھی جو کسی بھی تاریک خلا کو پُر کرنے کی مجاز تھی۔ان کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جسے بآسانی خانہ یادداشت سے محو نہیں کیا جاسکتا۔ فی الوقت خلیل جبران کی تحریر کا ایک اقتباس میری نگاہوں کے روبرو رقصاں ہے:

"ما زِلْتُ أُؤمِنُ أنَّ الإنسانَ لا يَمُوتُ دَفْعَةً واحِدَةً وَإنَّما يَمُوتُ بِطَرِيقَةِ الأجزاء كُلَّما رَحَلَ صَدِيقٌ ماتَ جُزْءٌ وكُلَّما غادَرَنا حبيبٌ ماتَ جُزْءٌ وكُلَّما قُتِلَ حُلْمٌ مِنْ أحْلامِنا ماتَ جُزْءٌ فَيَأتِي المَوْتُ الأكْبَرُ لِيَجِدَ كُلَّ الأجزاءِ مَيِّتَةً فَيَحْمِلُهَا وَيَرْحَلُ۔"

ترجمہ: ''میں اب بھی مانتا ہوں کہ انسان ایک دم نہیں مرتا بلکہ وہ ٹکڑوں میں مرتا ہے۔ جب بھی کوئی دوست رخصت ہوتا ہے، ایک حصہ مرجاتا ہے۔اور جب بھی کوئی محبوب ہم سے جدا ہوتا ہے، ایک حصہ مرجاتا ہے۔ اور جب بھی ہمارے خوابوں میں سے کوئی خواب بکھرتا ہے، ایک حصہ مرجاتا ہے۔اور یوں، آخر میں، حتمی موت آتی ہے، تاکہ تمام مردہ اجزاء کو سمیٹ کر اٹھالے جائے۔''

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی رحلت کا صدمہ بھی فی الواقع ایک ایسا ہی صدمہ ہے جو پل پل ہمیں مارتا رہے گا۔ وہ ہمارے لیے محض علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ علم الادویہ کے ایک لائق وفائق استاذ ہی نہیں تھے بلکہ وہ طبی دنیا کا ایسا خواب تھے جسے ہر آنکھ نے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اسے بہ حسرت تمام سجو کر رکھا تھا۔ یونانی طب سے جڑی ہوئی کتنی ہی خوش نما تعبیریں تھیں جنھیں ان کی ذات سے جوڑ کر دیکھا جارہا تھا، کتنے ہی ایسے ناتمام خاکے تھے جن میں ان کی ذات کے توسط سے رنگ بھرا جانا تھا، کتنے ہی ایسے مٹی کے خام نمونے تھے جنھیں سرِ چاک ان کے لمسِ کوزہ گری سے مشکّل ہونا تھا۔لیکن قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا وہ عمر عزیز کی ڈھلوان پر ہی اپنے سیکڑوں چاہنے والوں کو غم زدہ چھوڑ کر کورونا کے ہاتھوں پیوند خاک ہوگئے اور شام ہونے سے قبل ہی موت کی سیاہ چادر میں روپوش ہوگئے۔ راحت اندوری نے غالباً ایسے ہی موقع کے لیے یہ شعر کہہ رکھا تھا: ؎

مذاق اچھا رہے گا یہ چاند تاروں سے
میں آج شام سے پہلے ہی ڈھل کے دیکھوں گا

وسعتیں، خاموشیاں، گہرائیاں

اعظم گڑھ کی شاداب اور زرخیز مٹی کے خمیر سے نمو پانے والے پروفیسر غفران احمد کی شخصیت میں ایک طرف جہاں وہاں کے معتبر ترین دینی تعلیمی ادارے جامعۃ الفلاح کی تربیت کا پَرتَو موجزن تھا وہیں ان کی ذات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تہذیب کی ساری اشارتیں بھی نمو پذیر تھیں۔ وہ علم وعمل کے توازن کی اعلیٰ مثال تھے۔ وہ اپنی ہستی میں کسی سمندر سے کم نہ تھے لیکن تبحر علمی سے آراستہ ہونے کے باوجود تندخوئی کو اپنے آس پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔نرم روی ان کے مزاج کا خاصہ تھی، اکثر اوقات خاموشی کو گفتگو کا وسیلۂ اظہار بناتے، بولتے تو کم گوئی سے دامن استوار رکھتے۔ کسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے تو

علمیت کے اثر سے ان کی پیشانی چمکتی رہتی۔ ایسے ایسے نکات کو موضوع کا حوالہ بناتے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے اور ان کی وسعتِ نظری کی داد دیے بغیر خاموش نہ رہتے۔ فلسفیانہ اور منطقی موضوعات پر بھی ایسے خوبصورت پیرائے میں وضاحت کناں ہوتے کہ وہ آیتوں کی طرح ذہن و دل میں اترتے محسوس ہوتے۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے:۔

فکر میری گہر اندوز، اشارات کثیر
کلک میری رقم آموز، عبارات قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

پروفیسر غفران احمد مرحوم کے پاس چیزوں کو دیکھنے اور پرکھنے کا بہت ہی واضح تصور موجود تھا۔ فکری و نظریاتی سطح پر ان کے یہاں ایسا شاندار استحکام پایا جاتا تھا جو فی زمانہ لوگوں میں نادر و نایاب ہے۔ وہ وجودی مسائل اور مذہبی و روحانی معاملات ہر ایک حوالے سے اپنی رائے رکھتے تھے۔ خواہ وہ قدیم طبی عناوین ہوں، یا جدید عصری موضوعات، ان کا تعلق طبی مبادیات سے ہو یا اطلاقیات سے، ہر پہلو ان کے یہاں انتہائی شفاف اور الجھاؤ سے پاک عناصر سے تشکیل پاتا تھا۔ انھوں نے طب کا علم ہی نہیں حاصل کیا تھا بلکہ اس کے سفرِ ارتقاء کے ہر سنگ میل پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ بظاہر خاموش رہنے والی ان کی ہستی میدانِ عمل میں ویسی ہی فعال اور سرگرم رہتی تھی۔ وہ کوتاہیوں اور کمیوں سے گھبرا کر توسنِ عمل کی باگ موڑنے کے قائل نہ تھے بلکہ استقلال اور سخت کوشی کے ساتھ منصب پر ڈٹے رہنے کے حامی تھے۔ تدریس سے لے کر تحقیق تک، تالیف سے لے کر ترتیب تک اور ادارت سے لے کر تنظیم تک ہر عمل ان کے یہاں اپنی خوبصورت ترین شکل میں انجام کو پہنچتا تھا۔ ان کے وجود کے کشکول میں شائستہ، کھرے، سچے، صالح اور نیک اطوار سکے متواتر کھنکتے رہتے جو لوگوں کی توجہ کا مرکز ٹھہرتے۔ ان کے گلستانِ طینت میں پاکیزگی کے ایسے خوش رنگ پھول کھلتے تھے جس کی کشش بے اختیار خوشبو پسند لوگوں کو اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔ بقول علامہ اقبالؔ:۔

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

وہ ترا پھول سا لہجہ و شگفتہ اسلوب

پروفیسر غفران احمد مرحوم اپنی ذات میں تاروں بھری انجمن تھے۔ وہ طلبہ کے لیے سراپا آئینۂ شفقت، اساتذہ کے محبوب نظر، علمی و ادبی حلقوں میں ممتاز، دوستوں کے درمیان بے تکلف، داد و ستائش سے بے نیاز، تملق و چاپلوسی سے متنفر، فیاضی و فراخ دلی سے آباد، بے جا تکلفات سے گریزاں، تصنع و بناوٹ سے دور، کبر و ریا و خود نمائی سے پاک، فیاضانہ شان سے زندگی بسر کرنے والے پرکشش اور دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔ محفلوں میں عموماً احباب کی گفتگو میں مخل ہونے سے اجتناب کرتے لیکن جہاں ضروری سمجھتے یا جب ان سے بولنے کے لیے کہا جاتا تو پھر ''ساری محفل بھول گئی تیرا لہجہ یاد رہا'' کے مصداق ہو جاتے۔ وہ یوں تو میدانِ قلم کے شہسوار تھے لیکن جب کبھی بھی تقریر کی لذتیں ان کے نطق کا بوسہ لینے پر آمادہ ہوتیں اور وہ اپنی رَو میں ہوتے تو سماعتیں شیرینی کشید کرتی رہ جاتیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں گفتگو کرنے پر یکساں قدرت رکھتے تھے تاہم مادری زبان سے بے پناہ محبت کے سبب وہ مقامات جہاں انگریزی میں گفتگو ناگزیر نہ ہوتی اردو کو ہی ترجیح دیتے اور گل افشانی گفتار کی ایسی مثال پیش کرتے کہ زبان و بیان کے دامن شگفتگی سے بھر جاتے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن کی کسی تقریب میں سخن سرا ہوئے تو طلبہ و طالبات کے ناموں کو الفاظ کی لڑی میں اس انداز میں پرو کر پیش کیا، لوگ حیران تھے کہ جملوں کی معنویت اور اس کے طلسم پر سر دھنیں یا ناموں کے استعمال کی خوش اسلوبی پر عش عش کریں۔ مرزا غالبؔ ایک بار پھر یاد آ رہے ہیں:۔

ترا انداز سخن شانہ زلف الہام
تری رفتار قلم جنبش بال جبریل

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے

استادِ محترم پروفیسر غفران احمد مرحوم کی شخصیت ایک انتہائی خلیق اور مہربان مٹی سے وجود پاتی تھی۔ ان کی ذات بے لوثی، اخلاص اور اپنائیت کا مرقع تھی۔ ہر کسی کی فریاد رسی کے لیے ہمہ تن گوش، ہر کسی کے رنج و غم میں شریک، ہر کسی کے تعاون کے لیے آمادہ۔ کوئی بھی ان کے در پر کاسۂ ضرورت لے کر آتا تو خالی ہاتھ نہ جاتا۔ حاجت روائی جیسے ان کے آستانے کی شان تھی۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ

سامنے والے کی پیاس کو از خود محسوس کر لیتے اور بڑھ کر اس کا گلاس بھر دیتے۔ ہر وقت لوگوں کی علمی و قلمی امداد کے لیے برسر پیکار رہتے۔ کبھی کسی کی synopsis کو انجام تک پہنچا رہے ہیں، کبھی کسی کے ریسرچ پروٹوکول کو آخری شکل دے رہے ہیں، کبھی کسی کی تھیسس کو اصلاح و ترمیم کے مراحل سے گزار رہے ہیں، کبھی کسی کے مضمون میں امکانات کے در تلاش کر رہے ہیں تو کبھی کسی کی کتاب پر تقریظ لکھ کر اس کی اہمیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ تعاون اور معاونت کا یہ سلسلہ نہ صرف یہ کہ انفرادی سطح پر قائم رہتا بلکہ شعبہ جاتی اور ادارہ جاتی سطح پر بھی وہ اپنی وسعت نظری، مقصد برآوری اور جاں فشانی کے سبب لوگوں کی نگاہوں کا مرکز ٹھہرتے۔ اکثر اوقات یہ نوبت بھی آجاتی کہ سارا کام خود ان کے سر پر آن پڑتا جسے وہ تمام تر خوش اسلوبی کے ساتھ اختتام کو پہنچاتے۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی شخصیت کا ایک اہم اعجاز یہ بھی تھا کہ وہ ہر ملاقاتی کے دل میں گھر کر جانے کی بے پناہ صلاحیت سے مالا مال تھے۔ ایک عجیب طرز کی شانِ محبوبیت اور جاذبیت ان کی ذات کا حصہ تھی۔ جو بھی ان سے ملتا نہ صرف ان کا گرویدہ ہو جاتا بلکہ انھیں اپنا سب سے بڑا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا۔ جس سے بھی ان کے حوالے سے معلوم کیجیے اس کا دامن ان کے کسی نہ کسی احسان سے گراں بار ضرور ملتا، جس کسی سے بھی ان کا تذکرہ کیجیے وہ ان کے لیے رطب اللسان ہوتا اور ان پر ریشہ خطمی پایا جاتا۔ طلبہ و اساتذہ کی ان کے لیے مدح سرائی تو سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ان کا آپس میں ایک مستقل تعلق اور انسلاک بنا رہتا ہے لیکن دیگر ماتحتوں کی ایک بڑی تعداد جو ان سے محض چند دنوں کی رفاقت کے امین ہیں وہ بھی ان پر ویسے ہی فریفتہ نظر آتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان کا ذکر خیر آتے ہی لوگوں کی آنکھوں میں ان کے لیے عزت و احترام کی لو روشن ہو جاتی ہے۔ عمیر نجمی نے سچ ہی کہا ہے:

یہ نہیں ہے کہ فقط میں ہی اسے چاہتا ہوں
جو بھی اس پیڑ کی چھاؤں میں گیا، بیٹھ گیا

سامنے کوئی بحسنِ انتظام آ ہی گیا

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی فعالیت کا دائرہ بہت وسیع اور متنوع تھا۔ ایک اور پہلو جو ان کی شخصیت کو انفراد بخشتا تھا وہ ان کی انتظامی صلاحیت تھی۔ کم ہی اسکالرس ایسے ہوتے ہیں جو علم اور اس کے متعلقات پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ انتظامی امور اور اس کی پیچیدگیوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ چنانچہ استاذ محترم کو خوش انتظامی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ وہ ذمہ داریوں کی مشکل بھری رہ گزر پر بھی بہ سہولت گزر جانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اپنی اسی صلاحیت کے سبب انھوں نے تدریس و تحقیق سے وابستہ رہتے ہوئے بھی نہ صرف ملکی و بین الاقوامی علمی اجتماعات اور سیمیناروں کے انعقاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ اجمل خان طبیہ کالج اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں شعبۂ علم الادویہ کی صدارت کرتے ہوئے طلبہ و اساتذہ اور متعلقین کے دلوں پر راج بھی کیا۔ علاوہ ازیں این آئی یو ایم میں ڈپٹی ڈائریکٹر شپ کے عہدے پر فائز رہتے ہوئے آپ نے انتظام کار کی ایک نہ مٹنے والی نظیر بھی چھوڑی ہے۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ ان کی موجودگی کے باعث اس وقت کے ڈائریکٹر پروفیسر مستحسن علی جعفری صاحب کے شانے جو ذمہ داریوں کے بوجھ سے جھکے رہتے تھے ایسے سبک ہو گئے تھے کہ گویا ان پر کبھی سرگرانی طاری ہی نہ ہوئی ہو۔

عام طور پر کسی منصب پر فائز ہونے کے بعد صاحب مسند کے لیے ہر کسی کو خوش رکھ پانا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ بعض ضرورتوں کی تکمیل چند ناگفتہ بہ اور نامساعد حالات کے پیش نظر زیر التوا بنی رہتی ہے۔ کبھی کچھ ایسے تکنیکی مسائل بھی ہوتے ہیں جن کا ادراک صرف ذمہ داران کو ہوتا ہے، ماتحت افراد ان تک رسائی سے قاصر رہتے ہیں، ایسی صورت میں عہدہ داروں سے بدگمان اور نالاں ہونے کے وافر مواقع ہوتے ہیں۔ عام روایت بھی یہی ہے کہ موجودہ افسر کو سابقہ کے مقابلے ہمیشہ ناموزوں قرار دیا جاتا ہے اور ادارے سے جڑے ہوئے زیادہ تر لوگوں کی زبان پر ان کے لیے حرف شکایت ہی پایا جاتا ہے۔ اس حقیقت کے برعکس پروفیسر غفران احمد مرحوم کی شخصیت میں نہ جانے ایسا کون سا سحر تھا کہ خواہ وہ صاحب منصب ہوں یا نہ ہوں، کسی عہدے پر متمکن ہوں یا نہ ہوں، کسی ذمہ داری کا بوجھ ان کے سر پر موجود ہو یا نہ ہو ان کی ذاتِ خوش اطوار سے کسی کو نالاں نہیں دیکھا گیا۔ کسی کو بھی ان کے خلاف شکایت کناں نہیں پایا گیا۔ انھیں تو بس ایک درویش کی طرح اس شعر کا آئینہ بنے رہنے سے مطلب تھا:

کبھی خواص میں شامل کبھی عوام میں ہم
لگے ہوئے ہیں زمانے کے انتظام میں ہم

جس کی تحقیق نے قطروں سے نکالے دریا

پروفیسر غفران احمد مرحوم کے علمی مقام و مرتبے کی رفعت کا سب سے معتبر حوالہ ریسرچ و تحقیق کے تئیں ان کا جنون تھا۔ طبی ریسرچ کے حوالے سے ان کی یہ بے پناہ دلچسپی اور حد درجہ شوق بظاہر ان کے اساتذہ بالخصوص پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، پروفیسر کنور محمد یوسف امین، پروفیسر آفاق احمد اور پروفیسر نعیم احمد خان کی فیض رسانیوں کا رہین منت معلوم ہوتا ہے جنھوں نے ان میں موجود اتھاہ صلاحیتوں کے دریا کو دریافت کر کے اسے درست اور مناسب سمت عطا کی۔ تاہم ان کی ذاتی للک نے بھی انھیں اس میدان خاص کا سرخیل بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج کا امتیاز جہاں اس کی قدامت ہے وہیں تکنیکی وسائل کی فراہمی اور جدید علوم سے آراستہ اساتذہ کی موجودگی نے بھی اسے اعلیٰ قدروں کا امین بنایا ہے چنانچہ پروفیسر غفران احمد مرحوم نے مہیا ان دونوں دہلیز کی جبیں سائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور ان سے خوب خوب کسب فیض کیا۔ تحقیق کے میدان میں ان کی آگہی کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جدید سائنٹفک طبی مجلّات و رسائل ان کے مطالعہ کا حصہ ہوتے تھے۔ ایسے متعدد جرنلس جن سے عام وابستگان طب کی بصارتیں آشنا بھی نہیں ہوتی تھیں، ان کے مطالعے کی میز کی زینت ہوتے۔ غالباً یہی وجہ تھی پوسٹ گریجویشن کی سطح پر شعبۂ علم الادویہ کے ساتھ ساتھ دیگر شعبہ جات کے طلبہ بھی اکثر اوقات اَن سلجھی گتھیوں کے ہمراہ ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر رہتے اور ان کے حل کے ساتھ خوشی خوشی واپس جاتے۔ انھوں نے ایم ڈی میں صرف شعبۂ علم الادویہ کے طلبہ کی ہی سرپرستی نہیں کی ہے بلکہ وہ دیگر شعبہ جات میں بھی طلبہ کے نائب نگراں رہے ہیں۔

استاذ محترم کی تحقیقی دلچسپیاں یوں تو کسی ایک محور پر مرتکز نہیں تھیں، وہ جسمانی نظام کی ہر کڑی سے یکساں واقفیت رکھتے تھے لیکن امراض نظام بول اور امراض مفاصل سے انھیں خاص علاقہ تھا۔ انھوں نے اپنے زیر نگرانی مکمل ہونے والے مطالعہ جات میں بول و مفاصل کے مخصوص نظام سے تعلق رکھنے والی دواؤں کی تاثیرات کو پرکھنے میں خاص رغبت دکھائی ہے۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ امراض گردہ پر کام کرنے کے لیے آمادہ طلبہ کو انھوں نے اپنی سرپرستی عطا کرنے میں فوقیت دی ہے۔ بہرحال یہ ایک ضمنی بات ہوئی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ان کے زیر نگرانی مکمل ہونے والی تحقیقات کی فہرست مہیا کر دی جائے تاکہ جائزہ لینے والے اس کی روشنی میں درست سمت کی تعیین کر سکیں۔

نمبر شمار	عنوان	اسکالر کا نام	شعبہ	سال
۱	دافع وجع المفاصل یونانی قرابادینی مرکب کی تاثیر و تحفظ کا طبی مطالعہ	نفیس احمد قاسمی	علم الادویہ	۱۹۹۸ء
۲	سفوف مہزل کی سائنٹفک قدر پیمائی: ایک قرابادینی یونانی مرکب	لئیق احمد	علم الادویہ	۱۹۹۹ء
۳	چند یونانی دواؤں کی دافع ذیابیطس صلاحیت	کلیم اللہ	علم الادویہ	۱۹۹۹ء
۴	الاحمر اور شنگرف کا تقابلی دوائی مطالعہ	معراج الحق	علم الادویہ	۲۰۰۰ء
۵	معجون فلاسفہ کی سائنٹفک قدر پیمائی	غلام الدین صوفی	علم الادویہ	۲۰۰۰ء
۶	ایک یونانی مرکب کی مخالف قروحِ معدہ تاثیرات اور طبعی کیمیاوی درجہ بندی	نسرین جہاں	علم الادویہ	۲۰۰۱ء
۷	حاد تجرباتی اسہال میں یونانی مرکب کی دوائی تاثیر	محمد علیم خان	علم الادویہ	۲۰۰۲ء
۸	سبحنہ اور کسوندی کا طبعی کیمیاوی اور دوائی مطالعہ: دو کم تفتیش شدہ یونانی دوائیں	بلال احمد	علم الادویہ	۲۰۰۳ء
۹	حصاۃ کلیہ کے مریضوں میں کیلشیم سائٹریٹ کے تناسب پر شربت آلو بالو کا قلیل المیعاد اثر	منظور احمد	علم الجراحت	۲۰۰۳ء
۱۰	جراحت کے مریضوں میں برشعشا کے مسکن اور دافع درد اثرات کی قدر پیمائی	شکیل احمد	علم الجراحت	۲۰۰۴ء
۱۱	چند دافع وجع المفاصل دواؤں کا طبعی کیمیاوی اور دوائی مطالعہ	مسرت نفیس	علم الادویہ	۲۰۰۴ء

۱۲	چند یونانی مرکبات کے مانع تکسید خواص	محمد عامر	علم الادویہ	۲۰۰۵ء
۱۳	برشعشا اور حب شفا کے مسکن، دافع درد اور دافع اضطراب اثرات کا تقابلی مطالعہ	محمد کاشف	علم الجراحت	۲۰۰۵ء
۱۴	چند محافظ گردہ دواؤں کی طبعی کیمیاوی درجہ بندی اور دوائی مطالعہ	وسیم احمد	علم الادویہ	۲۰۰۶ء
۱۵	چند دافع وجع المفاصل یونانی دواؤں کا مطالعہ	محمد طیب	علم الادویہ	۲۰۰۷ء
۱۶	وجع المفاصل مزمن میں مستعمل چند یونانی ادویہ کا دوائی مطالعہ	محمد جاوید	علم الادویہ	۲۰۰۷ء
۱۷	کیمیاوی طور پر پیدا کیے گئے تسمم گردہ میں خرفہ کے محافظ گردہ اثرات کی تشخیص	سلمیٰ جبین	علم الادویہ	۲۰۰۹ء
۱۸	تجرباتی جانوروں میں تخم کشنیز کی دافع قرحہ تاثیرات کی تشخیص	شگفتہ نکہت	علم الادویہ	۲۰۰۹ء
۱۹	غذائی طور پر پیدا کیے گئے فرط تدسم فی الدم اور تصلب شرائین میں سداب کی تاثیرات کا تجرباتی مطالعہ	شبیر احمد پرّے	علم الادویہ	۲۰۱۰ء
۲۰	تجرباتی جانوروں میں تخم کرفس کے مفتت حصاۃ خواص کی قدر پیمائی	تبارک حسین	علم الادویہ	۲۰۱۰ء
۲۱	چوہوں میں تجرباتی طور پر پیدا کی گئی ذیابیطس میں گلنار فارسی کی دافع ذیابیطس تاثیرات کا مطالعہ	علویہ خان	علم الادویہ	۲۰۱۲ء
۲۲	درونج عقربی کے قلبی عروقی افعال کا مطالعہ	ہما مقصود	علم الادویہ	۲۰۱۳ء
۲۳	بسہری بوٹی کی محافظ گردہ اور مدر تاثیرات کا مطالعہ	نجم الدین صدیقی	علم الادویہ	۲۰۱۴ء
۲۴	امراض بول کے مریضوں میں یوروفلومیٹری میں ہونے والی تبدیلیاں اور قرص کاسنج کی تاثیرات کا مطالعہ	امتیاز احمد	علم الجراحت	۲۰۱۶ء
۲۵	چند یونانی دواؤں کی دافع وجع المفاصل تاثیرات	محمد ذاکر صدیقی	علم الادویہ	۲۰۱۶ء
۲۶	ذیابیطس شکری کے علاج میں قرص ذیابیطس کی معالجاتی حیثیت	بشریٰ ابرار	علم الادویہ	۲۰۱۷ء
۲۷	وجع المفاصل کے مریضوں میں حب گل آک کی معالجاتی تشخیص	اسماء عابد	علم الادویہ	۲۰۱۷ء
۲۸	ورم معدہ و اثنا عشری کے ایچ پائلوری مثبت ومنفی مریضوں میں یونانی مرکبات کا کردار	شفیق احمد خان	علم الجراحت	۲۰۱۷ء
۲۹	یونانی مرکب کی تاثیر وتحفظ کا دستیاب دواؤں (Finasteride & Tamsulosin) سے تقابلی مطالعہ	محمد طارق	علم الجراحت	۲۰۱۸ء
۳۰	چند یونانی دواؤں کا طبعی و کیمیاوی اور مانع تکسید اثرات کا مطالعہ	ترنم خانم	علم الادویہ	۲۰۱۸ء
۳۱	قوبا کے علاج میں مقامی طور پر مستعمل یونانی مرکب کا رینڈمائیزڈ کنٹرولڈ کلینکل مطالعہ	سعود احمد	علم الادویہ	۲۰۱۹ء
۳۲	قلت حوینات منویہ کے علاج میں ایک غیر قرابادینی مرکب کا مطالعہ	مکرم علی	علم الادویہ	۲۰۱۹ء
۳۳	ایک محافظ گردہ قرابادینی مرکب طبیخ کاسنج کا اینمل ماڈل میں تجرباتی مطالعہ	ندیم احمد	علم الادویہ	۲۰۱۹ء
۳۴	وجع المفاصل حداری کے علاج میں منضج و مسہل کے بعد حب گل آک کی افادیت کا معالجاتی مطالعہ	عبدالرحمٰن	علم الادویہ	۲۰۲۰ء

لوگ چن لیں جس کی تحریریں حوالوں کے لیے

پروفیسر غفران احمد مرحوم کا جنون صرف تحقیق کی تکمیل تک محدود نہیں تھا بلکہ معیاری ملکی و بین الاقوامی سائنٹفک جریدوں میں تحقیقات کی اشاعت کا اہتمام بھی ان کی اولین ترجیحات میں شامل تھا۔ وہ سائنٹفک رائٹنگ کی جملہ باریکیوں سے نہ

صرف آشنا تھے بلکہ اس کے بہترین پارکھ بھی تھے۔اس کا اندازہ ہمیں دوران تعلیم نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں جنرل کلب میں ان کی آراء سماعت کرنے کے بعد ہوا۔اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ وہ نکات جن کو ہم کسی خاطر میں لانے سے گریزاں رہتے وہ ان کی داخلیت کے ایسے اعلیٰ جواز پیش کرتے کہ سب حیران رہ جاتے، علاوہ ازیں بعض وہ چیزیں جو ہماری نظروں میں بہت معنی خیز ہوتیں ان کی توضیح کے بعد بے وقعت ہوکر رہ جاتیں۔متعدد عالمی طبی جرائد کے ادارتی بورڈ، مشاورتی کونسل اور ناقدین کے پینل میں ان کی شمولیت ان کی سائنٹفک تحریری لیاقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔یہی وجہ ہے کہ یونانی طب سے جڑے بے شمار اسکالرس اپنے تحقیقی مضامین کی اشاعت کے لیے ان کی ایک آخری نظر کو لازمی سمجھتے تھے۔

حقیقی معنوں میں استاذ محترم کی علمی لیاقت سے طبی دنیا کی واقفیت کی سب سے بڑی وجہ ان کے تحقیقی مقالات کی اشاعت ہی تھی۔ایک زمانہ تھا کہ یونانی دنیا تحریر وتخلیق کے نام پر ایک یا دو کتابوں کی اشاعت سے آگے کی سوچتی بھی نہیں تھی۔تحقیقات کی اشاعت سے تو گویا اسے کوئی علاقہ ہی نہیں تھا۔ایسے میں اگر کسی کا پہلا تحقیقی مقالہ ہی Elsevier جیسے معتبر ترین پبلشرز کے تحت شائع ہونے والے عالمی جریدے میں مقام پا جائے تو لوگوں کا اس کی طرف بنظر استعجاب دیکھنا واجب ٹھہرتا ہے۔یقینی طور پر استاذ محترم نے اپنے لیے طبی اشاعت کا ایک ایسا معیار متعین کر رکھا تھا جہاں تک لوگوں کا پہنچنا تو کجا سوچنا بھی ناممکنات میں شامل تھا۔بحیثیت تحقیق کار ومعاون محقق ان سے منسوب مجموعی مقالات کی تعداد سو سے بھی زائد پہنچتی ہے۔اہمیت کے پیش نظر ان میں سے کچھ انگریزی مقالات کے عناوین اردو شکل میں یہاں نقل کیے جا رہے ہیں:

☆ یونانی دواؤں کی اڈاپٹوجینک سرگرمی کے تجرباتی مطالعہ کا طریقہ کار

☆ متنوع تشاویش کے خلاف قیمتی پتھر پر مشتمل ایک یونانی مرکب کی انسدادِ تناؤ سرگرمی

☆ کلوی امراض میں بنادق البزور کے اثرات

☆ جوارش زرعونی سادہ کے دافعِ درد، دافعِ التہاب اور اسٹیرائیڈل اثرات

☆ التہاب کبد ویروسی کے مریض میں غیر قرابادینی یونانی مرکب کے محافظ کبد اثرات کا مطالعہ

☆ جوارش زرعونی سادہ کی طبعی وکیمیاوی میعار بندی

☆ پارہ پر مشتمل مرکب الاحمر کے مقوی باہ اثرات کا دوائی مطالعہ

☆ جوارش زرعونی سادہ کے محافظ کلیہ اور مدر بول اثرات

☆ چوہوں میں تجرباتی طور پر پیدا کیے گئے حادا سہال میں عرق عجیب کے محافظ اثرات

☆ چوہوں میں ایک نباتی مرکب کے دافع اسہال اثرات کا مطالعہ

☆ عرق عجیب کے دافع اسہال اثرات کا تجرباتی مطالعہ

☆ کاربن ٹیٹرا کلورائیڈ کے ذریعہ بہم پہنچائی گئی کبدی مضرت کے خلاف تخم کسوندی کے محافظ کبد اثرات

☆ بیخ سہجنہ کا طبعی وکیمیاوی مطالعہ

☆ یونانی مرکب کے دافع وجع المفاصل اثرات: ایک تجرباتی مطالعہ

☆ برگ سہجنہ کے محافظ کبد اثرات

☆ تخم کاہو کی طبعی وکیمیاوی معیار بندی

☆ چوہوں کے افعال مدرکہ پر معجون فلاسفہ کے اثرات

☆ حصاۃ کلیہ کے مریضوں میں شربت آلو بالو کے اثرات کا مطالعہ

☆ قرحہ معدی میں یونانی مرکب کی تاثیرات

☆ چوہوں میں بیریم سلفیٹ اور کیسٹر آئل کے ذریعہ پیدا کیے گئے حادا سہال میں دافع اسہال مرکب کے اثرات

☆ کسوندی کے برگ اور تخم کے طبعی وکیمیاوی مطالعہ جات

☆ برگ سہجنہ کے دافع حمیٰ ودافع درد اثرات

☆ کیا حلبہ کو درد انگیز وجع المفاصل میں استعمال کیا جاسکتا ہے؟ حلبہ کے دافع درد خواص کا کثیر خورا کی تجرباتی مطالعہ

☆ ایسپرن اور ایتھنال کے ذریعہ پیدا کیے گئے قرحہ معدی میں غیر قرابادینی مرکب کی تاثیرات کا مطالعہ

☆ غیر قرابادینی یونانی مرکب میں دافع التہاب اثرات کی تشخیص

☆ کسوندی کے دافع درد اور دافع حمی اثرات کا ابتدائی مطالعہ
☆ صمغ عربی کے طبعی و کیمیاوی مطالعہ جات
☆ ماقبل تخدیر علاج کے بہ طور حب شفا کے اثرات
☆ تخم کاسنی کی طبعی و کیمیاوی درجہ بندی
☆ اکلیل الملک کے پھل میں دافع التہاب اثرات کی تشخیص
☆ تخم کاکنج کی طبعی و کیمیاوی درجہ بندی
☆ تجرباتی طور پر پیدا کیے گئے اسہال میں پوست بیخ مدار کے اثرات
☆ چوہوں میں جنٹا مائی سن کے ذریعہ پیدا کی گئی کلوی مضرت میں کاکنج کے اثرات
☆ چوہوں میں اسٹریس کے ذریعہ پیدا کیے گئے قرحہ معدی میں تخم کشنیز کے دافع قرحہ اثرات
☆ Cisplatin کے ذریعہ پیدا کیے گئے کلوی مضرت میں کباب چینی کے محافظ کلیہ اثرات کا مطالعہ
☆ یونانی طب میں مذکور محافظ کبد دوائیں: ایک مطالعہ
☆ Freund's adjuvant کے ذریعہ چوہوں میں پیدا کیے گئے وجع المفاصل میں اکلیل الملک کے دافع وجع المفاصل اثرات کا مطالعہ
☆ برگ حلبہ کے دافع التہاب اور دافع درد اثرات
☆ چوہوں میں غذا کے ذریعہ پیدا کیے گئے فرط تدسم میں لک مغسول کے اثرات
☆ چوہوں میں سم الفار کی متعدد خوراک کی سمیت کا تقابلی مطالعہ
☆ تخم سداب کا طبعی و کیمیاوی اور نباتی مطالعہ
☆ چوہوں میں تخم قرطم کے مدر اور محافظ گردہ اثرات کی تشخیص
☆ Adriamycin کے ذریعہ پیدا کیے گئے متلازمہ کلیہ میں عصارۂ برگ بسکھپرہ کی تاثیرات
☆ سداب: روایتی طریقہ علاج سے جدید فارماکولوجی تک: ایک جائزہ
☆ چوہوں میں برگ بسکھپرہ کے ہائیڈرو الکوحلک عصارہ کے مدر اثرات کی تشخیص
☆ فربہی اور اس کے نتائج کا یونانی تصور: ایک جائزہ
☆ جنٹا مائی سن کے ذریعہ پیدا کی گئی سمیت گردہ کی اصلاح بذریعہ کباب چینی
☆ کاکنج کے اسٹیرائڈل اور میٹابولک اثرات
☆ قرحہ معدی و معوی میں تجرباتی طور پر مفید نباتی دوائیں
☆ فرط تدسم فی الدم میں لک مغسول اور سفوف مہزل کا تقابلی مطالعہ
☆ چوہوں میں حب گل آک کے دافع التہاب اثرات کی تشخیص
☆ چوہوں میں تخم کرفس کے مدر اثرات کا مطالعہ
☆ حب کاکنج کے عصارہ میں موجود مدر اثرات کی قدر پیمائی: چوہوں کے ماڈل میں
☆ کشتہ سازی کی تقابلی تشخیص کا تاریخی پس منظر
☆ تخم کرفس کی طبعی و کیمیاوی معیار بندی
☆ چوہوں میں جنٹا مائی سن کے ذریعہ پیدا کی گئی کلوی خرابی میں کاسنی کے اثرات
☆ تخم کرفس کا یونانی بیانیہ اور سائنٹفک رپورٹس
☆ نظام ہضم میں مستعمل یونانی دواؤں کے تجرباتی مطالعہ کا طریقہ کار
☆ چوہوں میں Serum caeroplasmin پر جوارش زنجبیل کے اثرات
☆ یونانی طب میں تحفظ گردہ کی تفہیم اور دائرۂ کار
☆ امراض گردہ کی اصلاح میں فطری محافظ گردہ دواؤں کے دائرۂ کار کا جائزہ
☆ حب گل آک کے دافع حمی اور دافع درد اثرات کا مطالعہ: اینمل ماڈل میں
☆ تخم قرطم کے اسٹیرائڈل اور میٹابولک اثرات کی تشخیص
☆ حب گل آک کے دافع التہاب میکانیہ کی تحقیق
☆ ایک یونانی دوا بسہری بوٹی کی معیار بندی
☆ عاقرقرحا، یونانی طب کی اعلیٰ مرتبت دوا: ایک مطالعہ
☆ تجرباتی حیوانوں میں عاقرقرحا کی جڑ کے دافع صرع اثرات کی تشخیص
☆ بسہری بوٹی کے دافع جراثیم خواص
☆ یونانی طب میں حصاۃ کلیہ کی ماہیت اور اس کا علاج
☆ تخم کاسنی میں موجود اسٹیرائڈل اور میٹابولک اثرات کا مطالعہ
☆ عاقرقرحا کی جڑ کی حادسمیت کا مطالعہ: سوس البینو مائس میں
☆ غیر طبعی دم کے یونانی تصور کی توضیح

☆ سورنجان تلخ کے طبعی کیمیاوی اور عضو گیر خواص
☆ اینمل ماڈل میں یونانی مرکب معجون نجاح کے دافع ڈپریشن اثرات
☆ زیریں مجرائے بول کی علامات اور یوروفلومیٹرک پیرامیٹرس پر قرص کانج کے اثرات
☆ حب گل آک کی معیار بندی: ایک یونانی مرکب دوا
☆ elevated plus maize test میں معجون نجاح کے دافع اضطراب نفسانی اثرات کی تشخیص
☆ حجرالیہود: حصاۃ کلیہ کے علاج میں مستعمل ایک اہم یونانی دوا
☆ قرص ذیابیطس کی معیار بندی: ایک یونانی مرکب دوا
☆ مردانہ جنسی افعال میں پنبہ دانہ کے اثرات کا چوہوں میں تجرباتی جائزہ

مقالات کی درج بالا فہرست جو ایک طرح سے نامکمل ہے اس بات کی شاہد ہے کہ ان سے جڑا ہوا نام کیسی ہنرمندی اور کیسی اعلی علمی لیاقت کا حامل تھا۔ اس فہرست میں شامل بیشتر مقالات وہ ہیں جو ریسرچ پیپر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کم ہی مقالات ہوں گے جنھیں ریویو کی ذیل میں شمار کیا جائے گا۔ سوچنے والے اس بات پر بھی مستعجب ہیں ایک ایسا فرد جس کی ابتدائی وثانوی تعلیم عربی واردو میڈیم میں کسی مدرسے سے انجام پائی ہو وہ انگریزی زبان پر ایسی بے مثال قدرت کیسے رکھ سکتا ہے کہ اس سے زائد از صد سائنٹفک مقالات منسوب ہوسکیں۔ پوری طبی دنیا اس بات کی شاہد ہے کہ پروفیسر غفران احمد مرحوم جس انداز سے ٹکسالی اردو بولنے اور لکھنے پر قادر تھے اسی انداز سے انھیں شستہ وشاداب انگریزی بولنے ولکھنے میں مہارت حاصل تھی۔ بہرحال سچائی تو یہی ہے کہ ان کا قلم حقیقت کی روشنائی سے آشنا تھا اور وہ لوح قلم کے توسط سے زندگی کے عکس کو کاغذ پر اتارنے میں صرف ہوگئے:۔

ورق ورق تجھے تحریر کرتا رہتا ہوں
میں زندگی تری تشہیر کرتا رہتا ہوں

مجھے قریب سے پڑھ سرسری نہ دیکھ مجھے

پروفیسر غفران احمد مرحوم چونکہ پیشہ ورانہ طور پر سائنٹفک تحقیق سے وابستہ تھے اس لیے ان کی زیادہ تر تحریریں بہ زبان انگریزی پائی جاتی ہیں تاہم ان کی فکری جولانیوں نے اردو کے احسان بھی اٹھائے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اوائل عمری میں اردو فکشن اور شعری ادب سے ان کا گہرا تعلق رہا ہو۔ ناول، خاکے اور انشائیوں نے فرصت کے لمحات میں ان کے لیے بھی دل بستگی کا سامان کیا ہو۔ دوران تعلیم انھوں نے افسانے بھی تحریر کیے ہیں جو اقامتی ہالوں کی سالانہ میگزین میں شائع ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان سے چند دیگر تحریریں بھی منسوب ہیں جو زبان و بیان اور فکر وتخیل کے اعتبار سے اپنی شناخت آپ ہیں۔ اردو زبان میں شائع شدہ ان کی تحریریں تعداد میں جتنی کم ہیں ویسی ہی متنوع بھی ہیں۔ چنانچہ یہ شخصی، تاریخی، ادویہ وصیدلہ جاتی، معالجاتی، تقریظی اور مقدماتی ادب کا نمونہ ہیں اور ہر پہلو سے متعلقہ ادب میں بطور مثال پیش کیے جانے کی مجاز ہیں۔

رازئ ہند پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کی شخصیت پر ان کا تحریر کردہ خاکہ جہاں فصاحت و بلاغت کی اعلیٰ مثال ہے وہیں ایسی شاندار مرقع کشی اور جزئیات نگاری پر محیط ہے کہ قاری کو لفظ لفظ آئینہ معلوم ہوتا ہے اور اس کی زبان بے ساختہ یوں مدح سرا ہوجاتی ہے:۔

ہے پیش نظر شوخی تحریر کسی کی
کاغذ پہ اتر آئی ہے تصویر کسی کی

اس خاکے میں انھوں نے اپنے ممدوح کی منفرد خصوصیات، ظاہری و باطنی اوصاف، عادات واطوار، حرکات وسکنات، رہن سہن اور طرز گفتگو کو پوری دیانت داری اور حقیقت پسندی کے ساتھ ماہرانہ نفاست سے بیان کیا ہے نیز حکیم موصوف کی نفسیات، مزاج، رویوں اور افتاد طبع پر اس خوبصورت پیرائے میں روشنی ڈالی ہے کہ ان کی پوری شخصیت جیتی جاگتی، چلتی پھرتی تصویر بن کر قاری کی نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہوجاتی ہے۔ مثال کے لیے ذیل کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''جب وہ کلاس لے رہے ہوتے تو اصل طیب کا دیدار ہوتا، اس وقت مزاجی درشتی کے آثار اور پروفیسرانہ وحاکمانہ پندار سے باہر آجاتے اور ایک شفیق استاد کی طرح درس دیا کرتے۔ چہرے پر شگفتگی ہویدا ہوتی اور کبھی کبھی زیر لب تبسم بھی فرماتے، ہنستے کبھی نہ تھے، بوقت ضرورت لطیف طنز بھی کر جاتے تھے۔ مروارید ناسفتہ پڑھا رہے تھے، اس کی ساری

تفصیل بتا چکے تھے کہ عقبی نشست سے کسی غیر حاضر باش نے سوال کر دیا کہ سر! ناسفتہ کیا ہوتا ہے؟ 'لگتا ہے ابھی تک آپ ناسفتہ ہی ہیں، کسی کی مدد لے لیجئے'، طیب صاحب کا جواب حاضر تھا۔ سارے لڑکے ہنس پڑے، سائل کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سوال و جواب سے کبھی کبیدہ نہ ہوتے، بلکہ حوصلہ افزائی کرتے تھے، ذہین اور پابند لڑکوں کو پسند کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کو خاص رعایت بھی دیا کرتے تھے۔ ہمارے سینئر بیچ کی کلاس (یو جی) میں ایک بار صف اول سے چار طلبہ کو غیر حاضر پایا، یہ چاروں بہت ریگولر، ذہین اور سوال و جواب میں پیش پیش رہتے تھے۔ پوچھا کہ 'چہار درویش' کہاں ہیں، کسی شوخ نے کہا چائے پینے گئے ہیں۔ حکیم صاحب کرسی پر بیٹھ گئے (کلاس میں وہ عموماً بیٹھتے نہیں تھے) اور حکم دیا کہ انھیں بلا کر لاؤ، چاروں طلبہ ڈرے سہمے کلاس میں پہنچے، حکیم صاحب نے جگر کے مشہور مصرعہ 'جو تم ہی نہ ہوگے تو کیا رنگ محفل' سے ان کا استقبال کیا اور تدریس شروع کر دی۔ کلاس کے علاوہ حکیم طیب صاحب سے اس رویے کی کوئی امید نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ جو شخص کلاس میں ریشم کی طرح نرم رہتا ہے، کلاس سے باہر ایسا آہنی پتلا کیوں بن جاتا ہے، جس کی ناک پر مکھی نہیں بیٹھ سکتی۔ اکثر شبہ ہوتا کہ 'لامساس' کا لبادہ وہ بر بنائے مصلحت اوڑھے رہتے تھے۔''

خاکہ نہ تو سوانحی مضمون ہوتا ہے نہ ہی کارناموں کی تفصیل نگاری بلکہ یہ ہمارے فکر اور احساسات سے بھی رشتہ قائم کرتا ہے۔ کامیاب خاکہ نگار وہ ہوتا ہے جس کی آستین میں روشنی کا سیلاب چھپا ہوتا ہے اور جو واقعات کی اوپری پرت کے نیچے، معمولات کے ہجوم میں کھوئی ہوئی ایسی حقیقتوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جہاں تک عام لکھنے والوں کی نگاہ پہنچتی ہی نہیں ہے۔ وہ صاحب خاکہ کے اہم کاموں سے جہاں خوش ہوتا ہے وہیں اس کی کوتاہیوں پر کڑھتا بھی ہے۔ چنانچہ پروفیسر غفران احمد مرحوم اپنے مضمون میں حکیم محمد طیب صاحب کی تدریسی عظمت، معالجانہ حذاقت اور انتظامی صلاحیت پر جہاں رشک کناں ہیں وہیں ان کی علمیت اور دانشوری کے بقدر علمی و تحقیقی کاموں کی کمی پر شاکی بھی ہیں۔ اس حوالے سے وہ یوں رقم طراز ہیں:

''حقیقت کا حال تو خدا کو ہی معلوم ہے لیکن اس کی ایک وجہ جو بادی النظر میں ذہن ناقص میں فلیش کرتی ہے وہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کے ذوق طبابت نے ان کو علمی اور تحقیقی کاموں سے دور رکھا۔ ان کو طبابت کا بہت شوق تھا اور اوائل عمری سے ہی وہ مطب و معالجہ سے وابستہ رہے اور اس فن میں مہارت اور اس کے توسط سے بڑی ناموری اور شہرت حاصل کی۔ ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ شعبۂ علم الادویہ سے وابستہ ہونے کے سبب طبابت گو کہ ان کے فرائض منصبی سے خارج ہو چکی تھی پھر بھی وہ اپنے چیمبر میں مریضوں کو دیکھتے تھے اور شعبہ کو مرجع خلائق بنائے رہتے تھے۔ یہ بات ظاہراً اچھی معلوم ہوتی ہے، لیکن شعبہ کے دائرۂ کار سے خارج ہونے کے سبب مطب و معالجہ اس کی خالص علمی فضا اور تحقیقی سیٹ اپ کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ طبابت بلاشبہ ایک شریفانہ مصروفیت ہے جس سے عوام الناس کو فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس مقصد کے لیے طبیہ کالج میں ایک مستقل ہاسپٹل قائم ہے جہاں متعلقہ شعبہ (معالجات، جراحت، نسواں وغیرہ) اپنی خدمات انجام دیتے ہیں۔ معالجہ ان کے فرائض منصبی اور اختصاص کا حصہ ہے، لہٰذا ان کی علمی سرگرمیوں کے لیے ایک بنیادی ضرورت ہے۔ علم الادویہ کا دائرۂ کار بالکل جداگانہ ہے، جس میں مریض و معالجہ سے کم سابقہ پڑتا ہے، اساسی، تجرباتی اور محدود اطلاقی ریسرچ پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ لیکن حکیم صاحب نے شعبہ کو نیم مطب بنا کر ایک ایسی بدعت کی طرح ڈال دی جو علمی اور تحقیقی کاموں سے متغائر تھی۔ علاج و معالجہ علمی سے زیادہ عملی بلکہ میکانکی کام ہیں، آدمی کا میلان جب اس قسم کے کاموں کی طرف بڑھتا ہے تو علمی دقائق سے وہ صرف نظر کرنے لگتا ہے اور غالباً یہی حکیم طیب صاحب کے ساتھ ہوا، غیر معمولی صلاحیت کے حامل ہونے کے باوصف انھوں نے کوئی ایسا علمی کام نہیں کیا جو طب میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہو۔ طبابت کی واہ واہ انھیں ترفع کا احساس دلاتی رہی اور ان کو حقیقی علمی دنیا سے دور لے گئی۔''

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی اردو تحریروں کا دوسرا حوالہ تاریخ نگاری پر مشتمل ہے۔ اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ کی تاریخ پر مبنی ان کی یہ تحریر تہذیب الاخلاق کے صدی نمبر میں شائع ہوئی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خدمات کے سو سال مکمل ہونے پر وہاں کے ذمہ داروں کے ذہن میں یہ بات آئی کی یونیورسٹی کے کالج، فیکلٹیز، سینٹرس اور دیگر اداروں کی صد سالہ پیش رفت کا جائزہ لیا جائے اور اسے باقاعدہ طور پر ایک دستاویز کی شکل دی جائے۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق کی ادارتی

ٹیم نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور یونیورسٹی سے جڑے اداروں کے سربراہان اور اردو نویس اساتذہ سے ربط کر کے تحریریں جمع کیں۔ اس ضمن میں طبیہ کالج کی تاریخ رقم کرنے کے لیے جس نام نامی کا انتخاب کیا گیا وہ استاذ محترم کی ذات تھی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ان کی یہ تحریر موجودہ وائس چانسلر کو اتنی پسند آئی کہ انھوں نے اپنی اہلیہ (جو اردو کی خواندگی پر نسبتاً زیادہ قادر ہیں) سے درخواست کر کے باقاعدہ طور پر سماعت کی نیز ایک نجی محفل میں استاذ محترم کا شکریہ بھی ادا کیا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ وہ جس شخص کی تاریخ نویسی پر ستائش کناں ہیں وہ بذات خود جلد ہی تاریخ کا حصہ ہو جانے والا ہے۔

اٹھائے دوش پہ تاریخِ حادثات جہاں
گزر رہا ہے دیار حیات سے انسان

مذکورہ بالا مضمون میں طبی تعلیم کے درسگاہی نظام کے پس منظر سے لے کر، دلی اور لکھنؤ کے تعلیمی اداروں کی مرکزیت، بیسویں صدی کے تہذیبی تصادم، سودیسی اور دیسی طبوں کے درمیان معاندانہ رویہ سمیت طبیہ کالج کا قیام، اس کی تعمیرات، نظام تعلیم، وہاں کے نصاب کی امتیازی حیثیت، علمی و تحقیقی امتیازات، طبی صحافت، دواخانہ طبیہ کالج اور اجمل خان سے نسبت پر مبسوط روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مضمون میں ابتدائی اور ثانوی مآخذ کو بنیاد بنا کر استقرائی و استخراجی طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے حقائق کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے جس کے تحت عصری نظریات و واقعات اور ماضی کے اقدار و روایات میں توازن پیدا کر کے اپنی بات کو تمام تر قرینے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ طبیہ کالج، علی گڑھ کو حکیم اجمل خان سے منسوب کرنے اور اس کے عصری کردار کے حوالے سے محولہ بالا مضمون کا یہ اقتباس کافی اہمیت کا حامل ہے:

''یہ کالج اپنے قیام کے فوراً بعد ہی مؤثر پوزیشن میں آ گیا تھا اور ہمیشہ طبی منظر نامے پر اس کا گہرا اثر محسوس کیا گیا۔ ۱۹۲۷ء میں اس کا قیام عمل میں آیا، یہی حکیم اجمل خان کا سالِ وفات بھی ہے، ان کی رحلت کے بعد قرول باغ طبیہ کالج کی زمام انصرام کے لیے خاندان میں رسہ کشی سے ایسا بحران پیدا ہوا کہ خود اس کے وجود کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اس کمزور حالت میں، اب اس سے طبی سیادت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ کم و بیش یہی صورت حال لکھنؤ میں تکمیل الطب کالج کی ہو رہی تھی۔ اب تک طبی دنیا کا مرجع رہے ان دونوں اداروں کے زوال آمادہ ہونے کے بعد علی گڑھ کے طبیہ کالج نے مرکزیت کی جگہ لے لی اور ایک طرح سے طبی دنیا نے بھی اس کی قیادت تسلیم کر کے اسے قائد مان لیا۔ اس کالج نے بھی سیادت کی ذمہ داری ادا کرنے میں پوری تندہی کا مظاہرہ کیا۔

یہاں کی تعلیمی خصوصیت ہے کہ اس کے فارغین کا ایسا ذوق و ذہن بن جاتا ہے کہ وہ عملی زندگی میں تحقیق اور درس و تدریس سے وابستگی زیادہ پسند کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ طبی اداروں میں یہاں کے فضلاء کا تناسب باقی درس گاہوں سے بہت زیادہ ہے۔ اس وقت ہندستان میں یونانی طب کا شاید ہی کوئی ایسا ادارہ ہو، جہاں طبیہ کالج علی گڑھ کے فضلاء خدمت انجام نہ دے رہے ہوں، اس طرح یہاں سے اٹھنے والے ابر نے پورے جہانِ طب کی سیرابی کی ہے اور اس کے اثرات سے دوسرے طبی اداروں کو مستفید کیا ہے۔ اس کالج میں تعلیم و تحقیق کا کم و بیش وہی اسلوب رائج ہے جو حکیم اجمل خان نے کبھی سوچا تھا، مگر اسے پورا کرنے سے پہلے ہی وہ سانحۂ ارتحال سے دوچار ہو گئے۔ طبیہ کالج علی گڑھ نے ان کے ادھورے منصوبے کی تکمیل کر کے ان کے نام سے اپنے انتساب کا گویا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ طبی درس گاہوں میں گویا اجملی نصاب کو جس مقصد سے پڑھنے پڑھانے کی ضرورت تھی، وہ کہیں فوت ہو رہا تھا۔ معاصر درس گاہوں میں طبیہ کالج کا یہ بڑا امتیاز ہے کہ مخلوط نصاب کے باوجود یہاں کی تعلیم میں یونانی نظریات کو تفوق حاصل رہا اور فنی روح مجروح نہیں ہونے پائی۔ یہی اجملی نصاب کا بھی منتہائے مقصود تھا۔''

علم الادویہ کے میدان میں پروفیسر غفران احمد مرحوم کی اردو تحریر ایک انتہائی اہم موضوع پر تالیف کردہ ان کی کتاب ''اوصاف ادویہ: ضمانت سے محاسبہ تک'' ہے جو انھوں نے ڈاکٹر سعود الظفر صاحب کی معیت میں تالیف کی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے تو اہم ہے ہی کہ اپنے موضوع پر ایک انتہائی منضبط اور مبسوط کتاب ہے لیکن اس کی اہمیت بایں لحاظ مزید فزوں تر ہو جاتی ہے کہ اس میں طب کی قدیم معلومات سے لے کر جدید علمی ذخائر اور عصری قانونی اداروں کے احکام و قوانین کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب کسی بھی یونانی اسکالر کے ذریعہ تالیف کردہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جس میں دواؤں کے اوصاف، ان کی کاشت کے

طریقے، قانونی احتیاجات، جگہ و زمین کا انتخاب، تخم کاری اور پود کاری کے التزامات، نباتات کی دیکھ بھال اور تحفظ، نباتات کے مختلف اجزاء کا معیاری حصول، تجفیف و پیکنگ، ادویاتی صنعت محمودہ کے رہنما دستور، صیدلی عملیات کے طریقے، آلہ جات و مشینری، معیار کارکردگی اور اس کے حصول سمیت جملہ معلومات کو منظّم انداز میں پیش کر کے علم اور سلیقہ شعاری کی اعلیٰ مثال قائم کی گئی ہے۔ کتاب کی طباعت اور اشاعت کے حوالے سے مؤلفین کا یہ بیان ملاحظہ کریں:

''کتابِ ہٰذا 'اوصافِ ادویہ -- ضمانت سے محاسبہ تک' دراصل اوصافِ ادویہ کی ضمانت کے لیے ذمہ دار دوائی نباتات کی کاشتِ محمودہ، ان کے حصول اور صنعتی پیمانے پر ان دواؤں کی تیاری کے رہنما اصول وضوابط کی جمع وتدوین ہے۔ اس کتاب میں قدیم حکماء، جدید علوم کے ماہرین اور دورِ حاضر کے قانونی اداروں کے بیان کردہ احکام وقوانین کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضمانتِ اوصافِ ادویہ سے متعلق معروف اوصاف کی جانچ پڑتال اور ان کے احتساب کے طریقہ پر ایک عمومی مگر جامع گفتگو کی گئی ہے۔ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی غالباً یہ پہلی کاوش ہے جسے طبِ یونانی کے طلبہ، محققین وریسرچ اسکالرس اور صنعتِ دواسازی سے وابستہ افراد کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ زبان قدرے تکنیکی ہے لیکن موضوع کے بیان اور مشمولات کے احاطے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ کوشش کی گئی ہے کہ موضوع سے متعلق جو معلومات دستیاب ہیں ان کو یکجا کر دیا جائے لیکن علوم وفنون میں چونکہ ترقی کی رفتار تیز ہے اور ہر آن اضافات سامنے آتے رہتے ہیں اس لیے اس بات کا امکان بہرحال موجود ہے کہ بعض امور شاملِ کتاب ہونے سے رہ گئے ہوں۔''

پروفیسر غفران احمد مرحوم کا سب سے اہم علمی کارنامہ دراصل علم الصیدلہ پر مشتمل ان کی کتاب ''اصول دواسازی'' ہے جس کی تحقیق وتالیف میں انھوں اپنی پوری زندگی کا سرمایہ لٹا دیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت دراصل ان کا دیرینہ خواب تھا جسے اٹھتے بیٹھتے ان کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ یقیناً یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ انھوں نے اپنے خواب کی تکمیل سے قبل ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔

اسی لیے تو ہوا رو پڑی درختوں میں
ابھی میں کھِل نہ سکا تھا کہ رُت بدلنے لگی

ابتدا میں اس کتاب کی اشاعت قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی کے توسط سے کسی پروجیکٹ کے تحت ہونی تھی لیکن صفحات کی زیادتی اور چند دیگر مسائل کی وجہ سے یہ کام تعطل کا شکار ہوگیا۔ بعد میں استاذ محترم نے اسے ذاتی اخراجات پر شائع کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ بہرحال ہونی کو آج تک کوئی بھی نہیں ٹال سکا ہے تاہم ابھی بھی شخصی یا ادارہ جاتی سطح پر اس کتاب کی اشاعت کا بیڑا اٹھا کر استحقاق ثواب کے ساتھ ساتھ طب کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کی جاسکتی ہے۔ خدا کرے یہ کام جلد از جلد اپنے انجام کو پہنچے۔ آمین!

ہم اس بات کا اندازہ بآسانی لگا سکتے ہیں کہ ایک بلند پایہ علمی شخصیت اور صاحب طرز محقق جس سے اتنے سارے علمی امتیازات وابستہ ہیں کی عمر بھر کی کاوشوں کا ثمرہ کیسے قیمتی جواہرات سے مملو ہوگا۔ بالخصوص اس صورت میں محولہ بالا کتاب کی ضرورت وابستگان طب کے لیے مزید بڑھ جاتی ہے جب کہ دواسازی کے فن پر موجود کتابیں بہت کمیاب ہیں نیز جو دستیاب بھی ہیں وہ فرسودہ معلومات پر مبنی اور مواد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اس قدر مماثل ہیں کہ ان کا ہونا اور نہ ہونا یکساں ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ استاذ محترم صیدلہ کی تدریس کے دوران طلبہ کو باقاعدہ طور پر نوٹ فراہم کرتے تھے تاکہ وہ ان کتابوں پر تکیہ کرنے سے محفوظ رہیں اور انھیں جدید وقدیم معلومات سے مزین ایک بہتر مواد حاصل رہے۔

اردو زبان میں استاد محترم کے علمی حوالوں میں بالا منسوبات کے علاوہ ''ابتدائی مسلم عہد کی چند طبی خدمات''، ''ایڈس، جنسی بے راہ روی اور اسلام''، ''ضعفِ باہ: ایک معالجاتی تجزیہ'' اور ''مرہم، ضماد اور طلا: درون جلد نفوذ اور اساس کے تناظر میں'' جیسے مقالہ جات بھی شامل ہیں۔ ممکن ہے اردو قالب میں ان کے علاوہ چند اور بھی تحریریں موجود ہوں جہاں تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی ہے۔ علاوہ ازیں چند اہم طبی کتابوں پر لکھی گئیں ان کی تقریظیں بھی اپنے بہترین اسلوب اور قابل قدر مواد کے سبب گفتگو کیے جانے کی مجاز ہیں لیکن از حد طوالت کے سبب ان سے گریز برتا جا رہا ہے۔

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا

یہ بات مصدقہ ہے کہ صالح اقدار ونظریات انسان کو وحدت کی لڑی میں

پرو دیتے ہیں اور اگر اس نظریے کی اساس عشق ہو تو وحدت الوجود کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ استادِ محترم کی صالحیت کی مٹی میں گندھی ہوئی ذات بھی کسی ایسی ہی عشق کی آگ میں تپ کر کندن ہوئی تھی جس نے انھیں مودت و محبت کا پیکر بنا دیا تھا۔ ان کا دماغ اگر فلسفی کا تھا تو دل کسی صوفی سے کم نہیں تھا۔ اس اشتراک نے ان کی شخصیت کو وہ نور عطا کیا تھا جس کی شبنمی ضیاء سے ہر کوئی قطرہ قطرہ شرابور تھا اور جس کی کشش سے بانوئے کشور دلبری ان کی دہلیز کی داسی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا تانبے کا جسم جو سونے کی روح سے آراستہ تھا، جس کی آنکھوں میں پل پل ریشمی خواب چمکتے تھے مٹی کی محبت میں سنہری لمحات کی ڈور کو تھامے ہوئے دور کہیں بہت دور کسی اتھاہ خلا میں جا سمایا ہے۔

کاش! روپہلی صبح کے بنفشی پھولوں پر شام کے کاسنی سائے دراز نہ ہوئے ہوتے۔

کاش! حجرۂ درویش کے چراغ کی لو کے کان میں ہوا نے تماشا ختم ہونے کا اعلان نہ کیا ہوتا۔

کاش! کچھ دن اور مٹی کے پیالے تشنگی کے جوالا کو برفاب کرتے۔

کاش! کچھ دن اور سوکھی ٹہنیاں لمس دلآویز کے اثر سے شادابی کا آبگینہ ٹھہرتیں۔

کاش! کچھ دن اور وریدِ جاں سے ٹپکنے والی امید کا جوہر اپنے کرشمے دکھاتا رہتا۔

کاش! کچھ دن اور زندگی کا حقہ اپنے پرانے انداز میں دھوئیں کے مرغولے اڑاتا ہوا، لہراتا، بل کھاتا، کافوری سگندھ چھوڑتا ہوا رفاقت کی دالانوں کو معطر رکھتا!!!

کاش! کچھ دن اور اجل کے دیوتا اپنی چلمنوں سے باہر نہ نکلتے۔

پھر کوئی عکس شعاؤں سے نہ بننے پایا
کیسا مہتاب مرے آئینہ خانے سے اٹھا

پروفیسر غفران احمد مرحوم کے سانحہ ارتحال سے یقینی طور پر یونانی طبی دنیا ایک بہت بڑے خسارے سے دوچار ہوئی ہے۔ ایک ایسا خسارہ جس کی تلافی حال فی الحال ممکن نہیں نظر آتی ہے۔ ان سے بچھڑنے کے غم میں نہ جانے کتنے ہی دلوں کے پرچم جھکے ہوئے ہیں۔ ان کی موت کا زخم ایسا ہی ہے جس کو بھرنے میں مدتیں صرف ہو جاتی ہیں۔ بظاہر خاک کی امانت خاکدان کے حوالے ہو چکی ہے لیکن اس کے ذروں میں موجود درخشانیوں کو ابھی ہمارے حافظے میں محفوظ رہنا ہے۔ اس نے خون کی روشنائی سے سینۂ قرطاس پر جو داستانِ وفا رقم کی اسے اتنی آسانی سے زوال آمادہ نہیں ہونا ہے۔ یقیناً فروغِ شمع کو صبحِ محشر تک باقی رہنا ہے۔

مصادر و مراجع

۱- حکیم فخر عالم۔ رازئ ہند، پروفیسر حکیم محمد طیب۔ دہلی: الحکمۃ فاؤنڈیشن؛ ۲۰۱۲ء: ۹۵-۱۰۹۔

۲- شمشاد عالم۔ طب یونانی کا روشن ستارہ غروب ہو گیا۔ دہلی: حیات نو۔ جولائی ۲۰۲۱ء: ۷۵-۸۴۔

۳- محمد سمیع اختر فلاحی۔ تجھ سا کہیں کسے، آہ! ڈاکٹر غفران احمد۔ دہلی: حیات نو۔ جولائی ۲۰۲۱ء: ۵۲-۶۲۔

۴- پروفیسر نعیم احمد خان۔ پروفیسر غفران احمد۔ علی گڑھ: ماہنامہ تہذیب الاخلاق۔ جون و جولائی ۲۰۲۱ء: ۷۷-۸۵۔

۵- پروفیسر غفران احمد۔ طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق (صدی نمبر)۔ دسمبر ۲۰۲۰ء: ۹۹-۱۱۱۔

۶- غفران احمد، سعود الظفر علی۔ اوصافِ ادویہ: ضمانت سے محاسبہ تک۔ علی گڑھ: شریف پبلشنگ ہاؤس؛ ۲۰۱۵ء۔

۷- سعود الظفر علی، غفران احمد وغیرہما۔ مرہم ضماد اور طلاء: درونِ جلد نفوذ اور اساس کے تناظر میں۔ جہان طب۔ اپریل تا ستمبر ۲۰۰۸ء؛ ۴(۱): ۱۷-۲۳۔

۸- حکیم معراج الحق، ڈاکٹر غفران احمد۔ ضعف باہ، ایک معالجاتی تجزیہ۔ جہان طب۔ جنوری تا جون ۲۰۰۳ء؛ ۴(۴): ۴۵-۵۱۔

۹- جاوید احمد خان، شگفتہ نکہت۔ مفردات مسیحائی۔ دیوبند: مسعود پبلشنگ ہاؤس۔ ۲۰۱۲ء۔

۱۰- انتظار احمد، وسیم احمد۔ سموم و تسمم۔ نئی دہلی: ہدایت پبلشرس اینڈ ڈسٹری بیوٹرس۔ ۲۰۱۹ء: ۱۵-۱۹۔

۱۱- https://www.amu.ac.in/faculty/ilmul-advia/ghufran-ahmad, cited on 19/09/2022۔

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

میرے استاد میرے محسن

پروفیسر غفران احمد

ڈاکٹر شمیم ارشاد اعظمی ☆

مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے پری طب کے ٹسٹ کے لیے مئی ۱۹۹۷ء میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ علی گڑھ کا سفر کیا تھا۔ خوش قسمتی سے پری طب میں داخلہ ہوگیا۔ پری طب میں کیمسٹری، فزکس، بایولوجی، باٹنی اور انگریزی کے مضامین داخل نصاب تھے۔ راقم کے لیے یہ مضامین نئے نہیں تھے، کیوں کہ مدرسۃ الاصلاح میں ہائی اسکول کی سطح تک این سی ای آر ٹی کی کتابیں پڑھ رکھی تھیں، لیکن شروع سے ہی کیمسٹری سے انسیت پیدا نہ ہوسکی۔ مرحوم ڈاکٹر حفیظ اللہ خان صاحب کی سختی نے مضمون کو یاد کرادیا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر امتیاز صاحب کی رعب دار شخصیت نے فزکس کے اصولوں کو رٹوا دیا تھا۔ زولوجی کے مضمون میں دلچسپی تھی مگر ڈاکٹر خورشید صاحب کی جلالی شخصیت نے اس سے بھی یک گونہ دوری پیدا کردی تھی۔ لے دے کر باٹنی اور انگریزی کی کلاس میں سکون نصیب ہوتا۔ ڈاکٹر سعود صاحب کی دلنشیں آواز اور شیریں لہجہ دل کو طمانیت بخشتا۔ انگریزی کے کلاس میں ڈاکٹر عبدالمتین صاحب کی دل آویز شخصیت ہمارے دل و دماغ کو خوف و ہراس کے ماحول سے نکال کر علم وادب کے ایک خوشگوار ماحول میں لے آتی۔ علی گڑھ کے ابتدائی ایام میں ڈاکٹر عبدالمتین صاحب جیسے مخلص انسان کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ ہمیشہ لکھنے پڑھنے کی ترغیب دیتے۔ شعبہ کلیات میں ماہانہ تعلیمی و تربیتی پروگرام منعقد کرتے۔ علم وادب، طب وفلسفہ، مذہبی اور تاریخی موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ شعبۂ کلیات کے اساتذہ کے علاوہ شعبۂ علم الادویہ سے پروفیسر محمد یوسف امین صاحب، ڈاکٹر اقبال احمد قاسمی صاحب اور ڈاکٹر غفران احمد صاحب شرکت فرماتے۔ اس پروگرام میں اکثر ڈاکٹر عبدالمتین صاحب کے استاد محترم پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب بحیثیت صدر تشریف لاتے۔ ڈاکٹر عبدالمتین صاحب کے ہمراہ انتظامی امور کے ساتھ راقم کی مقالہ نگار کی حیثیت سے بھی شرکت ہوتی تھی۔

اللہ اللہ کر کے پری طب کا امتحان پاس کرلیا۔ اسی دوران والد محترم موتیابند کے آپریشن کے لیے علی گڑھ تشریف لائے۔ میڈیکل کالونی میں پروفیسر نعیم احمد خان صاحب کے یہاں قیام رہا۔ والد صاحب دوسرے دن ہاسپٹل میں داخل ہوگئے۔ آپریشن سے قبل و بعد مزاج پرسی کے لیے اجمل خان طبیہ کالج کے کئی اساتذہ تشریف لائے، ان میں ڈاکٹر غفران احمد صاحب بھی تھے۔ ڈاکٹر غفران صاحب شام کو امیر نشان میں واقع اپنی قیام گاہ لے گئے۔ جب میں واپس آنے لگا تو انھوں نے ایک کتاب تھمادی۔ کتاب کے سرورق ''ادیبوں کے معاشقے'' کو دیکھ کر کتاب پڑھنے کا اشتیاق بڑھ گیا۔ ہاسپٹل آکر رات میں کتاب کا بیشتر حصہ پڑھ ڈالا۔ یہ کوئی مستقل کتاب نہیں تھی بلکہ 'انشا' کلکتہ کا خاص نمبر تھا۔ اس پر جے این یو کے کسی طالب علم کا نام لکھا تھا۔ یہ کتاب آج بھی راقم کے پاس موجود ہے۔ اس کے بعد استاد محترم سے جو تعلق قائم ہوا اس میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آج جب کہ استاد محترم ہمارے درمیان نہیں ہیں، مگر ان کی یادوں سے شفقت ومحبت کا احساس ہوتا ہے۔

فرسٹ پروف کے امتحان کے بعد سکنڈ پروف کے لیے پرموشن ہوگیا۔

☆ اسوشیٹ پروفیسر وصدر، شعبۂ علم الادویہ، اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج، پریاگ راج، اتر پردیش۔ E-mail:siazmi@gmail.com، Mob.No:8081521160۔

صیدلہ کا مضمون استادمحترم کے ذمہ تھا۔نہایت خوشگوار ماحول میں آپ کی کلاس ہوتی۔سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے۔لہجہ میں وقار تھا۔گفتگو میں روانی ہوتی۔کلاس کے درمیان میں صیدلہ و دواسازی سے متعلق اکثر ایسی باتیں بتاتے جن کا ذکر صیدلہ کی کسی کتاب میں نہیں ہوتا تھا۔کلاس کے آخر میں یہ بھی فرماتے کہ امتحان میں وہی لکھنا جو کتاب میں لکھا ہے ورنہ ممتحن فیل کر دے گا۔پریکٹکل کلاس بھی لیتے۔کبھی کبھی کچھ ایسی باتوں کا ذکر کرتے کہ دل و دماغ حیران رہ جاتے مثلاً یہ کہتے کہ ایک میٹر کیوں اتنا بڑا ہوتا ہے، اس سے چھوٹا اور بڑا بھی ہوسکتا تھا، پھر جب ہم اس کا جواب پوچھتے تو فرماتے کہ ارے چھوڑو۔اس طرح کے بہت سارے سوال کرتے اور طلبہ کو سوچنے کا موقع دیتے۔دراصل یہ کرنا استادمحترم کی تربیت کا ایک انداز تھا۔طلبہ کے ساتھ بہت ہمدردانہ تعلق رکھتے تھے۔طلبہ کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں رکھتے تھے۔وقت کے پابند تھے اور مفوضہ ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیتے تھے۔راقم نے انھیں کبھی بلاضرورت کسی کے چیمبر میں وقت گذارتے نہیں دیکھا۔استادمحترم کو ہمیشہ درس وتدریس اور ریسرچ وتحقیق میں مشغول پایا۔

بی یو ایم ایس سے فراغت کے بعد راقم کا نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں ایم ڈی شعبۂ علم الادویہ میں داخلہ ہوگیا۔انسٹی ٹیوٹ میں ہمارا تیسرا بیچ تھا۔اس وقت شعبہ سے کل تین اساتذہ وابستہ تھے۔ڈاکٹر غلام الدین صوفی صاحب، ڈاکٹر نسرین جہاں صاحبہ اور ڈاکٹر نجیب جہاں صاحبہ۔ڈاکٹر غلام الدین صوفی صاحب اور ڈاکٹر نسرین جہاں، ڈاکٹر غفران احمد صاحب کے براہ راست شاگرد تھے۔دونوں ہی ریسرچ وتحقیق اور طبی مسائل کے بارے میں ڈاکٹر غفران صاحب سے رجوع کرتے تھے۔ریسرچ وتحقیق سے متعلق دیگر اداروں کے اساتذہ وطلبہ بھی استادمحترم سے گفتگو کرتے تھے اور مسائل کا حل تلاش کرتے تھے۔

۲۰۰۷ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں مختلف شعبہ جات میں پروفیسر اور ریڈر کی تقرری کے سلسلے میں اشتہار شائع ہوا۔استادمحترم اس وقت شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے اور ریسرچ وتحقیق میں مشغول تھے۔استادمحترم کو بڑی مشکل سے پروفیسر کی پوسٹ کے لیے آمادہ کیا گیا۔انٹرویو کے لیے ہوائی جہاز سے بنگلور تشریف لائے۔راقم اور ڈاکٹر ساجد فراہی دونوں ایئرپورٹ گئے اور انسٹی ٹیوٹ لے کر آئے اور ڈاکٹر قاضی زید احمد کے یہاں ٹھہر گئے۔دوسرے دن پروفیسر کا انٹرویو تھا۔صبح ۱۰/بجے انسٹی ٹیوٹ میں ڈائریکٹر آفس پہنچ گئے، یہیں پر انٹرویو ہونا تھا۔استادمحترم کی صلاحیتوں اور تبحر علمی کے اپنے ہی نہیں غیر بھی قائل تھے۔انٹرویو کے بعد استادمحترم کے پروفیسر پر تقرر کی خوش خبری سن کر یک گونہ طمانیت حاصل ہوئی۔تمام لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ شعبۂ علم الادویہ کو پروفیسر غفران احمد صاحب جیسا مخلص محقق اور شیدائے طب مل گیا۔اسی سلیکشن کمیٹی میں ریڈر کی پوسٹ پر ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا تقرر ہوا۔ڈاکٹر عبدالودود صاحب ان دنوں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن، حیدرآباد میں ریسرچ آفیسر یونانی کی پوسٹ پر خدمات انجام دے رہے تھے۔یہاں آپ نے بہت ہی کم عرصہ میں یونانی طب کے کئی اہم فارسی رسائل کا انگریزی میں ترجمہ کرلیا تھا۔سلیکشن کے بعد آپ وہاں سے مستعفی ہوکر یکم دسمبر ۲۰۰۷ء کو شعبۂ علم الادویہ میں ریڈر کی حیثیت سے وابستہ ہوگئے۔الحمدللہ ترقی کرکے آج آپ اسی انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت ڈائریکٹر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

استادمحترم پروفیسر غفران احمد صاحب نے پروفیسر اور صدر شعبۂ علم الادویہ کی حیثیت سے ۲۶/نومبر ۲۰۰۷ء کو جوائن کیا۔جوائننگ کے بعد نہ صرف شعبۂ علم الادویہ بلکہ پورا انسٹی ٹیوٹ آپ کی صلاحیتوں، تجربات اور علمی تبحر سے مستفید ہونے لگا۔اس طرح نیشنل انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ وتحقیق کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔نئے نئے زاویوں سے ریسرچ وتحقیق کے بارے میں سوچا جانے لگا۔مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس وقت ہمارے بیچ کی اتھیکل کمیٹی کی میٹنگ ہونی تھی۔

ہمارا بیچ چار نفوس؛ ڈاکٹر سلمیٰ جبین وائی، ڈاکٹر شگفتہ نکہت، ڈاکٹر مشتاق احمد اور راقم شمیم ارشاد پر مشتمل تھا۔ سب لوگوں نے اپنی اپنی سِناپسِس مکمل کر لی تھیں۔ استاد محترم نے تمام سِناپسِس پر نظر ثانی فرمائی اور معمولی رد و بدل اور حذف و اضافہ کے بعد انھیں جمع کر دیا گیا۔ اس کے بعد راقم وطن آ گیا تھا، اس دوران تحقیقی مقالہ جات کے نگراں کے تعین کے سلسلے میں شعبہ میں میٹنگ چل رہی تھی، استاد محترم کا فون آیا، خیر خیریت کے بعد دریافت کرنے لگے کہ تمھارا نگراں کس کو مقرر کیا جائے، میں نے کہا جیسا آپ لوگ بہتر سمجھیں۔ راقم کی خوش بختی رہی کہ ڈاکٹر عبدالودود صاحب نگراں مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر سلمیٰ جبیں وائی اور ڈاکٹر شفگتہ نکہت استاد محترم پروفیسر غفران صاحب کے زیر نگرانی چلے گئے اور ڈاکٹر مشتاق احمد پروفیسر مستحسن علی جعفری، ڈائریکٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن کے زیر سرپرستی اپنی تحقیق میں مصروف ہو گئے۔ خیر! راقم جب گھر سے واپس ہوا تو استاد محترم بڑے سادگی سے کہنے لگے کہ 'اجی' کام کرو، میں ہوں نا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ راقم نے ایک بار آپ کے زیر نگرانی کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ خیر! کام شروع ہو گیا، مواد یکجا کیا جانے لگا۔ اس وقت شعبہ میں لیکچرر کے طور پر ڈاکٹر غلام الدین صوفی، ڈاکٹر نسرین جہاں اور ڈاکٹر نجیب جہاں کام کر رہی تھیں۔ پروفیسر غفران صاحب اور ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے تقرر سے قبل یہی تینوں افراد شعبہ کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ہمارے بیچ کے بعد استاد محترم ڈاکٹر شبیر احمد پرِّے اور ڈاکٹر تبارک حسین کے نگراں مقرر ہوئے۔

راقم کی تحقیق کا موضوع "Temperature Standardization and Comparative Toxicity Study of Kushta Sammul Far Prepared by Different Methods" تھا۔ دراصل اس موضوع کا انتخاب ڈاکٹر غلام الدین صوفی صاحب نے کیا تھا اور اسٹڈی ڈیزائن بھی انہیں نے تیار کیا تھا۔ کشتہ سازی کے بارے میں عام طور سے آیورویدک مؤرخین کا نظریہ بالکل علاحدہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یونانی طب میں کشتہ سازی کی بنیاد آیورویدک طب ہے۔ چنانچہ راقم نے سب سے پہلے کشتہ سازی کی تاریخ سے متعلق مواد جمع کرنا شروع کیا۔ صیدلہ کی کتابوں میں کشتہ کی تاریخ سے متعلق بہت کم مواد ملتا ہے۔ اردو میں لکھی گئی صیدلہ کی کتابوں میں کشتہ کی تاریخ کا ماخذ مسیح الملک حکیم اجمل خان کی کتاب 'التحفة الحامدیة' ہے۔ مسیح الملک نے اس کتاب میں براکلسوس اور اس کی کتاب 'الإکسیر' کا ذکر کیا ہے اور اسے 'الحکیم الیونانی' کے نام سے تحریر کیا ہے۔ راقم نے براکلسوس کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا شروع کر دی۔ اتفاقاً ایک روز براکلسوس کی شخصیت تک رسائی ہو گئی مگر جو تحقیق سامنے آئی وہ بہت ہی چونکانے والی تھی اور حیرت انگیز تھی، کیوں کہ جسے ہم 'الحکیم الیونانی' سمجھ رہے تھے وہ سولہویں صدی کا یونانی طب کا سب سے بڑا مخالف پیراسلسس (Paracelsus) (۱۴۹۳-۱۵۴۱) ہے جس نے سر راہ القانون اور جالینوس کی تحریروں کو نذر آتش کیا تھا۔ اس نے جرمن زبان میں میڈیکل کیمسٹری سے متعلق ایک کتاب لکھی جو بعد میں New Chemical Medicine of Paracelsus کے نام سے مشہور ہوئی۔ لاطینی میں اس کا ترجمہ Qswad Croll (d.1609-AD) اور Deniel Sennert (d.1637-AD) کی کوششوں سے ۱۹۰۶ء میں فرینکفرٹ سے Basilica Chymica کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ابن سلومی نے اپنے عربی ترجمہ کے لیے اسی لاطینی ترجمہ کو بنیاد بنایا اور اس کا نام 'کتاب الطب الجدید الکیمیائی' رکھا۔ ابن سلومی نے بعد میں اس ترجمہ کو اپنی 'کتاب غایة الا تقان فی تدبیر الانسان' کا جزء بنالیا۔

یہاں پر غیر عربی داں کے لیے براکلسوس کے نام کی وضاحت ضروری ہے۔ عربی زبان میں چونکہ لفظ 'پ' کا استعمال نہیں ہوتا اس لیے جب پیراسلسس کی تعریب یعنی اس کو عربی میں لکھا گیا تو 'P' ''ب' سے، 'C' ''ک' سے اور 'U' ''و' سے تبدیل ہو کر براکلسوس ہو گیا۔

براکلسوس کے نام پر مغالطہ انگیز مفروضہ کی بنیاد دراصل مطبع نامی سے شائع

شدہ کتاب "کتاب الإکسیر فی صناعة الکیمیاء، المسمی بطب الکیمیائی الذی اخترعه براکلسوس الحکیم الیونانی" ہے۔خدابخش لائبریری کے نسخہ میں بھی الحکیم براکلسوس لکھا ہوا ہے۔ یہاں پر براکلسوس کی نسبت 'الجرمانی' بھی لکھی گئی ہے، کیونکہ وہ جرمنی میں پیدا ہوا تھا۔راقم نے جب استادمحترم سے 'براکلسوس' کی حقیقت بتائی تو آپ نے بے حد خوشی کا اظہار کیا اور برجستہ کہا کہ 'تمھاری' ریسرچ مکمل ہوگئی'۔استادمحترم بہت خوش تھے اور متحیر بھی۔ بڑے ہی سنجیدہ لہجہ میں کہا کہ مسیح الملک حکیم اجمل خان اوران کے شاگردوں نے جرمنی اسکالر کو یونانی اسکالر لکھ دیا اور ہم اب تک کشتہ سازی کی تاریخ سے متعلق یہی تاریخ پڑھتے پڑھاتے رہے۔

خیر! تھیسس جمع کرنے کا وقت قریب آتا جارہا تھا۔تجربہ کے لیے ابھی کشتہ بھی تیار کرنا تھا اور ایک اہم مسئلہ انیمل ہاؤس (Animal House) میں انیمل کی فراہمی کا بھی تھا،لیکن سرِدست کشتہ بنانا زیادہ ضروری تھا کیوں کہ اس کے بغیر تجرباتی وتحقیقی مطالعہ ناممکن تھا۔اس سے قبل راقم کو کشتہ کی تیاری کا کوئی عملی تجربہ نہیں تھا،صرف کتابوں میں ہی کشتہ سازی کی طریقۂ تیاری کے بارے میں پڑھا تھا۔ روایتی اور مفل فرنیس دونوں ہی طریقہ سے کشتہ تیار کرنا تھا۔ روایتی طریقۂ تیاری کے لیے انسٹی ٹیوٹ میں سہولیات نہیں تھی البتہ لیبوریٹری میں مفل فرنیس موجود تھا۔لیکن سب سے پہلے روایتی طریقۂ تیاری کے ذریعہ کشتہ بنانا اور درجۂ حرارت کی پیائش ضروری تھی۔ یہ ایک اہم مسئلہ تھا۔اس سلسلہ میں جب استادمحترم سے گفتگو کی گئی تو انھوں نے کہا کہ اتنی جلدی سامانوں کی فراہمی تو مشکل امر ہے۔ایسا کرو کہ علی گڑھ چلے جاؤ وہاں شعبۂ علم الصیدلہ میں کشتہ سے متعلق ایک پروجیکٹ چل رہا ہے۔ میں پروفیسر تاج الدین صاحب سے اس سلسلہ میں بات کرلوں گا۔اسی وقت سر نے پروفیسر تاج الدین صاحب سے گفتگو فرمائی،ادھر سے مثبت میں جواب ملا۔اس کے بعد راقم تعلیمی تعطیل (Academic Leave) لے کر علی گڑھ کے لیے روانہ ہوگیا۔اجمل خان طبیہ کالج میں شعبۂ علم الادویہ سے متصل ہربل گارڈن میں ایک گڈھا کھدا ہوا تھا۔دسمبر کا مہینہ تھا اور علی گڑھ کی سردی شباب پر تھی۔راقم پہلے سے ہی بوتہ اور گلِ حکمت کی ساری چیزیں تیار کررکھی تھیں، وہاں اُپلے کا بھی انتظام ہوگیا اور زندگی میں پہلی بار کشتہ کی تیاری میں جٹ گیا۔ اس وقت شعبۂ علم الادویہ میں کشتہ کے پروجیکٹ پر ڈاکٹر محمد مظفر نجیب آبادی کام کررہے تھے۔انھوں نے بڑے خلوص اور محبت سے طریقۂ تیاری کے بارے میں اپنے تجربات شیئر کیے اور تھرمامیٹر عنایت کیا۔کشتہ سازی کے لیے جب ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں تو استادمحترم کوفون لگا کر بتایا کہ تیاریاں مکمل ہوچکی ہیں اب آگ دہکانے جارہا ہوں۔ استادمحترم نے کچھ ہدایات کیں اور حوصلہ دیا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، بس اصولوں کے مطابق ساری چیزوں پر عمل کرنا۔ الحمدللہ روزِ اول کا تجربہ کامیاب رہا۔اس طرح ہفتہ میں کشتہ کے تین سیمپل تیار کیے اور بنگلور کے لیے روانہ ہوگیا۔انسٹی ٹیوٹ پہنچتے ہی شعبہ میں 'کشتہ نمائی' کی ایک چھوٹی سی پارٹی رکھی گئی۔راقم نے جب بوتہ کو احتیاط کے ساتھ کھولا تو اس کے اندر سے نہایت سفید روئی کے مانند شگفتہ کشتہ نکلا۔ جسے دیکھ کر پروفیسر غفران احمد صاحب نے خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ اس موقع پر راقم کے نگراں ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مشفق اساتذہ کرام ڈاکٹر غلام الدین صاحب، ڈاکٹر نسرین جہاں صاحبہ اور ڈاکٹر نجیب جہاں صاحبہ کے علاوہ شعبہ اور دیگر شعبہ جات کے اساتذہ اور طلبہ بھی موجود تھے۔ چونکہ تھرمامیٹر کے ذریعہ حرارت کو معیاری بنالیا گیا تھا،اس لیے اب مفل فرنیس کے ذریعہ کشتہ بنانے میں کسی قسم کی دقت نہیں تھی۔ کشتہ تیار ہونے کے بعد سمیاتی تجربہ کے لیے انیمل کی ضرورت تھی۔ اور انیمل کی فراہمی کو بھی استادمحترم نے آسان بنادیا۔

راقم کو مقالہ نویسی کا شوق تھا اور جنون بھی۔بغیر کسی ارادہ کے جو موضوع بہتر لگا لکھنا شروع کردیا۔ایک بار کا واقعہ ہے کہ 'اجزاءِ لونیہ' سے متعلق ایک مضمون سَر کو دکھایا مضمون پڑھنے کے بعد مسکرائے اور فرمانے لگے کہ اس میں 'نرگسیت' زیادہ ہے، سائنسی اور طبی مضامین کی زبان بہت سادہ ہونی چاہیے تاکہ آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ منطقی اور فلسفیانہ اسلوبِ بیان سے بھی احتراز کرنا چاہیے۔ سننے میں یہ بہت معمولی باتیں معلوم ہورہی تھیں لیکن ان کے اندر گہرائی بہت زیادہ تھی۔

استادمحترم کے تربیت کا یہی انداز تھا۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بغرض اصلاح اگر کسی کو کوئی مضمون دیا جاتا ہے تو وہ اس مضمون کو بالکل تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ جملے کے جملے قلم زد کر دیتا ہے یا انھیں نوک قلم سے مٹا دیتا ہے، پھر اس میں اپنی صلاحیت اور قابلیت کا انبار لگا دیتا ہے۔ لیکن استادمحترم کے اصلاح کا طریقہ بالکل جداگانہ تھا۔ اصلاح کے ساتھ استادمحترم مقالہ نگار کی نفسیات کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اصلاح کے وقت ان کی کوشش ہوتی کہ نفس مضمون باقی رہے البتہ الفاظ کے در و بست اور جملوں میں معمولی قسم کا حذف و اضافہ کرتے۔ مقالہ نگار سے یہ بھی کہتے کہ اگر اس کو اس طرح لکھا جاتا تو اور بہتر ہوتا۔

استادمحترم کا انداز بیان اور اسلوب نگارش بالکل منفرد تھا۔ آپ کی تحریریں زیادہ تر انگریزی زبان میں ہیں۔ اردو میں بہت کم لکھا ہے۔ اسی طرح زیادہ تر لکچر انگریزی میں ہی دیا کرتے تھے۔ ۲۰۰۹ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ میں ہمارے بیچ کا الوداعیہ تھا۔ اساتذہ میں جب استادمحترم کو اظہار خیال کے لیے دعوت دی گئی تو آپ نے پوچھا کہ انگریزی میں بولوں یا اردو میں۔ پورے مجمع سے بس یہی صدا گونجی کہ سر اردو میں۔ ہم لوگ تو ان کے ادبی ذوق اور لطافت سے واقف تھے لیکن جنوب ہند کے اساتذہ وطلبہ محو حیرت تھے کہ آپ اردو میں بھی اتنی خوبصورت گفتگو کر سکتے ہیں۔ استادمحترم نے جب بولنا شروع کیا تو ایسا لگا جیسے خوبصورت الفاظ کے موتیوں کا ہار پرو دیا گیا ہو۔ شستہ زبان، شیریں تکلم اور انداز بیان میں بلا کا اعتماد۔ جملے رنگ حنا سے نرگسیت کو سمیٹے ہوئے تھے۔ ایک ایک لفظ سے شگفتگی و نشاط کا اظہار ہو رہا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے قندیل فروزاں ہو، سیمینار ہال (لائبریری) کا ماحول شبنمی تھا جیسے ہر فرد تر و تازہ۔ یہ ایک تاریخی الوداعیہ تھا جس میں ایک سائنٹسٹ نے اپنے طرز تکلم سے سب کو محو حیرت میں ڈال دیا تھا۔

استادمحترم نے جب انسٹی ٹیوٹ جوائن کیا تو ایک مسئلہ ان کے قیام کا تھا۔ ہم طلبہ کو ٹیگے پالیہ کے دوسرے حصے میں جو بی ڈی اے کی طرف جاتا ہے ان کے لیے کرایہ پر مکان کی تلاش میں نکل جاتے، بڑی مشکلوں سے بی ڈی اے کے پاس ایک مکان کرایہ پر ملا اور استادمحترم وہیں قیام کرنے لگے، لیکن بیشتر وقت انسٹی ٹیوٹ میں ہی گزارتے۔ نماز عصر کے بعد ہم سب مل کر چائے پیتے اور طب کے علاوہ علمی و سیاسی موضوعات اور معاشیات پر بھی گفتگو ہوتی۔ استادمحترم ماہر معاشیات بھی تھے، کم افراد اس چیز سے واقف تھے۔ اس کے بعد اکثر انڈور گیم میں چلے جاتے۔ استادمحترم اس میدان میں بھی ہمیشہ استاد رہے۔ ٹیبل ٹینس میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ راقم کبھی دو تین بال سے زیادہ ٹک نہیں پایا، یہی حال ڈاکٹر ساجد فراہی کا بھی تھا۔ ہاں ڈاکٹر امان اللہ حاجی اور ڈاکٹر اکمل وغیرہ کچھ دیر ان کے سامنے ٹک جاتے تھے، مگر شکست ان کا بھی مقدر ہوتی۔ اسی طرح بیڈ منٹن بھی بہت اچھا کھیلتے تھے۔ سنگل و ڈبل دونوں گیم کھیلتے تھے، غضب کی چستی و پھرتی تھی۔ ان کے سامنے اچھے اچھے کھلاڑی کھیلنے سے کتراتے تھے۔ استادمحترم کے علاوہ اساتذہ میں پروفیسر منصور احمد صدیقی صاحب، پروفیسر محمد ذوالکفل صاحب اور ڈاکٹر ارش شیروانی صاحب بھی پابندی سے تشریف لاتے تھے۔ ڈائریکٹر پروفیسر مستحسن علی جعفری صاحب بھی کبھی کبھی تشریف لاتے تھے۔ پھر مغرب کا وقت ہوتا اور نماز کے بعد اکثر ڈپارٹمنٹ کا رخ کرتے اور اپنے چیمبر میں تحقیق و ریسرچ کے کام میں مشغول ہو جاتے۔ عشاء کا وقت ہو جاتا تو نماز کے بعد اور کبھی نماز سے قبل ڈائننگ ہال میں کھانا تناول فرماتے اور اس کے بعد اپنی قیام گاہ کا رخ کرتے تھے۔ شروع شروع میں ہم سب آپ کو چھوڑنے آپ کے مکان تک جاتے تھے۔ جاتے ہوئے اکثر بی ڈی اے پر رک جاتے اور بغیر کھلائے پلائے واپس نہیں کرتے تھے۔ استادمحترم بہت فراخ دل تھے، طلبہ کو کھلانے پلانے میں ہمیشہ خوشی محسوس کرتے تھے۔ استادمحترم چونکہ تنہا رہتے تھے اس لیے دوپہر اور رات کا کھانا ڈائننگ ہال میں ہی تناول کرتے۔ مہینہ ختم ہوتے ہی ڈائننگ ہال کا چارج ادا کر دیتے، ہمیشہ اخراجات سے زیادہ رقم جمع کیا کرتے اور جب ہم طلبہ باقی رقم واپس کرنے جاتے تو کہہ دیتے کہ تم لوگ کچھ کھا پی لینا۔

استادمحترم کی خواہش تھی کہ وہ انسٹی ٹیوٹ میں کچھ سال مزید قیام کریں، لیکن اہل خانہ علی گڑھ میں مقیم تھے، اس لیے خانگی معاملات درپیش رہتے تھے۔ بچوں کی تعلیم کا مسئلہ سب سے اہم تھا، اس وقت سر کا بڑا بیٹا غالباً ہائی اسکول میں تھا، اکثر اس کے تئیں متفکر رہتے، کہتے کہ اگر میں نہیں گیا تو اس کی تعلیم متاثر ہو جائے گی۔ واقعی بچے چھوٹے تھے اور ان کی ہمہ آن کی ضروریات زندگی کو پوری کرنا، ان کی دیکھ بھال کرنا، زمانہ کے نشیب و فراز سے انھیں محفوظ رکھنا بہت ضروری تھا۔

اکتوبر ۲۰۰۹ء میں ہمارا فائنل امتحان ختم ہوا، ادھر استادِ محترم نے بھی ۲۹ رنومبر ۲۰۰۹ء کو نیشنل انسٹی ٹیوٹ کو خیرباد کہہ دیا۔ امتحان کے بعد ہمارا پیارا بیچ ایک دوسرے سے بچھڑ گیا ڈاکٹر امان اللہ حاجی، ڈاکٹر افروزہ، ڈاکٹر مشتاق اور ڈاکٹر الطاف نے کشمیر کا رخ کیا۔ اس وقت ڈاکٹر امان اللہ حاجی، ڈاکٹر افروزہ اور ڈاکٹر مشتاق جموں کشمیر میں میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں جب کہ ڈاکٹر الطاف مدھیہ پردیش میں میڈیکل آفیسر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہیں پر حکیم سید ضیاء الحسن گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج، بھوپال کے اندر ڈاکٹر حنا شعبۂ نسواں وقبالت میں اسوشئیٹ پروفیسر ہیں۔ راقم، ڈاکٹر جاوید و ڈاکٹر شگفتہ دیوبند آ گئے۔ ڈاکٹر جاوید اس وقت محمدیہ طبیہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں جب کہ ڈاکٹر شگفتہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن فار اسکن ڈس آرڈر کے شعبۂ علم الادویہ میں بحیثیت پروفیسر اور راقم اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج، الہ آباد میں اسوشئیٹ پروفیسر وصدر شعبۂ علم الادویہ ہیں۔ ڈاکٹر ساجد مالیگاؤں چلے گئے اور وہیں پر شعبۂ حفظان صحت میں اسوشئیٹ پروفیسر وصدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر منی رام اور ڈاکٹر بجو سنگھ ان دنوں اسٹیٹ تکمیل الطب کالج، لکھنؤ میں اسوشئیٹ پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر نادیہ رہبر یونانی میڈیکل کالج، پنجاب سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر سلمٰی مقامی تھیں اور اِن سروس پی جی کرنے آئی تھیں، پھر سے میڈیکل آفیسر کی پوسٹ جوائن کر لی۔ اس کے علاوہ بنگلہ دیش سے تشریف لائے ڈاکٹر نظر الاسلام نے فراغت کے بعد ہمدرد یونیورسٹی، بنگلہ دیش جوائن کر لیا۔ ڈاکٹر انصاری شبنم قرول باغ آیورویدک اینڈ یونانی کالج کے شعبۂ حفظانِ صحت سے وابستہ ہیں۔ ہم سب کی سینئر اور سرپرستی فرمانے والی ڈاکٹر شبانہ میڈم زوجہ پروفیسر مستحسن علی جعفری دہلی میں مقیم ہیں۔

بنگلور کے زمانہ طالب علمی سے بہت سارے واقعات اور یادیں وابستہ ہیں، لیکن ایک واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ تھیسس جمع کرنے کی تاریخ بالکل قریب تھی ہر شخص الجھنوں کا شکار تھا۔ اللہ اللہ کر کے تھیسس مکمل ہوئی پھر ایک اہم مسئلہ اس کی پرنٹنگ اور بائنڈنگ کا تھا۔ پریس والے کے پاس گئے اس نے کہا کہ پرنٹنگ اور بائنڈنگ کے لیے دس روز لگیں گے۔ یہ ایام تو بہت زیادہ تھے، اس لیے کہ ہمارے پاس کل ایک ہفتہ ہی باقی بچا تھا۔ پھر یہ پروگرام طے پایا کہ ہاسٹل میں ہی پرنٹر لاکر پرنٹ کیا جائے، لہٰذا پرنٹر لاکر کام شروع کر دیا گیا کہ اچانک دیر رات گئے پرنٹر خراب ہو گیا، ہر شخص پریشان کہ اب کیا کیا جائے۔ چونکہ میری ہی تھیسس پر کام چل رہا تھا، اس لیے ساتھیوں کا مشورہ ہوا کہ ڈپارٹمنٹ سے پرنٹر لاکر کام کر لیا جائے اور علی الصباح دوبارہ پرنٹر ڈپارٹمنٹ میں خاموشی سے رکھ دیا جائے۔ خیر! رات میں پرنٹر لایا گیا اور جب تھیسس پرنٹ ہو گئی تو سب لوگ خوش ہو کر خواب خرگوش میں چلے گئے۔ صبح دیر سے بیدار ہوئے، ادھر ڈپارٹمنٹ میں ہنگامہ برپا تھا کہ پرنٹر غائب ہو گیا۔ ہم لوگ جب پرنٹر لے کر ڈپارٹمنٹ پہنچے تو اس وقت ماحول بہت گرم تھا۔ خیر! پرنٹر کو کمرہ میں رکھ دیا گیا۔ اس وقت تک یہ خبر گردش کر چکی تھی کہ پرنٹر ڈاکٹر شمیم ارشاد لے گئے تھے۔ استادِ محترم نے چیمبر میں طلب کیا۔ پہلی بار استادِ محترم کو اس قدر غصہ میں دیکھا۔ خوب ڈانٹ پلائی اور یہ بار بار کہتے کہ تمھیں ضرورت تھی تو مجھ سے ایک بار پوچھ لیا ہوتا تو کیا میں منع کر دیتا؟ ڈپارٹمنٹ کی چیز ڈپارٹمنٹ کے لیے ہوتی ہے اسے ذاتی طور پر کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں کھڑا بُت بنا سب سنتا رہا، کچھ بولنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کرسی پر بیٹھنے کو کہا، اب چیمبر کا ماحول قدرے پرسکون تھا۔ استادِ محترم ڈسپلن کے بہت پابند تھے۔ ان کی شخصیت کا ہر پہلو نرالا تھا۔ ان کی شخصیت میں والدین کی شفقت، پیار اور ہمدردی کا احساس ہوتا تھا۔ باتوں میں اپنا پن تھا۔ کسی کو پریشان دیکھتے تو خود پریشان ہو جاتے۔ ہمیشہ لوگوں کا تعاون کیا اور فائدہ پہنچایا۔

استادِ محترم سے متعلق ایک اور واقعہ یاد آ گیا ہے۔ ہوا یوں کہ کافی دنوں کے بعد ہم لوگوں کی اسکالرشپ کا ایریئر آ گیا تھا۔ اچھی خاصی رقم مل گئی تھی، ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ مزید کچھ رقم ملا کر علی گڑھ یا کہیں اور کوئی پلاٹ خرید لیا جائے۔ راقم سوالی بن کر استادِ محترم کے پاس گیا، اس وقت ان کے اکاؤنٹ میں صرف پینتیس ہزار روپئے تھے۔ استادِ محترم سے جب مدعا بیان کیا اور بطور قرض کچھ رقم کا طلبگار ہوا تو کہنے لگے کہ کتنے پیسے کی ضرورت ہے؟ میں خاموش رہا، پھر اکاؤنٹ چیک کیا اور کہنے لگے کہ تیس ہزار سے کام چل جائے گا، میں نے کہا جی سر۔ فوراً تیس ہزار روپئے کا چیک کاٹ کر دیا۔ اس طرح نہ جانے کتنے واقعات ہیں استادِ محترم کے ایثار وتعاون کے۔

راقم نے امتحان کے معاً بعد جامعہ طبیہ دیوبند جوائن کرلیا اور استاد محترم نومبر کے آخر میں دوبارہ شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ پہنچ گئے۔ درس و تدریس سے وابستگی کے بعد استاد محترم سے مستقل طبی مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی۔ دیوبند سے علی گڑھ قریب تھا اس لیے سیمینار اور کانفرنسز کے مواقع پر آسانی سے حاضری ہوجاتی اور استاد محترم کا نیاز حاصل ہوجاتا۔ شعبۂ علم الادویہ کے چھوٹے سے چیمبر میں اتنے بڑے بڑے کام کرنے والا بڑی سادگی، لگن اور ایمانداری کے ساتھ ریسرچ و تحقیق میں مصروف رہتا۔ آنے جانے والے آتے جاتے رہتے، چائے پیتے اور کچھ وقت ہم عصروں سے خوش گپیوں میں مشغول ہوجاتے، ان کے جانے کے بعد دوبارہ کام میں مصروف ہوجاتے۔ جب بھی ہم لوگ چھوٹے سے چمبر کی شکایت کرتے تو ہنستے ہوئے کہتے اجی کام سے مطلب ہے کہ چیمبر سے۔ اس چھوٹے سے چیمبر میں ٹیبل اور ایک ریوالنگ چیئر کے علاوہ سامنے تین کرسیاں اور سائیڈ میں ڈیسک ٹاپ جس کے کی-بورڈ (Key-Board) پر ہمیشہ انگلیاں اٹکی رہتیں اور یہ چھوٹا سا کمرہ ہمیشہ مرجع خلائق بنا رہتا۔ اس چھوٹے سے چیمبر نے نہ جانے کتنوں کی حاجت روائی کی ہے۔ اس چھوٹے سے چیمبر نے بہتوں کو مصنف اور قلم کار بنایا ہے۔ استاد محترم کا زیادہ تر وقت دوسروں کے ریسرچ پیپر کے کریکشن، ریویو اور لکھنے میں ختم ہوجاتا تھا۔ اکثر تشنگان علم آپ کے پاس مسائل لے کر جاتے اور مکمل سیراب ہوکر آتے۔ شعبۂ علم الادویہ کے علاوہ اجمل خان طبیہ کالج کے دیگر شعبہ جات بالخصوص معالجات اور سرجری کے ریسرچ کے طلبہ بھی مستقل آپ سے فیضیاب ہوتے۔ اس کے علاوہ دیگر فیکلٹیز کے اساتذہ اور طلبہ بھی ریسرچ سے متعلق اپنے شکوک وشبہات کو دور کرنے کے لیے تشریف لاتے۔ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی سے گہری وابستگی تھی۔ ریسرچ و تحقیق کے کاموں کے علاوہ ہپوکریٹک جرنل کے اکثر مقالہ جات کا ریویو بھی فرماتے۔

راقم نے جب پہلی بار اپنی کتاب 'کشتہ سم الفار' آپ کی خدمت میں پیش کی تو بہت خوشی کا اظہار کیا اور مستقل کام کرنے کی ہدایت دی۔ ۲۰۱۱ء میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو میں طب کی نصابی کتابوں کی فراہمی کے لیے ایک بڑا پروجیکٹ منظور کیا۔ یونانی اکسپرٹس کی میٹنگ ہوئی اور یونانی طب کے جملہ مضامین کو کتابی شکل میں تیار کرنے کے لیے موضوعات کا تعین ہوا۔ استاد محترم چونکہ صیدلہ کا طویل تدریسی تجربہ رکھتے تھے اس لیے کمیٹی کے ممبران اور کونسل کے ذمہ داران نے صیدلہ کی مکمل کتاب کی تیاری کے لیے آپ کا انتخاب کیا۔ استاد محترم نے جلد ہی صیدلہ کی کتاب تیار کرلی اور اس کی پروف ریڈنگ کے لیے بعض ہم عصروں اور شاگردوں کو بھیج دیا۔ راقم بھی ان خوش بختوں میں ہے۔ اس وقت یہ کتاب ڈھائی سو صفحات پر مشتمل رہی ہوگی۔ چونکہ پروجیکٹ کے لیے دو ماہ کا وقت دیا گیا تھا، لیکن اتنی قلیل مدت میں نصاب سے متعلق کتاب لکھنا تو دور کی بات، کسی موضوع پر عام مضمون لکھنا بھی آسان نہ تھا، خیر! پروجیکٹ کی مدت میں وسعت ملتی گئی اور اس طرح کتاب 'اصول دواسازی' کی ضخامت میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور یہ اضافہ سات سو سے زائد صفحات تک پہنچ گیا۔ اس درمیان کونسل نے استاد محترم سے کتاب کی اشاعت کے بارے میں کئی بار رابطہ کیا۔ کونسل نے ایک شرط لگادی تھی کہ کتاب کی ضخامت کم کردی جائے مگر استاد محترم کو یہ شرط قبول نہیں تھی۔ بعد میں قومی کونسل نے یونانی پینل کا ایک بورڈ تیار کیا جس میں ملک بھر سے یونانی طب کے ماہرین کا پینل بنایا گیا۔ اس پینل میں پروفیسر غفران احمد، ڈاکٹر جلیس احمد، حکیم وسیم احمد اعظمی، پروفیسر اشہر قدیر، پروفیسر محمد ایوب، ڈاکٹر محمد اکرم، ڈاکٹر شبیر احمد، ڈاکٹر وسیم احمد 'بنگلور' کے علاوہ ہیچ مداں کا نام بھی شامل تھا۔ اس پینل کی میٹنگ ۳۰/جولائی ۲۰۱۹ء کو کونسل میں طے پائی۔ راقم الحروف میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے دیوبند سے علی گڑھ آ گیا تھا۔ ۳۰/جولائی کی صبح علی گڑھ سے استاد محترم کی کار سے میٹنگ میں شرکت کی غرض سے دہلی کے لیے نکل پڑے۔ اس وقت نجیب الدین سمرقندی کی کتاب 'ادویۂ مفردہ' کا ترجمہ رضا لائبریری سے شائع ہوکر آ گیا تھا۔ راقم نے استاد محترم کو نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ یہ کتاب پیش کی۔ ہمیشہ کی طرح استاد محترم نے حوصلہ افزائی فرمائی اور خوشی کا اظہار کیا۔ اس کتاب کے بارے میں استاد محترم بارہا کہا کرتے تھے کہ تمھارا یہ ترجمہ کلاس میں پڑھانے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ استاد محترم کا یہ فرمانا ناچیز کے لیے کسی سند سے کم نہ تھا۔ خیر! راستے بھر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ طبی مخطوطات کی تدوین و ترجمہ پر بھی گفتگو ہوئی۔ کہنے لگے کہ تم نے جو میدان چنا ہے اسی میں کام کرو، یہ میدان بالکل خالی ہے۔ مشکل تو ہے مگر محنت

کروگے تو کامیابی ملے گی۔ باتوں باتوں میں کب ہماری گاڑی نوئیڈا آ گئی کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ چوں کہ اس روز قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی میٹنگ سے قبل استادمحترم کوسی سی آر یو ایم کی بھی ایک میٹنگ میں شرکت کرنا تھا، اس لیے راقم نوئیڈا اتر کر سیدھے اردو کونسل کے دفتر پہنچ گیا اور استادمحترم سی سی آر یو ایم کے دفتر جنکپوری چلے گئے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں میٹنگ مقررہ وقت سے کچھ تاخیر کے بعد شروع ہوئی۔ دیگر شعبہ جات کے علاوہ علم الادویہ کے مضامین سے متعلق مختلف جہات سے گفتگو ہوئی۔ ظہرانہ سے قبل استادمحترم بھی تشریف لا چکے تھے۔ ڈاکٹر خالد صدیقی صاحب جو نصابی کمیٹی کے چیرمین ہیں استادمحترم سے صیدلہ کی کتاب کے بارے میں دریافت کیا۔ استادمحترم نے فرمایا کہ کتاب مکمل ہے بس آلات کی سیٹنگ باقی ہے۔ ضخامت کچھ زیادہ ہوگئی ہے جسے دو جلدوں میں شائع کرنا بہتر ہوگا۔ کونسل کے ذمہ داران کتاب کی دو جلدوں کی اشاعت کے حق میں نہیں تھے۔ بعض پینل کے ممبران نے بھی کونسل کی رائے کی حمایت کی، مگر بعض ممبران نے کہا کہ جب دیگر سبجکٹ سے متعلق کتابوں کی اشاعت دو جلدوں میں ہو رہی ہے تو 'اصول دواسازی' کو بھی دو جلدوں میں شائع کیا جانا چاہیے۔ خیر! میٹنگ ختم ہوگئی اور کوئی فیصلہ نہیں ہو پایا۔ کچھ دنوں کے بعد استادمحترم سے اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ میں اب ذاتی طور سے کتاب شائع کروں گا۔

اسی درمیان اس کتاب کے ساتھ ایک عظیم حادثہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ استاد محترم کے ایک بہت ہی قریبی شاگرد نے آپ کے 'مسودہ' سے 'بھرپور' استفادہ کرکے اپنی کتاب تیار کرکے شائع کرالی۔ مسروقہ کتاب ستمبر ۲۰۲۰ء میں شائع ہوگئی۔ فروری ۲۰۲۱ء میں جب اس کتاب کی اشاعت کا علم استادمحترم کے بعض شاگردوں کو ہوا اور کتاب کے مشمولات کو دیکھا تو حیران و ششدر رہ گئے، کیوں کہ کتاب کے سارے مشمولات وہی تھے جنھیں استادمحترم نے اپنی کتاب میں بیان کیا تھا۔ بعض مضامین تو ایسے تھے جن کا ذکر صیدلہ سے متعلق شائع ہونے والی کسی کتاب میں نہیں ملتا یا ملتا بھی ہے تو بہت ہی اجمالی اور ناقص۔ استادمحترم نے اپنے پچیس سالہ طویل تدریسی تجربات کی روشنی میں صیدلہ کے تمام موضوعات ومباحث کو تحقیقی شان عطا کی تھی۔ جب استادمحترم کو 'مسروقہ' کتاب کی اشاعت اور اس کے مشمولات کے بارے میں علم ہوا تو انھیں حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ ایسا کیوں نہ ہوتا، کیوں کہ شاگرد خاص نے ان کی زندگی کی 'متاع عزیز' جس کی ترتیب وتدوین پر انھوں نے اپنی زندگی کے کم وبیش ۲۵ قیمتی سال لگائے تھے۔ ساری محنت اور کوشش یکلخت ایک ایسے شخص کے نام منسوب ہوچکی تھی جس پر انھوں نے سب سے زیادہ بھروسہ کیا تھا۔

۸/اپریل کو استادمحترم سے طویل ملاقات رہی۔ چہرہ پر پہلے جیسی تروتازگی اور تبسم نہیں تھا۔ کبیدہ خاطر دکھے۔ استادمحترم کی حالت اور صحت دیکھ کر میں 'مسروقہ' کتاب کے بارے میں کسی قسم کی گفتگو نہیں کرنا چاہ رہا تھا، لیکن باتوں باتوں میں اس کا ذکر آ ہی گیا۔ واقعی استادمحترم اخلاق وشائستگی میں اسلاف کے نمونہ تھے۔ جب موصوف محترم اور 'مسروقہ' کتاب کا ذکر آیا تو چہرہ پر ایک طرح کی سرخی نمودار ہوئی مگر کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی 'موصوف' کے بارے میں کچھ کہا۔ بس یہی تاکید کرتے رہے کہ خدارا تم لوگ اس کتاب کے بارے میں کچھ نہ کہنا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ لکھنا۔ میں اپنی کتاب 'اصول دواسازی' کے مقدمہ میں ان باتوں کا ذکر کردوں گا۔ جس سے کتاب کی حقیقت سب کے سامنے آجائے گی۔

استادمحترم سے جب بھی موبائل پر گفتگو ہوتی اسی بات کی تاکید کرتے اور میسیجز میں بھی اسی بات کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ راقم کے پاس اس طرح کے کئی میسیج تھے مگر موبائل کے خراب ہوجانے کی وجہ سے اکثر میسیجز ضائع ہوگئے، صرف ایک میسیج کی اسکرین شاٹ باقی رہ گئی ہے۔ اسے یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ استادمحترم راقم کو میسیج کرتے ہیں کہ 'خدارا تم لوگ کسی ردعمل کا اظہار مت کرو۔ جب یہ کتاب (اصول دواسازی: پروفیسر غفران احمد) منظر عام پر آئے گی تو بیشتر لوگوں (کو) اندازہ ہوجائے گا کہ اس کے مشمولات میں کہاں کہاں آمیزش ہے۔ حالانکہ زبان و بیان اور ترتیب ابواب میں تبدیلی کی گئی ہے اور دو پرانے مضامین بھی شامل کردیے گئے ہیں تاکہ یہ میری کتاب سے مختلف ہوجائے۔ کچھ ایسے مواد بھی شامل ہیں جو میں نے وقتاً فوقتاً ڈسکس کیے تھے لیکن طوالت کے خوف سے اپنی کتاب میں شامل نہیں کیے تھے، بہرکیف میں کوئی الزام عائد نہیں کر رہا ہوں۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ جب یہ کتاب زیر ترتیب تھی تو میری کتاب کا مسودہ

مصنف کے پاس موجود تھا جو اس وعدے پر لے گئے تھے کہ پڑھ کر واپس کر دیں گے۔ انھیں کسی انٹرویو کی تیاری کرنی تھی، مناسب ہوتا کہ وہ مجھے مطلع کرتے کہ وہ خود کوئی کتاب ترتیب دے رہے ہیں اور میرے مسودے سے استفادہ کر رہے ہیں۔ میری اجازت سے وہ بعض موضوعات کو شامل بھی کر سکتے تھے، میرا احساس ہے کہ اگر وہ میرا مسودہ نہ دیکھتے تو شاید انھیں اس موضوع پر کتاب لکھنے کا خیال نہ آتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

راقم کے پاس استادمحترم کی اس طرح کی کئی تحریریں موجود تھیں۔ ہر بار یہ تاکید کرتے کہ تم لوگ اس مسئلہ میں کچھ نہ لکھو، لیکن آج جب کہ استادمحترم اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں، اس لیے مذکورہ میسیج کو ان کی روح سے معافی چاہتے ہوئے نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ استادمحترم کے مسودہ سے مستفاد بلکہ چربہ کی ہوئی کتاب کسی اور کی نہیں بلکہ پروفیسر غفران احمد کی ہی ہے۔ یہ ایک علمی بددیانتی اور اخلاقی پستی ہے۔ استادمحترم کو اس حادثہ کا گہرا صدمہ ہوا اور وہ اس صدمہ کو سینہ میں لے کر مالک حقیقی سے جا ملے۔

اسی دوران 'کورونا' کی دوسری لہر شروع ہوگئی۔ مریضوں سے ہاسپٹل ٹھس گئے، ادھر متواتر مریضوں کا اضافہ ہونے لگا تھا، خوف و ہراس کا ماحول تھا، دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کی کثیر تعداد لقمہ اجل بنتی جارہی تھی۔ استادمحترم کو بھی معمولی نزلہ وزکام شروع ہوا۔ سب کچھ ٹھیک تھا، گفتگو ہوتی رہی، زندگی معمول کے مطابق تھی۔ غالباً ۲۱/ یا ۲۲/اپریل ۲۰۲۱ء کو شام میں استادمحترم سے فون پر گفتگو ہوئی، گفتگو سے نقاہت اور بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا۔ بہت ہی دھیمے لہجہ میں فرمایا کہ 'شمیم میں ہاسپٹل آ گیا ہوں' اس کے بعد میں نے کہا سر آپ آرام کریں میں پھر بعد میں بات کروں گا۔ کسے معلوم تھا کہ چند سکنڈ کی یہ گفتگو استادمحترم سے آخری گفتگو ہوگی۔ صبح کو فون لگایا تو بیٹے نے فون اٹھایا، حالات دریافت کیے۔ دوسرے یا تیسرے دن جب کووڈ کی رپورٹ مثبت میں آ گئی تو انھیں 'کووڈ وارڈ' میں منتقل کر دیا گیا اور گفتگو کا سارا سلسلہ یکلخت ٹوٹ گیا۔ ہاسپٹل کے عملہ کی عدم توجہی اور ناقص انتظامات نے یونانی طب کے درخشاں ستارے کی لَو کو مدھم کر دیا۔ آکسیجن کی سپلائی خراب ہوگئی تھی، صحت گرتی جارہی تھی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے بے ہوش ہوگئے، زندگی کی ڈور کھنچتی جارہی تھی، بے ہوشی کی حالت میں کے جی ایم یو (King George's Medical University) لکھنؤ لایا گیا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ رمضان کا مہینہ، ہر طرف سے استادمحترم کے لیے دعاؤں کا سلسلہ جاری تھا، دوسرے دن کچھ زندگی کے آثار دکھے، مگر یہ بجھتے چراغ کی آخری بھبھک تھی۔ ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء کی صبح اچانک موبائل کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور وہ خبر ملی جس کو ماننے کے لیے دل و دماغ بالکل تیار نہیں تھے۔ آنکھوں سے آنسو بے تحاشہ بہتے جارہے تھے۔ اہلیہ اور بچوں نے جب میری یہ کیفیت دیکھی تو انھیں بھی اندازہ ہوگیا اور سب زار و قطار رونے لگے۔ اب زندگی نے موت کی شکل اختیار کر لی تھی، مگر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ آج جب کہ استادمحترم کا انتقال ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے، مگر اب بھی دل کی کیفیت وہی ہے۔ تصویروں سے ایسا لگتا ہے کہ ابھی بول پڑیں گے۔

استادمحترم پروفیسر غفران احمد کی تبحر علمی سے ہر شخص بخوبی واقف تھا۔ نہ جانے کتنوں کے تحقیقی مضامین لکھ کر عالمی سطح کا مقالہ نگار بنا دیا۔ دوسروں کے کاموں میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ خود اپنا کوئی کام نہ کر سکے۔ ہر وقت مقالہ جات کا انبار۔ کسی نے تصحیح کے لیے بھیجا تو کسی جرنل کے ایڈیٹر نے ریویو کے لیے اور یجنل ریسرچ پیپر آپ کی خدمت میں بھیج رکھا ہے۔ استادمحترم بہت ہی علم دوست انسان تھے۔ کبھی کسی شخص کی گزارش کو نظر انداز نہیں کیا چاہے وہ جاننے والا ہو یا ناواقف۔ یہی وجہ رہی کہ استادمحترم نے ذاتی طور پر تصنیف و تالیف کا کام بہت کم کیا ہے، اس میں بھی اردو زبان میں تو محض چند مضامین ہی لکھے ہیں۔ شعبۂ علم الادویہ اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور شعبۂ علم الادویہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں آپ کی زیر نگرانی ۳۴/تحقیقی مقالہ جات لکھے گئے۔ آپ کی کتابوں میں 'اوصاف ادویہ: ضمانت سے محاسبہ تک' اور 'اصول دواسازی' شامل ہیں۔ اول الذکر کتاب ڈاکٹر سعود الظفر کی شراکت میں شریف پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ سے ۲۰۱۵ء میں شائع ہو چکی ہے جب کہ آخر الذکر کتاب منظرِ اشاعت ہے۔ WHO کی جانب سے یونانی اصطلاحات کی جو

عالمی سطح پر ڈکشنری تیار ہورہی ہے اس پروجیکٹ سے بھی آپ وابستہ رہے ہیں۔ آپ کے دو ابواب Medicinal Importance of Climbers used in Unani Medicine اور Therapeutic potential of Rhizomatous Medicinal plants used in Unani Medicare System اسپرنجر سویٹزرلینڈ سے شائع ہو چکے ہیں۔ سو سے زائد تحقیقی مقالہ جات ملک و بیرون ملک کے تحقیقی و عالمی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مختلف عالمی وقومی تحقیقی رسائل و جرائد کے ایڈیٹوریل بورڈ سے وابستہ رہے۔ Unani Medicus - An International Journal کے اسوشئیٹ ایڈیٹر رہے۔ Hippocratic Journal of Unani Medicine اور Unani Research کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن رہے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن کے ترجمان 'ترجمان طب' کے ایڈوائزری بورڈ کے ممبر رہے۔ اس کے علاوہ Journal of Research in Unani Medicine کی ویٹنگ کمیٹی کے رکن رہے۔ ۱۹۹۰ء میں وقار الملک ہال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہال میگزین 'وقار' کے اور اجمل خان طبیہ کالج کے ترجمان مجلّہ 'آئینہ طب' کے انگریزی حصہ کے مدیر رہے۔ ان کے علاوہ Hippocratic Journal of Unani Medicine، eCAM، Journal of Research in Unani Medicine، Journal of Xenobiotics، Indian Journal of Integrated Community Health، یونیمیڈ کلیات اور ترجمان طب، بنگلور وغیرہ قومی اور بین الاقوامی رسائل و جرائد کے ریویور رہے۔ ایک درجن سے زائد عالمی اور پچیس سے زائد قومی سیمینار و ورکشاپ میں آپ نے شرکت فرمائی اور مقالے پڑھے۔

استادمحترم ایک اچھے اکیڈمیشن کے ساتھ ماہر ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ صدر شعبۂ علم الادویہ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن و اجمل خان طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر بھی اپنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مختلف ریسرچ پروجیکٹ کے کوآرڈینیٹر رہے۔

استادمحترم سے ہم لوگوں نے جب بھی کتاب لکھنے کی درخواست کی تو ہنستے ہوئے ٹال دیتے۔ بہت اصرار پر یہی کہتے کہ تم لوگ کام کر رہے ہو یہی میرے لیے کافی ہے۔ کبھی کبھی جب موڈ میں ہوتے تو یہ بھی کہتے کہ تم جیسے شاگردوں کا استاد ہونا ہی میرے لیے بہت ہے۔ استادمحترم کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جو ملک و بیرون ملک میں درس و تدریس اور ریسرچ و تحقیق سے وابستہ ہیں۔ راقم بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہے۔ چند نام جو ذہن میں ہیں ان میں ڈاکٹر غلام الدین صوفی، پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن بنگلور، ڈاکٹر نسرین جہاں، پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن بنگلور، ڈاکٹر بلال احمد، اسسٹنٹ ڈائریکٹر، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، دہلی، ڈاکٹر معراج الحق، اسسٹنٹ ڈائریکٹر، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، دہلی، ڈاکٹر وسیم احمد، صدر، شعبۂ علم الادویہ، محمدیہ طبیہ کالج، مالیگاؤں، حکیم شمیم ارشاد اعظمی، صدر، شعبۂ علم الادویہ، اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج، پریاگ راج وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

۸/اپریل ۲۰۲۱ء کی آخری ملاقات میں راقم نے اپنی ایک کتاب پر مقدمہ لکھنے کی گزارش کی تو وہی خاکسارانہ انداز 'اجی میں اس لائق کہاں'۔ 'کسی پڑھے لکھے سے لکھوالو'۔ لیکن میں بھی بضد رہا اور مقدمہ لکھوانے کے لیے استادمحترم سے حامی بھروالی، لیکن صد افسوس کہ راقم کی یہ خواہش ادھوری رہی۔ علمی وطبی مسائل سے لے کر خانگی معاملات تک ہر جگہ آپ نے رہنمائی فرمائی۔ اکثر بچوں کے بارے میں پوچھتے، کہاں پڑھ رہے ہیں، کس کلاس میں ہیں۔ ایک دوبار کیفیات ایکسپریس میں بچوں سے ملاقات بھی ہوئی، خورد ونوش کے ڈھیروں سامان لاکر بچوں کو دیے اور دعائیں دیں۔ قریب اور دور کے رشتوں میں ہزار موتیں ہوئیں لیکن آپ کی موت کا صدمہ ابھی باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ استادمحترم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی

ڈاکٹر قاضی زید احمد☆

حیات مستعار کی چار دہائیاں اس عالمِ آب وگل کی بے ثباتی، نیرنگی ورعنائی، گردش ایام کے مشاہدات وتجربات کے ساتھ بعجلت تمام گزریں۔ کتاب زندگی کے اوراق دلپذیر ودل شکن واقعات وحادثات، یادرفتگاں اور گردش زمانہ کے اثرات سے عبارت ہیں تاہم بعض حوادث وتاثرات جز وقتی اور عارضی ہوتے ہیں، بعض کے نقوش گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ دھندھلے ہو جاتے ہیں لیکن کچھ غم دوراں ایسے ہوتے ہیں جن کی بازگشت تاحیات رہتی ہے۔ اس غم ہجر وفراق کا کوئی مداوانہیں ہوتا ان کا تأثر اور یادیں زندگی کا جزء لاینفک ہوجاتی ہیں اور یہ داغ ہائے سینہ سوز دروں میں تبدیل ہوجاتا ہے جو تیرگی شب حیات میں اس مصرع کا مصداق ہوتا ہے کہ: ع

دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے

میری زندگی میں پیش آنے والا ایسا ہی حادثہ فاجعہ پروفیسر غفران احمدؒ کی رحلت کی خبر صاعقہ پاش تھی جس نے ذہن ودماغ کو ماؤف، اعصاب کو شل اور جگر کو لخت لخت کردیا　ع

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

ان کی اچانک رحلت اہل خانہ، اعزہ واقارب اور خانوادہ کے لیے حادثہ جانکاہ اور غم کا ایک کوہ گراں ہے جس کو انھوں نے کمالِ ضبط، تسلیم ورضا بالقضاء کی مثالی روایت کے ساتھ برداشت کیا۔ غفران صاحب مرحوم ومغفور کی موت کا حادثہ فاجعہ صرف ان کے خانوادہ کے لیے ہی ایک سانحہ نہیں جس کے لیے وہ ہم سب کے قلب حزیں اور چشم نم سے تعزیت کے مستحق ہیں بلکہ ان کے لیے گلشن طب کا ہر گل نوحہ خواں اور ہر عندلیب ماتم کناں ہے:ـــ

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگ گل پر آب
اے عندلیب، وقتِ وداع بہار ہے
آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

آپ کی رحلت سے علمی مجالس کی رونق وبہار اجڑ گئی، عندلیبان طب کا ملجا وماوانہ رہا، عصر حاضر کی طبی تحقیق کے افق کا وہ خورشیدِ ضیابار، جس کی ضوبار شعاؤں نے علم تحقیق کی راست سمت ہی نہیں متعین کی بلکہ اس کو نئے زاویے اور بلندیاں عطا کیں، جس کی مساعئ جمیلہ اور عبقریت سے طب کے تحقیقی کشت زاروں میں بہار آگئی، غروب ہوگیا۔ اساتذۂ فن کی امیدوں کا مرکز، ماہرین فن وطلبہ کی علمی وتحقیقی سرگرمیوں وتشنگی کا چشمۂ حیواں، طبی تحقیق کا سالار کارواں، طب کے قافلہ کا حدی خواں، دوستوں کے دلوں کی دھڑکن یعنی کہ شمع انجمن، ہر دل تھا سودائی تیرا، تھا تیرے دم سے بانکپن۔ تیری جلوہ گاہ سے رونق تھی رعنائی بھی تھی، تیری فکرار جمند سے طب کی بزم آرائی تھی۔ـــ

ویراں ہے میکدہ خُم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

ان کی ذات والا صفات اخلاقی اقدار، وضع داری اور اعلیٰ ظرفی میں فقید المثال تھی، اخلاص ومروت اور صدق وصفا کا پیکر، خوش گفتار، باکردار، طب کا سرمایہ افتخار وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، ان کی شخصیت اس ہشت پہلو

☆اسسٹنٹ پروفیسر وصدر، شعبۂ علم الصیدلہ، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش۔ Mob.No:9897775146، E-mail:zaidnium@gmail.com۔

ہیرے کی مانند تھی جس کا ہر پہلو درخشاں و تابندہ ہوتا ہے اور قلب و دماغ کو متأثر کرتا ہے اور نظر کے لیے خیرہ کن ہوتا ہے۔ ان کا ذکر اور ان کی یاد اساتذہ وطلبہ اور ہم نشینوں کے دلوں میں تاحیات آباد رہے گی: ؎

تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں

علمی و تحقیقی سرگرمیوں میں طلبہ کی رہنمائی اور معاونت، ہمہ وقت ان کی علمی و فنی ترقی کے لیے فکرمند رہنا اور ان کے تحقیقی مشاغل اور جادہ پیمائی میں خود ان کے ہمراہ رہ نوردِ شوق بن کر ان کے مسائل کی عقدہ کشائی کرنا اور گراں قدر علمی تعاون کرنا ان کا جذبۂ جنوں تھا۔ ایک موقع پر راقم سطور سے فرمایا، مولانا! زندگی میں کچھ اور خواہش نہیں بس یہ تمنا ہے کہ ایک بہترین لیب ہو جس میں معیاری ریسرچ و تحقیق کا کام ہو۔ آپ کا وجود بامسعود شیدائیان طب اور طلبہ کے علمی و تحقیقی مسائل اور ریسرچ کے عقدہ لاینحل اور مسائل سے نبرد آزما اہل فن کے لیے باعث طمانیت تھا: ؎

جس بزم میں ساغر ہو نہ صہبا ہو نہ خم ہو
رندوں کو تسلی ہے کہ اس بزم میں تم ہو

الحمدللہ بطور تحدیث نعمت عرض کرتا ہوں کہ ملک کے مقتدر اداروں میں نامور اساتذہ کرام سے استفادہ کا موقع میسر آیا، بعض ایسی شخصیات کو بھی بچشم خود دیکھا اور کسی قدر فیض اٹھایا جو اپنے علم وفن میں یکتائے زمانہ تھے، کوئی ان کا ہمسر نہ تھا لیکن خودنمائی و خودستائی سے دور، زندگی تقویٰ و عزیمت سے معمور، خودداری و تواضع کا پیکر، جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کی زندگی رشک ملائک ہے لیکن مجھے اس کا بھی ادراک ہے کہ مذکورہ اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ بڑی ریاضت و مجاہدہ کے بعد جزو زندگی بنتے ہیں۔ مگر بعض شخصیات پر اللہ کا خصوصی فضل ہوتا ہے اور یہ خصوصیات ان میں وہبی ہوتی ہیں یا بالفاظ دیگر خالق کائنات کی طرف سے بفضلہٖ ودیعت کی جاتی ہے۔

استاذ محترم کی یگانہ روزگار شخصیت بھی اسی انفرادیت کی حامل تھی، خودنمائی اور خود پسندی اور نمود و نمائش کے اس دور میں، جہاں اہل علم وفضل بھی ان اثرات سے محفوظ نہیں، وہ ایثار، سادگی، خلوص کا پیکر، نمود و نمائش سے حد درجہ دور، شہرت اور ناموری کے ہتھکنڈوں سے نالاں حتیٰ کہ بسا اوقات ان تحقیقی مقالات اور دیگر علمی کاموں سے جن میں ان کا خاطر خواہ حصہ ہوتا تحکماً اپنا نام حذف کروا دیتے۔ کتنی ہی ادارتی تحریریں، تعارفی کلمات، تحقیقی مقالات جو دوسرے حضرات کے نام سے شائع شدہ ہیں درحقیقت استاذ محترم کے رہینِ منت ہیں، وہ ان علمی کاموں کو بڑی خوش دلی وانہماک سے انجام دیتے، ان کی یہ عنایت ہر خاص وعام کے لیے بلا اختلاف رنگ ونسل یکساں تھی۔ ایک موقعہ پر حاضری ہوئی تو ایک بھاری بھرکم شخصیت جلوہ گر تھی، گفتگو سے اندازہ ہوا کہ موصوف کسی ادارے سے وابستہ ہیں اور کچھ تحقیقی مقالات کی تصنیف میں استاذ محترم کی معاونت کے خواہاں ہیں۔ ایسے بے شمار افراد خواہ وہ اساتذۂ فن ہوں یا نوآموز طلبہ جوق در جوق جلوہ افروز یا حاضر خدمت ہوتے اور علم کے اس چشمۂ حیواں سے اپنے ظرف کے بقدر سیراب ہوتے۔ ان کی حیثیت اس طبی دنیا میں ایک چلتی پھرتی لائبریری کی سی تھی جو سب کے علمی و تحقیقی مسائل کے لیے ہمہ وقت کوشاں و دستیاب رہتی۔ کسی کو علمی مصادر و مراجع کی جستجو ہوتی یا کوئی کسی دوا کا متلاشی ہوتا، کہیں کسی لفظ کی تحقیق کا مخاصمہ ہوتا یا ریسرچ ڈیزائن یا تحقیق کے جدید رجحان یا قدیم زاویوں کی باہمی تطبیق کی کاوش ہوتی، طلبہ کو اپنے ریسرچ کے موضوع کے انتخاب کا مرحلہ ہوتا ہر فرد بے تکلف حاضر ہوتا، فون، میل یا دیگر ذرائع سے رابطہ کرتا اور مذکورہ مسائل کا فی الفور حل میسر پاتا۔ آپ کا قلم گوہر بار جس موضوع پر بھی خامہ فرسائی کرتا علم وفن کے موتی اور جواہر پارے بکھیرتا نتیجتاً ایک علمی شاہکار وجود میں آجاتا حتیٰ کہ اساطین فن نے بعض تحریروں پر نظر ثانی کرتے وقت برجستہ توصیفی جملوں سے نوازا اور یہ بھی فرمایا کہ کاش یہ تحریر میری ہوتی: ع

غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

آپ خداداد صلاحیت کے حامل تھے آپ کا علمی ذوق صرف طب کے مضامین کی تدریس، گراں قدر تحقیقی مقالات کی تصنیف ہی نہ تھا بلکہ آپ اس امر

کے خواہاں تھے کہ طبی تحقیقات کے اصول وضوابط، طب کی جامعیت، اس کے فلسفہ اور معروضیت کے تابع ہو، نہ کہ ریسرچ اور تجدید کے نام پر صرف ایلوپیتھی سے تطبیق اور کورانہ تقلید ہو، اس معاملہ میں انتہائی حساس، دور اندیش اور بلند پایہ افکار ونظریہ کے حامل تھے۔ بعض بہت اعلیٰ تحقیقی اداروں، جامعات اور کمیٹی کے ممبران میں کلیدی اہمیت کے حامل تھے۔ آپ کے قیمتی مشوروں اور آراء کو ارباب حل وعقد انتہائی توجہ سے سنتے اور ان کی سفارشات کو نافذ کرتے چنانچہ ایک موقعہ پر ایسی ہی کسی میٹنگ کی روداد سناتے ہوئے راقم سطور سے فرمایا، مولانا! اس میٹنگ میں میں نے جب اپنا نقطہ نظر بیان کیا تو ایک صاحب (نام میں نے دانستہ حذف کردیا ہے) نے جن کا شمار اساطین طب میں ہوتا ہے اور وہ استاذ الاساتذہ ہیں اور طب میں مرجع خلائق ہیں اور ان کی علمی حیثیت مستحکم ہے، مجھے مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ نے اس خوبی سے مدلل انداز میں اپنا مطمح نظر بیان کیا کہ یکبارگی یہ جی چاہا کہ کاش آپ کا شاگرد ہوتا اور آپ سے مستفید ہوتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ بعض تحقیقی کاروائی کے پروٹوکول کو ایک عرصہ کے بعد آپ کی رائے کے مطابق تبدیل کیا گیا اور آپ سے استصواب رائے تک اس کو زیر التواء رکھا گیا۔ آپ علم کا ایک بحر ناپیدا کنار تھے، لیکچر ہو، ٹریننگ پروگرام ہو، شرکاء آپ کے علم کی گہرائی وگیرائی سے متاثر ہوتے۔ آپ جب بھی کسی انٹرویو میں بطور امیدوار شریک ہوئے آپ کی ستائش ہوئی، پروفیسرشپ کے انٹرویو میں وائس چانسلر ضمیر الدین شاہ صاحب نے ان الفاظ سے سراہا "The last one is the best one" سر نے مجھے بتایا کہ بعض ممبران نے بذریعہ فون انھیں داد تحسین سے نوازا۔

جس موضوع پر بھی گل افشانی کرتے بالاستیعاب گفتگو کرتے جو تمام پہلوؤں کو محیط ہوتی، خواہ وہ موضوع طب سے متعلق ہوتا یا دیگر علمی موضوعات پر اظہار خیال کرتے مثلاً سیاست، معاشیات، اقتصادیات، تاریخ اور ادب وغیرہ اور ان علوم ومعارف میں اگر کوئی عقدہ لاینحل ہوتا تو عقدہ کشائی کے لیے کسی ماہر فن سے براہ راست رابطہ کرتے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے تاریخ کے کسی ایسے ہی مسئلہ میں انھوں نے معروف مؤرخ پروفیسر عرفان حبیب صاحب سے باقاعدہ وقت لے کر ملاقات کی تھی اور اس الجھن کو رفع کیا تھا۔ مذہبی امور اور احکام میں بہت منطقی استدلال ومعتدل نظریہ رکھتے تھے، بعض موقعہ پر ہم طلبہ سے بے تکلف بحث کرتے، ہم لوگوں کی رائے کبھی ان کے بالکل مخالف ہوتی تو جواباً مسکراتے ہوئے فرماتے مولانا! اس کی دلیل لے کر آیئے۔ کبھی اختتام پر یوں گویا ہوتے مولانا! آج بہت عمدہ نشست رہی۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر ان کے ایک بے تکلف دوست نے دو خواتین کی گواہی کو ایک مرد کے قائم مقام ہونے پر کچھ سوالیہ نشان قائم کیا تو استاذ محترم نے اس کا ایسا مسکت اور منطقی جواب دیا جس پر میں بے اختیار عش عش کر اٹھا۔

آپ کی ذہانت وفطانت قابل رشک تھی، شاید کم لوگوں کے علم میں ہوگا کہ جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد آپ نے بی اے اکونومکس میں داخلہ لیا تو بعض افراد کو تشویش ہوئی کہ مبادا یہ مرحلہ ان کے حق میں آزمائش ثابت ہو تو بعض خیر خواہان نے ایڈمیشن نہ لینے کی ہدایت کی لیکن اس کے برعکس جب موجودہ ڈین کے پاس اوارڈ لسٹ آئی تو آپ کے حاصل شدہ نمبرات دیکھ کر انھوں نے حیرانی کا اظہار کیا اور آپ کی کاپی ڈین آفس طلب کی۔

لیبارٹری ٹیکنیک ہو یا تجرباتی علم الادویہ کے اعمال ان میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ بلا کی قوت فہم اور استدراک کے حامل تھے، ایک موقعہ پر دوران گفتگو مجھے بتایا کہ انٹرن شپ میں جس سرجن کے زیر نگرانی تھے وہ کسی آپریشن میں مصروف تھے، اسی اثناء ایک حادثہ میں زخمی مریض کی آمد کی اطلاع آئی، وہ اپنی مشغولیت کے باعث اسے فوری طور پر اٹینڈ کرنے سے قاصر تھے، انھوں نے استاذ محترم کو اس سلسلہ میں کچھ ہدایات دیں اور کہا کہ اس کیس میں دوران خون کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے Saphenous Vein کو قطع کرنا ہوگا، آپ مریض کے پاس رہیں میں سرجری مکمل کر کے آرہا ہوں۔ فراغت کے بعد جب وہ اس مریض کے پاس پہنچے تو ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ اس دقیق پروسیجر کو سرجن کی صرف زبانی ہدایت پر آپ نے بخوبی انجام دے دیا تھا۔ اس قسم کے

واقعات اس قدر ہیں کہ ان کو احاطۂ تحریر میں لانا دشوار ہے، مزید براں مضمون کی طوالت کا بھی اندیشہ ہے، یہ تو بطور مشتے نمونہ از خروارے ذکر کر دیا۔

طالع آزمائی اور خودنمائی کے اس دور میں جہاں خود بینی، خودرائی اور خود پسندی کا دور دورہ ہے وہ اپنے کمالات، اعزازات اور شخصیت کو آشکارہ نہ ہونے دیتے، حتی الامکان اس کو مخفی رکھتے۔ ایک موقع پر راقم سطور سے فرمایا مولانا! کل دہلی جا رہا ہوں اگر آپ ساتھ چلنا چاہیں تو چلیں، میں نے حامی بھر لی اور ہم دوسرے دن روانہ ہوئے، راستہ بھر مختلف موضوعات پر دلچسپ گفتگو ہوتی رہی، دہلی میں میں اپنے مستقر پر اتر گیا اور اسی دن شام میں میری واپسی بھی ہوگئی، ابھی میں علی گڑھ پہنچا ہی تھا کہ میرے پاس محمد عمران، جو ایم ڈی میں میرے رفیق درس تھے اور اس وقت غالباً ہمدرد میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے، ان کا فون آیا، علیک سلیک کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے میں یہاں ایمس کے آڈیٹوریم میں موجود ہوں اور سَر کو یہاں ینگ سائنٹسٹ کے ایوارڈ سے نوازا جا رہا ہے، میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ میں تو سفر میں ساتھ تھا، دنیا جہاں کی گفتگو ہوئی لیکن سر نے مجھے اس ایوارڈ کی بھنک بھی نہ لگنے دی۔ کسی موقعہ پر ان کے صاحبزادہ فارض صاحب نے دوران گفتگو بتایا کہ انھیں جو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ملا وہ بھی اسی طرح اخبار میں لپٹا ایک کونے میں پڑا ہے، ابا نے اسے کبھی لائقِ اعتناء نہیں جانا کہ کہیں آویزاں کروا دیتے یا کم از کم اسے کھول کر دیکھ لیتے۔

استاذ محترم کی شخصیت اس قدر متنوع اور کثیر الجہات تھی اور مختلف موضوعات پر ایسی دسترس اور گرفت تھی کہ جب کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو خیالات کے تسلسل، ربط باہمی، الفاظ کے انتخاب اور انداز گفتگو سے سامعین پر ساحرانہ کیفیت طاری ہو جاتی، کیا اساتذہ اور کیا طلبہ سبھی مسرور و مسحور ہو جاتے۔ میں نے کسی موقعہ پر ان سے دریافت کیا کہ بعض لوگوں کی گفتگو میں کوئی ندرت یا مزید علمی گہر باریاں نہیں ہوتی اس کی کیا وجہ ہے۔ ارشاد فرمایا، مولانا! مستقل اور مسلسل مطالعہ کرنا چاہیے اس سے خیالات اور علم میں تازگی برقرار رہتی ہے، ورنہ فرسودگی در آتی ہے۔ ہم لوگ جب این آئی یو ایم میں زیر تعلیم تھے تو استاذ محترم کو ڈپٹی ڈائریکٹر کی اضافی ذمہ داری تفویض ہوئی، اس ذمہ داری کو جس احسن انداز سے نبھایا وہ ان کے حسن انتظام اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا لیکن وہ اس اضافی ذمہ داری سے نالاں تھے اس بابت مجھ سے فرمایا، مولانا! یہ ذمہ داریاں علمی مشاغل اور انہماک میں مانع ہوتی ہیں، میں تقریباً آٹھ گھنٹہ (جہاں تک مجھے یاد ہے) مطالعہ کرتا ہوں میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں اس میں کمی برداشت نہیں کر سکتا۔ ان کے صاحبزادہ سے بھی معلوم ہوا کہ اکثر اوقات گھر کی بالائی منزل میں لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مشغول رہتے، متعینہ اوقات میں نیچے آتے۔ ایک موقعہ پر کوئی فیملی ان کے گھر ملاقات کی غرض سے حاضر ہوئی تو ان کی اہلیہ محترمہ نے از رہ مزاح فرمایا کہ ہمارے گھر میں اوپر ایک مہمان اور موجود ہیں بس ڈنر اور لنچ پر ملاقات ہوتی ہے۔

درس و تدریس ان کا جذبۂ جنوں تھا، کلاس جس کا وقفہ نسبتاً طویل ہوتا، پُر مغز، علمی عبقریت، موضوع کے قدیم و جدید مآخذ و مراجع اور جامعیت کا شاہکار ہوتی، کلاس کا ماحول انتہائی سنجیدہ ہوتا۔ یو جی کلاسز میں ان کا انداز تدریس قدرے مختلف تھا یا کَلِّمِ النَّاسَ علی قدرِ عقولھم کا مصداق تھا، لیکن ایم ڈی کے طلبہ ان کے علمی نکات، فن پر دسترس، زبان و بیان پر قدرت اور طرز تدریس سے مبہوت و متأثر ہو جاتے، ان کا طرز تدریس ایسا تھا کہ طلبہ اکتاہٹ کا شکار نہ ہوتے بلکہ ہشاش بشاش رہتے۔ ہمارے شعبہ میں ان کے ذمہ اصول تحقیق کی تدریس تفویض ہوئی، مجھے یاد ہے کہ جب کلاس ختم ہوئی جس کا دورانیہ تقریباً دو گھنٹہ پر محیط تھا، ایک طالب علم میرے سامنے سے گزرا میں نے دریافت کیا کس کی کلاس تھی اس نے جواب دیا غفران سر کی کلاس تھی، بہت شاندار کلاس ہوئی، مزہ آ گیا، مجھے اس بات کا صدمہ ہوا کہ میں نے کیوں کر یہ کلاس اٹینڈ نہ کی۔ این آئی یو ایم میں استاذ محترم جب کلاس لیتے تو شعبہ کے اساتذہ بھی کبھی کبھی استفادہ کی غرض سے شریک درس ہوتے۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر ہماری کلاس ہو رہی تھی، علم کا ایک سیل رواں تھا جو جاری و ساری تھا، اسی اثناء میں ڈائریکٹر آفس سے پیغام آیا کہ ڈائریکٹر صاحب یاد فرما رہے ہیں، استاذ محترم نے جواباً ارشاد فرمایا کہ ان سے عرض کر دو کہ میں ابھی

کلاس لے رہا ہوں لیکن شاید ڈائریکٹر آفس میں کوئی ہنگامی میٹنگ یا فوری ضرورت تھی، وہ شخص یکے بعد دیگرے تین دفعہ کلاس میں آیا لیکن ہر دفعہ سر کا یہی جواب تھا، استاذ محترم نے اطمینان سے کلاس لی، چلتے وقت ایک طائرانہ نظر ڈالی، مجھ سے دریافت کیا، مولانا! کچھ سمجھ میں آیا، میں نے سر ہلایا، جی سَر، مسکرائے، کہنے لگے مولانا! اس کا امتحان بھی ہوگا۔ شام میں ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا سر آپ کو ڈائریکٹر صاحب نے تین دفعہ بلایا لیکن آپ نے معذرت کر دی؟ بڑی متانت و سنجیدگی سے صرف اتنا فرمایا، مولانا! میں کلاس نہیں چھوڑ سکتا۔

مختلف پروگرامس بشمول سیمینار، کانفرنس، ورکشاپ، سی ایم ای وغیرہ میں مندوبین و شائقین آپ کے لیکچر کے متلاشی و مشتاق رہتے۔ ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں جس میں مَیں بھی شریک تھا، آپ کے محاضرہ کو آیوش کے بعض چوٹی کے عہدیداران نے سند توصیف وستائش سے نوازا۔ ڈائریکٹر این آئی یو ایم نے سر کے علی گڑھ پہنچنے کے بعد فون کر کے مبارکباد دی اور کہا کہ میں نے آپ کے لیکچر کی ویڈیو ریکارڈنگ کو علاحدہ منگوا کر اطمینان سے سنا اور مزید توصیفی کلمات سے نوازا۔

ویسے تو استاذ محترم کی ذات والا صفات کا ہر پہلو تابناک تھا مگر اس میں اخلاقی پہلو بہت نمایاں تھا۔ آپ اپنے دوستوں، اساتذہ، طلبہ سب کے لیے فکرمند رہتے، ان کے پیش آمدہ مسائل کے لیے ہمہ وقت بہر طور تیار رہتے، ان کے اختیار میں نہ ہوتا تو اس کا کوئی عمدہ حل تجویز کرتے، بعض لوگ جن کی مالی حیثیت کمزور ہوتی ان کی اس انداز سے مدد کرتے کہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ میرا یہ ذاتی مشاہدہ تھا کہ لوگ علمی مسائل میں ہی نہیں بلکہ انتظامی، خانگی، معاشرتی ضروریات زندگی کے بارے میں بھی استاذ محترم سے مشورہ اور تعاون کی درخواست کرتے اور آپ مکمل سنجیدگی، ہمدردی، امانت و دلسوزی کے ساتھ ان کو اپنے مشورہ اور تعاون سے نوازتے، اس میں کسی رنگ و نسل، مذہب و مسلک، علاقائیت کی تخصیص نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک موقع پر برادران وطن میں سے کوئی صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر کی پوسٹ کے لیے درخواست دہندہ تھے لیکن ان کے فارم کی خانہ پری میں کچھ خامی رہ گئی تھی کہ وہ ریجیکٹ ہوسکتا تھا، انھوں نے آفس میں رابطہ کیا، کیس سر کے پاس آیا استاذ محترم نے انھیں انتہائی خیر خواہی سے سمجھایا کہ یہ خامی تو ہے لیکن اگر آپ ان چند امور کی خانہ پُری اور کروادیں اور اس کی اسناد وغیرہ بھجوادیں تو آپ کی امیدواری اس پوسٹ کے لیے قابل قبول ہوگی۔ وہ صاحب انٹرویو میں تو شریک نہیں ہوئے، غالباً انھیں دہلی سے کوئی اور بہتر آفر مل گیا تھا، لیکن وہ استاذ محترم کے جذبۂ خیر خواہی سے اس قدر متأثر تھے کہ اکثر سَر سے بذریعہ فون رابطہ میں رہتے۔

سب کی احتیاج اور ضرورت کا انتہائی خیال رکھتے اور جس کی جس انداز میں مدد کر سکتے دریغ نہ کرتے، ایک موقعہ پر مجھ سے فرمایا، مولانا! شیروانی کتنے میں بن جاتی ہے، میں نے عرض کیا، یہی کوئی پانچ ہزار، کیا آپ زیب تن کریں گے۔ مسکرائے اور ازرہ مزاح فرمایا، مولانا! اتنا مہنگا لباس اور ہم لوگ۔ دراصل امام صاحب کی شیروانی کافی پرانی ہوگئی ہے ارادہ ہے کہ ان کی ایک شیروانی بنوادوں۔ بعدازاں ان کو پانچ ہزار روپئے بھجوادیئے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے جہاں ان کی موجودہ رہائش ہے اس محلّہ کی مسجد کے امام صاحب سے راہ چلتے ملاقات ہوگئی استاذ محترم کا تذکرہ کرتے ہوئے جذباتی ہو گئے اور ان کی شان میں بلند الفاظ ارشاد فرمائے۔

نوٹ بندی کا سانحہ جس سے سبھی لوگ کم وبیش متأثر تھے، اس دوران سر کے ایک شاگرد کے یہاں ولادت ہوئی، استاذ محترم بذات خود عیادت کے لیے میٹرنٹی سینٹر تشریف لے گئے اور ایک خطیر رقم بہ صراران کے حوالے کی، جو ہاسپٹل کے اخراجات کے لیے کافی تھی۔

تمھیں کہتا ہے مردہ کون، تم زندوں کے زندہ ہو
تمھاری نیکیاں زندہ، تمھاری خوبیاں باقی

اخلاقی وضع داری، معاشرتی اقدار و روایات کی پاسداری، بڑوں کی عزت و تکریم اور خوردنوازی میں عدیم المثال تھے۔ ہر ایک کی غمخواری، خیر خواہی مواسات و ہمدردی گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ انھیں بیرون ملک جانے کے بھی بعض مواقع میسر آئے لیکن انھوں نے اپنے والد محترم کی بیماری کے

باعث اس جانب قطعاً توجہ نہ کی۔ اپنے اساتذہ اور اکابرین کا غایت درجہ احترام کرتے، اگر کسی استاذ کی آمد ان کے چیمبر میں ہوتی تو ان کو بہ صرار اپنی کرسی پیش کرتے اور ان کے سامنے بالکل طالب علم کی طرح مؤدب بیٹھتے۔ میرے ایک دوست کا جملہ میرے ذہن میں آج بھی بازگشت کرتا ہے کہ استاذ محترم سے ہم نے صرف علم ہی نہیں سیکھا بلکہ ان کی مثالی شخصیت اور انداز تربیت سے زندگی گذارنے کا شعور اور سلیقہ بھی ہمارے اندر پیدا ہوا۔ اپنے طلبہ سے انھیں خصوصی لگاؤ تھا، ان کی حوصلہ افزائی کرتے، ان کے بہتر مستقبل کے لیے فکرمند رہتے۔ کسی علمی استفسار پر ان کی آنکھوں میں چمک سی آجاتی، پھر کیا سفر، کیا حضر، کیا ویٹنگ لاؤنج یا بزم طرب، علم کا ایک آبشار تھا جو رواں ہوجاتا اور طلبہ محو حیرت گوش برآواز رہتے۔ اکثر وہ ہر شئے سے بے نیاز کبھی آنکھوں پر عینک لگائے اور کبھی اسے پیشانی پر جمائے طلبہ کی تھیسس، پیپر، اساتذہ کے پروجیکٹ کو بغور ملاحظہ کرتے اور اس کی تصحیح وتصویب فرمارہے ہوتے۔ ویسے بڑے مرنجاں مرنج تھے، محفل ان کے دم سے زعفران زار ہوجاتی، لیکن تھیسس چیک کرتے ہوئے لہجہ میں ہلکی کرختگی، اخلاق میں سرد مہری اور آنکھوں میں بیگانگی اتر آتی۔ غلطی پر اس انداز سے تنبیہ کرتے کہ کسی کی عزت نفس مجروح نہ ہوتی۔ راقم سطور کی تھیسس انھوں نے دوران سفر بھی اسی شان سے ملاحظہ کی اور اس میں مناسب ترمیم اور اضافہ کیا۔ اسی طرح میں نے ایک سفر میں دیکھا کہ ایک فائل لیے ہوئے ہیں اور اس میں اصلاح وترمیم کا کام جاری ہے، ان کے ساتھ سفر کا میرا پہلا سابقہ تھا، میرے استفسار پر فرمایا، مولانا! یہ فلاں صاحب کا پروجیکٹ کا پروپوزل ہے، میں نے رکھ لیا کہ دوران سفر اس کو دیکھ لوں گا۔ راقم سطور جب ہمدرد میں تھا، کسی بھی مسئلہ سے دوچار ہوتا یا کسی رائٹ اپ کی تصحیح یا درستگی کی ضرورت ہوتی تو استاذ محترم اس کو علی الفور انجام دیتے۔ ایک موقعہ پر میں ہمدرد میں فیکلٹ فائنڈنگ کمیٹی کا ممبر تھا، رپورٹ تیار کرنے کی ذمہ داری میری تھی، میں نے رائٹ اپ تیار کیا، میری خواہش تھی کہ سر اس پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ مجھے اطمینان ہوجائے، حسن اتفاق مجھے ایک نکاح میں شرکت کرنا تھا اور سر بھی اس میں مدعو تھے، اسی موقع پر استاذ محترم نے ہوٹل کے ایک کمرے میں اس رائٹ اپ کو ملاحظہ کیا اور کچھ چیزیں حذف کرنے کی ہدایت دی اور اس کی نوک پلک درست کی۔

ان کی رحلت سے پیشتر میں اپنے ایک کلیگ کے ہمراہ حاضر خدمت ہوا، اپنے ساتھ ہوئی علمی خیانت سے کبیدہ خاطر وملول تھے، مجھ سے فرمایا، مولانا! اب یہ دنیا ہم لوگوں کے رہنے کے لائق نہیں۔ عالمی وبا کے دوران میں بھی متأثر تھا، علامات ظاہر ہوچکی تھیں، بذریعہ فون میری خیریت دریافت کی، میرے مزاج اور طبیعت کے لاأبالی پن سے واقف تھے، دوا اور دیگر امور سے متعلق تاکید فرماتے رہے۔

جیسا بھی ہوں اچھا ہوں برا ہوں کہ بھلا ہوں
ہاں چند قدم تیرے مگر ساتھ چلا ہوں

اھل البیت ادری بما فیہ اس مثل کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں ان کی رفیقۂ حیات کا صرف ایک جملہ نقل کرنے پہ اکتفاء کرتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنا اچھا، شائستہ اور مہذب انسان نہیں دیکھا: ع

عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے

موت ایک تلخ حقیقت ہے، کسی ذی روح کو اس سے مفر نہیں۔ کل نفس ذائقۃ الموت ہر ذی حیات کو اس عالم فانی سے حیات جاودانی کی طرف رحلت کرنا ہے، زندگی اور موت کا وقت مقرر ہے، جس میں ایک لمحہ کی تقدیم وتاخیر کی گنجائش نہیں، ہمارے پاس سوائے صبر کے کوئی چارہ کار نہیں اور مشیتِ ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم ہے کہ ان اللہ بصیر بالعباد، وہ قادر مطلق ہے، حکیم وخبیر ہے، ہماری مصلحتوں کو ہم سے بہتر جانتا ہے، مگر بحیثیت بشر، ہجر وفراق کا الم فطری ہے۔

خوشبو تیرے وجود کی شام وسحر میں ہے
فرقت کا تیری درد ابھی تک جگر میں ہے

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

جو نازش چمن تھا وہ مستانہ چل بسا

ڈاکٹر عبدالعزیز خان ☆

شہر علم وفن، جہاں سرسید کے ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر الماس و گہر منظر شہود پر آتے ہیں، جہاں خون جگر سے گلاب اگائے جاتے ہیں، جہاں خار وخس چنبیلی و نسترن کا روپ دھارتے ہیں۔ کون ہیں یہ فنکار جو سنگریزے تراشتے ہیں؟ کون ہیں یہ خامہ بردار جو ذہن و دل کو فکر وفن کے مراحل سے گذار کر مس خام کو کندن بناتے ہیں؟ یہ لوگ دراصل ہمارے قابل قدر و قابل احترام اساتذہ کرام ہیں جو حرف ولفظ کی روشنی سے بساطِ ظلمت پر علم وعمل کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ چناچہ ایسے ہی اساتذہ کرام میں محبوب ومکرم استاذ پروفیسر غفران احمد صاحب مرحوم کی ذات گرامی بھی تھی جن کی عبقری شخصیت سے فکر وتحقیق کی شعاعیں پھوٹتی تھی، جن کے ہر ہر عمل سے خلوص ومحبت، مہر ومروت اور دلنوازی کی ایسی خوشبو پھوٹتی تھی جس سے ان کے اطراف میں موجود ہر ذی نفس معطر رہتا۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

پروفیسر غفران صاحب کی شخصیت طبی دنیا میں ایک بلند و بالا روشن مینار کی سی تھی۔ آپ سے میری بیشمار یادیں اجمل خان طبیہ کالج اور این آئی یو ایم کی طالب علمانہ زندگی سے ہوتے ہوئے واپس اجمل خان طبیہ کالج تک وابستہ ہیں۔ آج بھی جب میں آپ سے ماضی کے تعلق کو کریدتا ہوں تو مجھے آپ کا بی یو ایم ایس فرسٹ پروف کی کلاس میں مسکراتے ہوئے داخل ہونا اور آپ کا وہ پہلا لیکچر بہت یاد آتا ہے۔ آپ کے درس وتدریس کا دلنشیں انداز دریا کی موجوں کی طرح رواں اور سبک رفتار تھا جو دل و دماغ پر وجد انگیز کیفیت طاری کر دیتا اور طلبہ کو محو کر دیتا۔ آپ کی معلومات اور ذہانت کا ہر کوئی اسیر تھا۔ آپ کے لیکچر کا ہر جملہ اس قدر سلاست بیان اور علمی شان سے پر ہوتا تھا کہ ہم سر دھنتے تھے اور ہر ایک کی کوشش یہ رہتی تھی کہ ان موتیوں کو صفحۂ قرطاس میں پرو لے۔ یہ کہاوت ہے کہ "First impression is the last impression"، لیکن میری ذاتی رائے یہ رہی ہے کہ Impressions are made over period of time۔ کسی شخص کا کسی دوسرے شخص پر یا سماج پر اس کا پہلا تأثر اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ اس کا کوئی دوسرا روپ سامنے نہ آیا ہو۔ پروفیسر غفران سر کے بارے میں یہ بات آپ کے تمام شاگرد جانتے ہیں کہ جس نے آپ کو جتنا قریب سے جانا اتنا ہی آپ کی قدر ومنزلت کا مداح ہوتا گیا، جو جتنا قریب آیا اتنا ہی دامن مہر وفا بھرتا گیا۔

میں نے اپنی دانست میں آج تک طبی دنیا میں صرف دو اشخاص کے بارے میں سنا اور جانا ہے کہ اگر آپ کو کسی طبی مسئلے کا حل تلاش کرنا ہے تو زانوئے تلمذ کہاں تہہ کریں۔ ایک پروفیسر غفران احمد صاحب مرحوم کی شخصیت تھی یا پھر یہ خوبیاں استاد محترم پروفیسر محمد ذوالکفل سر میں پائی جاتی ہیں، اطال اللہ بقائہ۔ اللہ رب العزت نے آپ کو بے شمار صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سی صلاحیت یا کون سی خوبی ان میں بڑھی ہوئی تھی۔ جس طرح آپ کو اپنے مضمون پہ دسترس حاصل تھی اسی طرح آپ تحقیق کے پیچیدہ مراحل سے بخوبی

☆ اسسٹنٹ پروفیسر (Stage-II)، شعبۂ تحفظی وسماجی طب، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش۔ E-mail:abdulaziznium@gmail.com، Mob.No:9768089350۔

واقف تھے۔ این آئی یو ایم میں جب تک آپ رہے تقریباً سارے ہی طلبہ اپنی تھیسس کی بائنڈنگ سے قبل اس کی نوک پلک آپ کے دست مبارک سے ہی درست کرواتے تھے۔

آپ ایک زندہ دل انسان تھے، اپنے دوستوں کے درمیان بے حد مقبول اور عزیز اور اپنے شاگردوں کے نزدیک نہایت ہی محترم اور معتبر۔ آپ کی انسان دوستی کا میں ہمیشہ قائل رہا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے بیشمار لوگوں کی زندگیوں میں رنگ بھرا۔ آپ اپنی نرم گفتاری کے لیے حلقۂ درس وتدریس میں مشہور تھے۔ میں نے آپ کو ہمیشہ میٹنگ کے دوران پُرمغز اور دلائل سے بھرپور گفتگو کرتے پایا، جس کے ساتھ زبان میں حد درجہ شائستگی اور نرمی ہوتی۔ آپ اگر کسی سے اختلاف رائے بھی رکھتے تھے تو اس کے اظہار کا انداز اتنا مدلل اور عمدہ ہوتا کہ سامنے والا گرویدہ ہوکر رہ جاتا تھا۔

میں نے آپ کو ہمیشہ زندگی سے بھرپور پایا، میں نے بارہا آپ کے چیمبر میں ایسے چہرے دیکھے ہیں جن کے بارے میں اگر میں پوچھتا تو آپ بس مسکرا کر رہ جاتے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ آپ کس طرح اپنے دوستوں کی مدد کرتے تھے۔ آپ کی طبیعت باذوق اور لطیف طنز ومزاح سے معمور تھی، آپ بہت ہی نرم گفتاری سے اور آہستگی سے کوئی جملہ کہتے جس کو سوچ کر دل بار بار مسکرا اٹھتا۔ آپ نے ہمیشہ اپنے طلبہ کو طب کی تعلیم وتحقیق کے ساتھ ایک حساس اور دردمند انسان بننے کی تربیت دی اور سماج کے مسائل اور اس کے کرب کو سنجیدگی سے سمجھنے کی تلقین کی۔ میں اکثر آپ کے پاس مشورے کے لیے جایا کرتا تھا۔ آپ کی یہ خوبی تھی کہ آپ ہمیشہ سب سے پہلے میری رائے جاننے کی کوشش کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ ان کے شاگردوں کے اندر Critical thinking and Decision making کی صلاحیت میں نکھار آئے۔ پھر آپ کے مشورے میری رہنمائی کا سامان بنتے۔

یوں تو دنیا میں کوئی رہنے کے لیے نہیں آیا ہے لیکن آپ کا یوں چلے جانا بھی بڑا کھلتا ہے اور خاص طور سے اس وقت جب کہ طبی دنیا آپ کی طرف آس لگائے بیٹھی تھی۔ یوں تو لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں لیکن خلعت دوام ان کو ہی حاصل ہوتی ہے جو ستائش اور صلے سے بے پرواہو کر انسانیت کے لیے کچھ کر جاتے ہیں۔ آپ کی کمی ہمیشہ کھلتی رہے گی اور آپ کی یاد دلوں میں گردش کرتی رہے گی۔ اللہ آپ کو غریق رحمت کرے۔ آمین یارب العالمین!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆☆☆☆☆

تعزیتی پیغام

انا للہ وانا الیہ راجعون! بہت دکھ بھری خبر ہے، استاد مکرم کے سانحۂ ارتحال سے یونانی طب کا ایک درخشندہ باب بند ہوگیا۔ پروفیسر غفران صاحب کا انتقال ہم سب کے لیے بہت ہی افسوسناک اور باعث تکلیف ہے، شعبہ کا بہت بڑا نقصان ہے۔ اس غم میں ہم برابر کے شریک ہیں، خداوند کریم ان کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

(ڈاکٹر عبدالرؤف، صدر، شعبۂ علم الادویہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

ISSN:2454-4507

جو رُکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

ڈاکٹر ایس ایم فیصل اقبال☆

وبا کی لہروں میں کتنے نگینے روپوش ہوگئے اور سکون و قرار کی آماجگاہ کتنی ہستیاں خاک ہوگئیں۔ انھیں ہستیوں میں استاذ محترم پروفیسر غفران صاحب بھی تھے۔ ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء کی صبح وہ دلدوز خبر جس نے ذہن و دل کو شل کر دیا تھا، آج بھی اسے سوچ کر دل حزیں تڑپ اٹھتا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے کوئی چمن تھا جو اجڑ گیا، کوئی سائبان تھا جو چھن گیا، کوئی شجر سایہ دار تھا جو خزاں کی نذر ہوگیا، کوئی متاع عزیز تھی جو لٹ گئی۔ دل بے قرار کو قرار آتا ہے تو اس بات پر کہ یہی مشیت ایزدی تھی۔

چشم نمناک میں ایک تصویر ابھرتی ہے اور پردہ تصور پہ بے شمار مرقعے آویزاں ہوجاتے ہیں، ان کی شفقت و محبت کے یادگار لمحات، اخلاق و کردار کی بلندی کے نمونے، ان کے علمی تفوق و اعلیٰ ظرفی، وضع داری و انکساری، تحقیق و علم پروری اور بے لوث قربانیوں کی متحرک تصویریں گردش کرنے لگتی ہیں۔

استاذ محترم کی باوقار اور سنجیدہ شخصیت سے میری پہلی شناسائی تب ہوئی جب مجھے شہر طرب کی شہریت ملی اور وقار الملک ہال میرا مسکن قرار پایا۔ بی یو ایم ایس سال دوم میں آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کے لیکچر کا انداز نرالا تھا، دھیما اور رواں سا لہجہ ہم طلبہ کچھ سمجھ پاتے کچھ سر سے گزر جاتا، اردو اور انگریزی میں یکساں روانی تھی جیسے آبشار رواں ہو، طلبہ کو آزادی تھی وہ دوران لکچر کلاس میں آجاسکتے تھے، کبھی کوئی سوال پوچھتے ''کیوں اور کیسے'' ذہن میں ایک ہلچل سی ہوتی اور آپ جواب دیے بغیر رخصت ہوجاتے، جب راقم بالواسطہ شکایت کنندہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے افسوس ہے طلبہ اپنا معیار تعلیم بلند کرنے کی سعی و جدوجہد نہیں کرتے۔

وقت کا پنچھی محو پرواز رہا اور میں بنگلور پہنچ گیا۔ کچھ وقفے بعد استاذ محترم غفران صاحب بنگلور میں بحیثیت پروفیسر تشریف لائے، پھر کچھ دنوں کے بعد ہی انھیں ڈپٹی ڈائریکٹر کا اضافی چارج مل گیا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر کا اضافی چارج ملتے ہی استاذ محترم نے ذمہ داریوں کا بار گراں اپنے سر لے لیا۔ فرحت بخش ہوائیں ادارے کے در و دیوار سے اٹکھیلیاں کرنے لگی تھیں۔ ایک طرف انتظامی ذمہ داری کو انھوں نے بحسن و خوبی نبھایا تو دوسری طرف طلبہ سے بے پناہ شفقت و محبت، بڑا توازن تھا دونوں میں۔ ہم طلبہ کے ساتھ کھیل میں شریک ہوتے، ہمیں حوصلہ دیتے، لیکن کیا مجال کہ اصولی اور انتظامی چیزوں میں کوئی بے جا رعایت ہو، یعنی آہنی سختی اور ریشم سی نرمی دونوں موجود تھی آپ میں۔ ایسا شاندار ایڈمنسٹریشن میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا۔ اس دور کے طلبہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ ایک ایڈمنسٹریٹر بھی لوگوں کے دلوں پہ راج کرسکتا ہے شرط یہ ہے کہ وہ اسی طرح غیر معمولی صلاحیت، ذہانت اور متانت کا حامل ہو، طلبہ اور ادارے کی خیرخواہی، خدمت اور خلوص کے جذبے سے سرشار ہو۔ کچھ کر گزرنے کے لیے کوشاں ہو۔

یوں تو ایڈمنسٹریشن ماتحتوں کے اندر ذمہ دار کے تئیں کچھ دوریاں اور سوئے ظن پیدا کر دیتا ہے۔ شاید اس کی وجہ ماتحتوں کی شکستہ توقعات اور ذمہ دار پہ ذمہ داری کا پریشر ہوتا ہے، لیکن آپ کا ایڈمنسٹریشن ایسا تھا کہ اصولوں کی سختی بھی تھی اور طلبہ کے لیے شاخ گل کی سی لچک بھی، سارے بلبل چمن کے شاداں و فرحاں تھے۔

منصب، شہرت، عہدوں کے حصول کے بعد اگر فرد اپنی نگاہوں میں ہی اپنے آپ کو بہت بلند و بالا تصور کرنے لگے تو لوگوں کی نگاہوں میں اس کا وقار گھٹ جاتا ہے، لیکن اگر وہ اپنی نگاہوں میں خود کو کمتر جانے تو لوگوں کی نگاہوں میں اس کا

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ، آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی۔ Mob.No:9744436169، E-mail:smfaisaliqbalk16@gmail.com۔

مرتبہ بہت بلند ہوجاتا ہے۔اور یہ دعا بھی ہے کہ "الھم اجعلنی فی عینی صغیرا و فی اعین الناس کبیرا" ''یا اللہ مجھے میری نگاہوں میں چھوٹا کردے اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا کردے''۔یہی فروتنی دراصل عظمت کا معیار اور کسوٹی ہے۔بلند اخلاق، بلند پروازی، خلوص اور انکساری نے آپ کا مرتبہ بہت بڑھادیا تھا، انہیں وجوہات کی بنا پر آپ ایک کامیاب ایڈمنسٹریٹر رہے۔آپ مختصر بولتے لیکن گفتگو بلیغ، جامع اور گہری بصیرت سے پُر ہوتی، سمندر کا سا کیف تھا آپ کے اندر وسعتیں، خاموشیاں اور گہرائیاں لیے ہوئے۔

ڈپٹی ڈائریکٹر کی اضافی ذمہ داری کے باوجود لکچر کا وہی اعلیٰ معیار ہوتا، جنرل ڈسکشن اور پریزنٹیشن میں بھی موجود ہوتے اور آپ کا Conclusive Remark اتنا پُر قوت اور ذہنی سطح کو بلند کرنے والا ہوتا کہ طلبہ عش عش کر اٹھتے۔ یہی وقت تھا جب ان کو قریب سے دیکھنے اور استفادے کا موقع ملا۔دوران لیکچر وہ طلبہ کی علمی پیاس بجھاتے، انھیں علمی افق کی سیر کراتے، نئے نکات اس طرح پیش کرتے کہ فہم کو جلا ملتی، سوچنے اور سمجھنے کے نئے زاویے کھلتے، مضمون کے ان نکات کو جنھیں ہم نے درخور اعتنا نہ سمجھا تھا، اس کی اس طرح سائنٹفک توجیہ پیش کرتے کہ ذہن کے دریچے وا ہوجاتے۔ایک طرف سائنٹفک اپروچ دوسری طرف ادب میں بھی کمال حاصل تھا۔اردو اور انگریزی ادب کے شاہکار سے واقفیت رکھتے تھے، ادب اور سائنس اپنے پورے طمطراق کے ساتھ کسی ایک شخصیت میں موجود ہو اس کی مثال کم ملتی ہے۔عام احساس یہ ہے کہ ایک ادیب سائنس کی باریکیوں سے نابلد ہوتا ہے اور ایک سائنٹسٹ ادب کی لطافت سے ناآشنا ہوتا ہے، لیکن سر کی شخصیت ادب اور سائنس کا حسین امتزاج رکھتی تھی۔

شاگردان رشید ان سے اپنی اپنی وسعتِ دامانی کے بقدر جھولی بھرتے، کوئی اپنی علمی پیاس بجھاتا، کوئی اپنے مسئلے کا حل پوچھتا، کوئی مشورہ کا طلبگار رہتا، اور ہر شاگرد یہ سمجھتا کی شاید میں سب سے زیادہ سر سے قریب ہوں، یہی وہ عظیم ادا اور صفت ہے جس پہ قربان ہونے کو دل کرتا ہے۔

یوں تو مزاج میں سنجیدگی اور متانت غالب تھی لیکن جب بے تکلف ہوتے ''پھر دیکھئے انداز گل افشانیٔ گفتار'' اپنی بذلہ سنجی سے محفل کو باغ و بہار کردیتے۔ میرے کلاس فیلو ڈاکٹر شبیر احمد پرّے کی تھیسس کا ٹاپک قلب پہ سداب کی تاثیر سے متعلق تھا، ہم طلبہ اینمل ہاؤس کے لیب میں خرگوش کو قربان کرکے اس کے قلب پہ اسٹڈی کے لیے سر کی سرپرستی میں مجتمع تھے۔سر نے خرگوش کے سینے کو چاک کرکے دل تک رسائی حاصل کی ہی تھی کہ محترمہ نجیب میڈم نے خواہش ظاہر کی کہ آگے کی کارروائی ان کے ہاتھ سے انجام پائے۔سر نے انسٹرومنٹ ان کے ہاتھ میں تھما دیا، میڈم نے اپنا موبائل دوسری ٹیبل پہ رکھا، نشتر ہاتھ میں لیا اور قلب خرگوش کو اس کے بدن سے علیٰحدہ کرنے میں مصروف ہوگئیں، اسی اثنا میں محترمہ نجیب میڈم کا فون بجنے لگا، ان کے شوہر ڈاکٹر وقار صاحب کا فون تھا، سر نے بے ساختہ کسی طالب علم سے کہا کہ فون اٹھا کے کہہ دو کہ میڈم دل پہ نشتر چلا رہی ہیں، بس کیا تھا ایک جملے نے لیب کے اس خشک منظر کو گل وگلزار بنادیا۔

بحیثیت استاذ وہ ایک عدیم النظیر استاذ تھے، منفرد، محبوب اور ہردلعزیز، آپ خود بھی اپنے اساتذہ کرام کی بے حد تعظیم فرماتے۔آپ کے استاذ محترم پروفیسر کنور محمد یوسف امین صاحب، جن کا شمار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے موقر اساتذہ میں ہوتا ہے (اللہ تعالیٰ ان کی عمر صحت وعافیت کے ساتھ دراز فرمائے۔آمین!)، آپ دونوں میں احترام وشفقت کا بڑا بے مثال رشتہ تھا، پروفیسر غفران صاحب اپنے استاذ محترم سے فون پہ بھی گفتگو فرماتے تو احتراماً کھڑے ہوجاتے، یوں لگتا جیسے ان کے استاذ محترم سامنے موجود ہوں۔کتنا دلکش منظر ہے یہ، استاذ بھی اپنے شاگرد رشید سے بے پناہ شفقت فرماتے۔اس بات کا ذکر بطور خاص کرنا چاہوں گا جس سے استاذ مرحوم غفران صاحب کی تحریر کے ادبی معیار کا اندازہ قارئین کو ہوگا، پروفیسر یوسف امین صاحب نے مرحوم استاد کی کئی تحریروں کے بارے میں کہا کہ کاش! یہ میری تحریر ہوتی تو میں اس پہ فخر کرتا۔تصور کریں یہ کتنا بڑا اعزاز ہے ایک شاگرد کے لیے''.... یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔''

سی سی آر یو ایم نے اگر آپ کو Best teachers award اور Lifetime achievement award سے نوازا تھا تو استاذ محترم کی شخصیت نے ان ایوارڈس کے وقار میں اضافہ ہی کیا۔یوں تو ایوارڈس شخصیت کو بلند وبالا کرتے ہیں، لیکن بعض عظیم شخصیات ایوارڈس کے حسن اور تمکنت میں

چار چاند لگا دیتی ہیں۔ سر کی شخصیت ایسی ہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی انھیں کئی ایوارڈس سے نوازا گیا، حکیم احمد اشرف میموریل ایوارڈ، بیسٹ یونانی ریسرچ اسکالر ایوارڈ، آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (AIIMS) سے انسٹی ٹیوشنل ایوارڈ وغیرہ۔

آپ نے ریسرچ وتحقیق، طب اور طلبہ کے معیار کو کمال بلندی تک پہنچایا اور ہمیشہ اس کے لیے کوشاں رہے۔ ۱۰۰ر سے زائد آپ کے پیپرس موقر جرائد میں شائع ہوئے۔ تقریباً ۴۰ر تھیسس کے سپر وائزر اور کو سپر وائزر رہے۔ طبی دنیا ایسے عظیم شخص کی راہ جانے کب تک تکتی رہے گی۔

طلبہ کی فریشر پارٹی میں جب میں نے سر کو اسٹیج پر دعوت دی تو یہ اشعار سر کے لیے کہے تھے:

بیاں میں روانی، ادا، نغمگی　　چلی آبجو گنگناتی ہوئی
تخیل کے ہمراہ پاکیزگی　　لطافت، نفاست، ذکا، آگہی

ان کی شخصیت ان اشعار کی مصداق تھی۔ ایک طرف بلند نگاہی، بلند خیالی، بلند مزاجی تھی، تو دوسری طرف عاجزی، خاکساری اور متانت تھی۔ جب آپ نے بنگلور سے علی گڑھ کے لیے واپسی کا رخت سفر باندھنے کی تیاری کر لی تھی تو آپ نے الوداعی خطاب فرمایا تھا جس نے سامعین پر ایک سحر سا طاری کر دیا تھا، سوچتا ہوں کاش! اسے کسی نے ریکارڈ کر لیا ہوتا، الفاظ نہیں تھے، نگینے تھے نگینے، ادب کی حلاوت اور چاشنی میں گھلے ہوئے۔ پہلے تو کچھ طنز ومزاح تھا، کچھ ادبی لطیفے تھے، جس نے کچھ دبی دبی کچھ کھلی کھلی سی ہنسی فضا میں بکھیر دی تھی، پھر اچانک ادب نے سنجیدگی کا روپ دھار لیا، محفل میں سناٹا چھا گیا جیسے کوئی کچوکے لگا رہا ہو، منصب اور ذمہ داریاں یاد دلا رہا ہو، کہ اٹھو! فن اور انسانیت کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ۔ آپ نے انسٹی ٹیوٹ کے ان لوگوں کا بھی تذکرہ کیا جو کم مشاہرہ پہ اپنی عارضی خدمات ادارہ کو دے رہے تھے، ان کے ساتھ ہمدردی شفقت اور دست تعاون دراز کرنے کی التجا کی تھی۔ پھر لوگوں نے نم آنکھوں سے انھیں رخصت کیا اور اس طرح وہ علی گڑھ لوٹ آئے۔ پھر مدتوں آپ کی یادیں، تذکرے، کارنامے اور پیغامات ادارے میں بازگشت کرتے رہے کہ ''جانے والے تیرے قدموں کے نشاں باقی ہیں۔''

بنگلور کے بعد مجھے سیفیہ حمیدیہ طبیہ کالج، برہان پور میں شعبۂ علم الادویہ میں ڈاکٹر سہیل احمد صاحب (حال مقیم مظفر پور، صوفیہ یونانی میڈیکل کالج) کی سرپرستی اور استفادہ حاصل رہا (آپ حکیم طیب صاحب مرحوم کے شاگردان رشید چہار درویش میں شامل تھے، حکیم طیب صاحب نے اپنے چار شاگردوں کو چہار درویش کہا تھا)۔ آپ اکثر پروفیسر جلیس صاحب مرحوم اور استاذ محترم پروفیسر غفران صاحب مرحوم کا تذکرہ کرتے۔ طب کا کوئی مسئلہ درپیش ہوتا یا ادویہ سے متعلق کچھ پوچھنا ہوتا، آپ فوراً دو لوگوں کو فون کرتے پروفیسر عبدالودود صاحب اور پروفیسر غفران صاحب اور ان سے یہ بھی پوچھتے کہ آپ کی کتاب کی ولادت کب ہو رہی ہے پھر ایک ہنسی فضا میں بلند ہوتی۔ اللہ کرے سر کی کتاب جلد منظر عام پہ آجائے اور مزید نقب لگنے سے محفوظ رہے۔ استاد مرحوم کے علم وفن کے چشمہ صافی سے سیکڑوں شاگرد سیراب ہوئے اور اپنی علمی تشنگی مٹائی۔

کیرلا کی وہ اک حسین صبح تھی جب سر کی کال نے مجھے نیند سے بیدار کیا تھا، اس وقت وہ وطن واپسی کے لیے موریشس ہوائی اڈے پہ تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے طبی سفر کی مختصر روداد سنائی، وہاں کا کلچر، وہاں کی تہذیب کا تذکرہ کیا اور پھر یونانی طب سے متعلق ان لکچرس اور تعارف کا ذکر کیا جو وہاں کے ڈاکٹرس اور انٹلکچولس کے درمیان ہوئے۔

ان سے میری آخری ملاقات ۲۶ر فروری ۲۰۲۱ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی، آپ نے کالج کے احوال پوچھے اور پھر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کیا خبر تھی کہ آپ بہت جلد اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں گے اور اپنے بیشمار متعلقین ومحبین کو سوگوار کر جائیں گے۔

سیکڑوں شاگردوں کے دلوں میں جو آپ نے اپنا گھر بنایا تھا، رب ذوالجلال کی بے پایاں رحمتوں سے امید ہے اور دعا ہے کہ مولائے کریم انھیں ابدی اور شاندار گھر سے اور اپنی لازوال رحمتوں سے نوازے۔ آمین!

جور کے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم، تجھے یادگار بنا دیا

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی تقدمہ نگاری

ڈاکٹر محمد ارشد جمال ☆ ڈاکٹر ملک عترت ☆☆ ڈاکٹر عبدالعزیز فارس ☆☆☆ ڈاکٹر صادق علی ☆☆☆☆

پروفیسر غفران احمد مرحوم یونانی طب کے ایک انتہائی اہم اور نمایاں اسکالر تھے، ان کی شخصیت ہمہ گیریت کی اعلیٰ مثال تھی، وہ اپنی ذات میں ایک مکمل انجمن تھے، ان کی شخصی اور علمی زندگی متعدد جہات کی حامل تھی، ان کی ذات کا ہر گوشہ بہت روشن تھا، ان کی زندگی کا ہر زاویہ آبگینے کی طرح شفاف اور ہیرے کی کنی کی طرح چمکدار تھا۔ وہ علمی طور سے جس قدر بلند و بالا شان سے متصف تھے عملی طور پر بھی ان کے دامن میں ویسے ہی نگینے جڑے ہوئے تھے، صحیح معنوں میں وہ خلق عظیم کا پیکر بیش بہا تھے۔ علم و تحقیق سے لے کر اخلاق و کردار و معاملہ بندی تک ان کی پیشانی پر اتنے ستارے جھلملاتے ہیں جن کو شمار کیا جانا آسان نہیں۔ وہ ایک فاضل استاد ہونے کے ساتھ ساتھ، اعلیٰ محقق، بہترین تخلیق کار، کامیاب ترین منتظم، خوش گفتار مقرر اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ تخلیقی طور پر ان کا سب سے بڑا حوالہ یوں تو ادویہ جاتی و معالجاتی تحقیقات کی اشاعت سے جڑا ہوا ہے لیکن اس کے علاوہ ان سے دیگر طبی و ادبی حوالے بھی منسوب ہیں جن میں علم الادویہ، علم الصیدلہ، طبی و اسلامی تاریخ، عصری مسائل اور شخصیات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے تخلیقی معرکوں سے جڑا ہوا ایک اور پہلو اُن کا مقدماتی ادب ہے جو بظاہر اپنی کمیت میں انتہائی قلیل ہے لیکن کیفی اعتبار سے اتنا اہم ضرور ہے کہ اس پر الگ سرخی کے تحت روشنی ڈالنے کی حاجت محسوس کی جاتی ہے۔

مقدماتی ادب کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود تصانیف و تالیفات کی ہے۔ ابتدا سے ہی علوم وفنون کی تحقیق، تفہیم اور تعبیر و تشریح میں مقدماتی ادب نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ بظاہر یہ ادب کتاب میں اصل متن سے ماقبل فہم مطالب میں آسانی کی غرض سے شامل کی جانے والی تحریروں پر مشتمل ہوتا ہے جنھیں پیش لفظ، مقدمہ، تقریظ، دیباچہ، ابتدائیہ، تمہید، سرآغاز، آغاز، پیش نامہ، تعارف، پیش گفتار، پیش رس اور فلیپ وغیرہ سے مُعَوَن کیا جاتا ہے۔ حالانکہ بالا اصطلاحات تقریباً مترادف ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں چند امتیازی پہلو بھی ہوتے ہیں مثلاً پیش لفظ ہلکی پھلکی تعارفی قسم کی مختصر تحریر ہوتی ہے، دیباچہ پیش لفظ کے بالمقابل قدرے معلومات افزا اور سنجیدہ ہوتا ہے، جب کہ مقدمہ عام طور پر بھاری بھرکم اور علمی و تحقیقی اعتبار سے بے حد پُر مغز ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی صاحب علم مختصراً اپنی رائے دیتا ہے تو اسے کتاب کے گرد پوش کے اندرونی حصے پر درج کیا جاتا ہے جسے فلیپ کہتے ہیں۔ دیباچہ یا تعارف کتاب کی قدر و قیمت متعین کرنے میں مدد کرتے ہیں لیکن مقدمہ کہیں آگے بڑھ کر اس کی قدر و قیمت بھی متعین کرتا ہے اور قول فیصل بھی پیش کرتا ہے۔

مقدمہ اور تقریظ میں ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ مقدمہ کو صاحب کتاب بھی تحریر کر سکتا ہے لیکن تقریظ لازمی طور پر مصنف کے علاوہ کسی دیگر اہل رائے کی تحریر ہوتی ہے۔ بہرحال مقدماتی ادب میں شامل یہ تمام چیزیں کتاب کے اصل متن سے پہلے شامل کی جاتی ہیں۔ انھیں زمانی اعتبار سے سب سے آخر میں تحریر کیا جاتا ہے لیکن مکانی اعتبار سے مقدم رکھا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے کتاب کے وجود میں آنے کے پورے عمل کی گواہ ہوتی ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے توسط سے کتاب کے جملہ محاسن کی نشاندہی کی جائے اور اس کے مطالعہ کے لیے قاری کو راغب کیا جائے۔ اس سلسلے میں مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کی تحریر کا یہ اقتباس

☆ اسوشئیٹ پروفیسر، شعبۂ امراض جلد و تزئینیات، ☆☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ حفظی و سماجی طب، ☆☆☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ علاج بالتدبیر، ☆☆☆☆ اسوشئیٹ پروفیسر، شعبۂ ماہیت الامراض۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور، کرناٹک۔ ☆ مسئول مقالہ Mob.No:7767993333، E-mail:sarimnium@gmail.com۔

بہتر رہنمائی فراہم کرتا ہے:

''آپ جب کاروبار کے کسی ممتاز مرکز پر گزریں گے تو دیکھیں گے کہ دوکانوں کے سامنے کا ایک حصہ سلیقے اور دلفریب طریقے سے آراستہ سب سے اول دیدہ نواز ہوگا۔ یہ اپنی دلفریبی سے نگاہ کو اپنی جانب متوجہ کرے گا اور متوجہ ہونے پر جب نگاہ تفصیل کی جویا ہوگی تو وہ بتائے گا کہ آپ کو جو جنس دوکان میں ملے گی وہ کیا ہے۔ بعینہٖ یہی حال ایک کتاب کے مقدمے کا ہے کہ وہ آپ کو دل کش طریقے سے بتاتا ہے کہ کتاب میں کیا ہے۔''

مقدمہ نگاری بحیثیت ادب کس مقام پر متمکن ہے، اس کی با قاعدہ صنفی حیثیت ہے بھی یا نہیں یہ ایک الگ سوال ہے لیکن اس کے باوجود دنیا کی ہر اہم زبان میں تخلیق کی جانے والی کتابیں مقدماتی ادب کے احسان سے گراں بار ہیں۔ بعض کتابوں کے مقدمات تو شہرت کی ایسی بلندی پر فائز ہیں کہ ان کے اصل متن پردۂ خفا میں چلے گئے ہیں۔ کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ''مقدمہ ابن خلدون'' عمرانی علوم کے بانی ابن خلدون کی سات جلدوں پر مشتمل عربی کتاب'' کتاب العبر فی دیوان المبتدا والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عامرھم من ذوی السلطان الاکبر '' کا مقدمہ ہے۔ اسی طرح خواجہ الطاف حسین حالؔی کے دیوان کا مقدمہ ''مقدمہ شعر وشاعری'' بھی ایک ایسا تاریخ ساز کارنامہ ہے کہ اسے آج بھی اردو تنقید کے مرجع اول کی حیثیت حاصل ہے۔ جارج برنارڈ شا کے ڈراموں سے زیادہ اس کے مقدموں کو شہرت حاصل ہے۔ اردو ادب میں مولوی عبدالحق نے اتنے مقدمے تحریر کیے ہیں کہ انھیں با قاعدہ طور پر دو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

طبی ادبیات عالیہ پر تحریر کیے گئے مقدمے یوں تو اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے کم وقیع نہیں ہیں لیکن وہ اصل کتاب کے مقابلے زیادہ مشہور نہیں ہو سکے ہیں۔ اس ضمن میں شیخ کی 'القانون' کے انگریزی ترجمے پر گرونر کا لکھا ہوا مقدمہ اور ابوسہل مسیحی کا 'کتاب المأۃ' پر لکھا ہوا مقدمہ نیز اس طرح کی دیگر چند اور کتابوں کے مقدمے قابل ذکر ہیں۔ عصری یونانی طبی تاریخ میں مقدمہ نگاری کے حوالے سے سب بڑا نام پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب کا ہے جن کے ذریعہ تحریر کردہ مقدموں کی تعداد تیس سے زائد پہنچتی ہے جسے انھوں نے ''طبی تقدمے'' کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع کروایا ہے۔ اس کتاب میں شامل بیشتر مقدمے قابل قدر علمی وتحقیقی مواد کے حامل ہیں۔ علاوہ ازیں ''طبی تقدمے'' کے بعد شائع ہونے والی ان کی بعض دیگر کتابوں کی مقدماتی تحریریں بھی ایسی اعلیٰ ہیں جو اصل کتاب پر بھی بھاری نظر آتی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب کی مقدماتی عظمت کی نقرئی پرچھائیاں ان کے شاگرد پروفیسر غفران احمد مرحوم پر بھی سایہ فگن تھیں۔ حالانکہ استاذ محترم کی تقدمہ جاتی تحریریں تعداد میں اتنی کم ہیں کہ ان کی طرف مشکل سے توجہ مبذول ہوتی ہے لیکن ان کا مطالعہ اپنی فنی ثروت مندی کا ایسا خوبصورت بیانیہ پیش کرتا ہے جو قاری کو متأثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ مقدماتی ادب سے متعلق ان کی تحریریں اپنی پیش کش کے دلنشیں اسلوب، خوبصورت پیرایۂ بیان اور اعلیٰ لسانی قرینوں کے ساتھ ساتھ نہ صرف کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف پیش کرتی ہیں بلکہ کتاب کے مطالب میں بھی یک گونہ اضافے کا باعث ہوتی ہیں۔ راست نگاری کے سے انداز میں ضروری معلومات بہم پہنچاتے ہوئے غیر محسوس انداز میں قاری کو کتاب کی طرف راغب کرنے کا پروفیسر غفران احمد مرحوم کو جیسے ملکہ حاصل تھا۔ تقریظ یا مقدمے میں متن کے تعارف میں کن چیزوں کو اجاگر کرنا ہے، کسے خفی رکھنا ہے، کس چیز کی تفصیل پیش کرنی ہے، کہاں سے اجمالاً گزر جانا ہے، ان سب چیزوں سے وہ بخوبی آشنا تھے۔

کسی بھی کتاب کا مقدمہ نہ صرف کتاب کا آئینہ ہوتا ہے بلکہ وہ مصنف کے افکار ونظریات پر بھی روشنی ڈالتا ہے نیز اس سے تخلیق کی غرض وغایت بھی آشکار ہوتی ہے۔ اس میں متن کی لسانی خصوصیات، اس کے موضوع اور اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ موضوع سے متعلق خاص نکات کی تشریح اور عمومی حیثیت نہ رکھنے والے امور کی وضاحت بھی کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر مقدمہ کسی اور کا تحریر کردہ ہے تو مصنف کے بارے میں علمی دیانت داری کے ساتھ

ضروری اور ناگزیر نکات تک رسائی بھی مقدمہ نگار کی ذمہ داری میں شامل ہوتا ہے۔ پروفیسر غفران احمد مرحوم کی تقدمہ جاتی تحریریں ان تمام فرائض کی بخوبی انجام دہی پر کرتی نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر خالد مبشر نے اپنی کتاب ''مقدماتی ادب: تحقیق وتنقید'' میں مقدماتی تحریروں کی معنویت وافادیت کے ضمن میں اسے علمی، تاریخی، تحقیقی، تنقیدی اور لسانی طور پر پرکھے جانے کی بات کی ہے۔ یوں بھی کسی تحریر کا پہلا حوالہ اس کی علمی حیثیت ہوتی ہے جس کے تحت منطقی و استدلالی اسلوب اختیار کرتے ہوئے موضوع اور متن کی تشریح کی جاتی ہے۔ پروفیسر غفران احمد مرحوم نے اپنی کتاب ''اوصاف ادویہ: ضمانت سے محاسبہ تک'' کے پیش لفظ میں جس انداز سے کتاب کے مضمون اور اس کے مشتملات کی علمی حیثیت کو روشن کیا ہے وہ یقینی طور پر دیکھنے کی چیز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یونانی طب دواؤں کی معالجاتی افادیت طے کرتے وقت ان کے طبعی اور کیمیاوی اوصاف، 'اعمال تہذیب وترکیب ادویہ' اور تجربے اور مشاہدے کو کم وبیش یکساں حیثیت دیتی ہے لیکن تعیین قدر کے لیے حتمی فیصلے اکثر تجربے کی بنیاد پر ہوتے ہیں اور بعض امور ایسے بھی ہیں جن میں صرف تجربے کو ہی حَکَم کی حیثیت حاصل ہوتی ہے مثلاً ایسے صناعی مرکبات جن کے افعال ان کے اجزائے ترکیبی کے تابع نہیں ہوتے ہیں، تو ان کے افعال کا تعین صرف تجربے سے ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دوا کے طبعی و کیمیاوی اور ظاہری اوصاف دوا کے افعال کی تعیین میں نہ یہ کہ معاون ہوتے ہیں بلکہ بیشتر اوقات ان کی بنیاد پر افعال کے تئیں جو تخمینہ لگایا جاتا ہے وہ صحیح ثابت ہوتا ہے اور اسی کی بنیاد پر علاج و معالجے کا نظم چلتا ہے۔ اس اصولی تنظیم کے پیچھے یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ زمانہ قدیم میں اچھی، بے داغ اور آلودگی سے مبرا ادویہ کی فراوانی تھی اور یہ سہل الحصول تھیں۔ کاروبار اور صنعتی امور میں اتنی گراوٹ نہیں آئی تھی کہ دواؤں یا غذاؤں کی تجارت میں فریبِ حرفت کو مالی منفعت کا ذریعہ بنایا جائے اور غیر معیاری یا آلودہ ادویہ کو فروخت کیا جائے۔ لیکن فی زمانہ جب کہ معیاری ادویہ کی قلت ہے، ملاوٹ معمول صنعت ہوچکی ہے، اعمال دواسازی میں تشبہ اور کوتاہ راہی کی گنجائش پیدا کرلی گئی ہے لہٰذا اچھی ادویہ، مواد ادویہ اور مصنوعات کی دستیابی آسان نہیں ہے۔ ان حالات میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ دواؤں کے اوصاف کی ممکن حد تک جانچ پڑتال کی جائے تاکہ ان کے معیاری ہونے کی ضمانت دی جاسکے اور ان کو معالجے میں بے خوف استعمال کیا جاسکے۔''

مندرجہ بالا اقتباس جہاں لسانی طور پر بہت مضبوط و مستحکم بنیاد رکھتا ہے وہیں یہ اس پورے منظرنامے کو پیش کرنے میں بھی کامیاب ہے جس کے تحت اوصاف ادویہ کی ضمانت اور محاسبے پر متن فراہم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ علاوہ ازیں اس سے یونانی علاج ومعالجے میں تجربے ومشاہدے کی اہمیت کو بھی تقویت ملتی ہے۔ یہ تو محض ایک اقتباس ہے جس میں سہ رخی توضیح کے علاوہ مزید امکانات بھی موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکمل تحریر لازماً اور بھی اہم گوشوں کی طرف رہنمائی کرتی ہوگی۔ موضوع کی علمی حیثیت کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں ان کی ایک اور تحریر جو ڈاکٹر انتظار احمد و ڈاکٹر وسیم احمد کی کتاب ''سموم وتسمم'' میں بطور تقریظ شامل کی گئی ہے بطور خاص قابل ذکر ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی کچھ حصہ یہاں پیش کیا جائے:

''محفوظ معالجہ ہمیشہ انسانی ترجیحات میں شامل رہا ہے۔ ابتدائی عہد کے تجربات سے ہی غالباً انسانوں پر یہ حقیقت واضح ہوگئی تھی کہ وہ مادے جو دوائی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں ان میں مضرت پیدا کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے، لہٰذا ادویہ کے انتخاب کے وقت مضرت اور سمیت کا پہلو ہمیشہ اطباء ومعالجین کے پیش نظر رہا۔ یونانی طب میں دواؤں کی درجہ بندی اس بنیاد پر کی جاتی ہے کہ دوا کے افعال کی شدت کو متعین کیا جاسکے تاکہ مضرت کے پہلو کو مقدار خوراک یا دوا پر مختلف اعمال صیدلی کے ذریعہ اعتدال میں لایا جائے۔ جن ادویہ میں شدت زیادہ ہوتی ہے ان کو درجہ بندی میں تیسرے یا چوتھے مقام پر رکھا جاتا ہے یا ان کو سم مطلق تصور کیا جاتا ہے۔ کسی سمی مادے میں تین بنیادی اوصاف ہوتے ہیں۔ اول یہ

سریع التاثیر ہوتا ہے، دوم اس کا اثر حیاتی کیمیاوی نظام پر ہوتا ہے اور سوم اس کی قلیل مقدار سمیت پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ یونانی طب کی وہ ادویہ جن کا تعلق درجۂ چہارم سے ہے یا جو سم مطلق سمجھی جاتی ہیں، ان میں یہ اوصاف بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔''

مقدماتی ادب کی افادیت کو پرکھنے کا دوسرا زاویہ اس میں موجود تاریخی حوالوں کی موجودگی کو بتایا جاتا ہے جسے سیاسی، سماجی اور تہذیبی عناصر کی شمولیت مزید استحکام فراہم کرتی ہے۔ تاریخی حوالے بایں طور بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے ذریعہ علوم وفنون کے ارتقائی سفر کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے، نیز ان کے توسط سے عصری تناظر میں علوم وفنون کی اطلاقی حیثیت بھی واضح ہوتی ہے۔ ''سموم وتسمم'' پر لکھی گئی مرحوم کی تقریظ میں یہ پہلو بھی بہت شاندار انداز میں مرتسم ہوا ہے:

''اگرچہ یونانیوں کی قدیم دیومالائی تحریروں میں بھی زہروں کا تذکرہ ملتا ہے لیکن یونانی طب کے دیگر امور کی طرح سموم وتریاق کے ضمن میں بھی بقراط اولین قابل اعتماد مرجع ٹھہرتا ہے، جس نے زہریلی دواؤں کے استعمال کے تعلق سے ایسے اصول مرتب کیے، جو ان کی مقدار خوراک کی تعیین اور ان کے شرح انجذاب کی تقلیل میں معاون تھے۔ ان فنی امور کے ساتھ سمیات سے متعلق اخلاقی بیان بھی بقراط کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ جالینوس کی تعلیمات بھی سموم وتریاق کی تفہیم میں اہم مقام رکھتی ہیں، اس حوالے سے ایک اور اہم مرجع دیسقوریدوس ہے۔ یہی وہ پہلا یونانی طبیب ہے جس نے زہروں کو مختلف درجات میں تقسیم کیا اور ان کی شناخت کے تصویری خاکے وضع کیے۔ اس کے ذریعہ ترتیب دی گئی زہروں کی حیوانی، معدنی اور نباتی تقسیم سائنٹفک سوسائٹیز میں آج بھی قابل اعتبار سمجھی جاتی ہیں۔ قرون وسطیٰ کے آخری ایام تک بقراط و جالینوس کی تحریریں سند کا درجہ رکھتی تھیں اور ان کو اصولوں کی حیثیت دی جاتی رہی لیکن پیراسیلسس نے ان کے نظریات کی تردید کرتے ہوئے نت نئے تجربے کیے اور علم السموم کے باب میں اہم پیش رفت کی۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ علم السموم کے میدان میں ہونے والی عصری ترقیات میں پیراسلسس کا اہم کردار ہے، حالانکہ ان کا پیش کردہ اصول "The dose makes the poison" بقراط کے نظریات سے معصور معلوم ہوتا ہے۔''

اس سلسلے میں ایک دیگر اقتباس بھی ملاحظہ کریں:

''زہروں کے استعمال کی روایت اس وقت سے قائم ہے جب انسان نے ابھی لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا، کم وبیش پانچ الفیہ قبل مسیح سے اس کے تحریری حوالے ملتے ہیں۔ ایبرس پیاپرس میں متعدد زہریلے مادوں کا تذکرہ ملتا ہے مثلاً شوکران، بیش، افیون اور شیشہ وغیرہ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم سموم سے واقفیت اس عہد کے اطباء کو کسی حد تک ضرور تھی۔ ابتدائے طب کے کم وبیش سارے موضوعات چونکہ ایک ساتھ بیان ہوتے تھے اس لیے مستقل فن کے طور پر علم سموم رائج نہ تھا لیکن اس کے عملی نمونوں کا عندیہ ضرور ملتا ہے مثلاً قرون وسطیٰ میں ایک اہم پیش رفت یہ ہوئی کہ وہ امراض جو کسی پیشے سے وابستگی یا جائے کار کے مخصوص (مسموم) ماحول کی وجہ سے پیدا ہوتے تھے، ان کو مطالعہ کا موضوع بنایا گیا اور معالجے کے دائرے میں لایا گیا۔ حالیہ زمانے میں اکوپیشنل میڈیسن کا فروغ اسی دور کی یادگار ہے۔ پچھلی چند دہائیوں میں تجزیاتی مطالعے میں غیر معمولی پیش رفت ہوئی ہے۔ ایسے آلات اور مشینیں دستیاب ہیں جو کسی مردہ شخص کے بال کے ایک حصے کا تجزیاتی مطالعہ کرکے اس بات کا پتہ لگا سکتی ہیں کہ اس کی موت کس زہر سے ہوئی ہے۔ سائنسی ترقی نے علم سموم کے دائرۂ کار میں بہت وسعت پیدا کی ہے اور اس کو حد درجہ معروضی بنا دیا ہے۔''

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات میں تاریخی حقائق سے تطبیق دے کر جس تدریجی انداز سے سموم وتسمم کی اہمیت کو افہام وتفہیم کے مراحل سے گزارا گیا ہے اور اس کے لیے جو جداگانہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

عام طور پر مصنف کا خود کا تحریر کردہ پیش لفظ یا کسی دوسرے کے ذریعہ رواروی اور اختصار میں لکھا ہوا مقدمہ محض رسمی تعارف تک ہی محدود رہ جاتا ہے، اس میں کسی طرح کی تحقیق شامل حال نہیں ہو پاتی ہے جب کہ اصولوں کو بنیاد بنا کر

نقشِ قرطاس کی گئیں مقدماتی تحریریں جنھیں تعارفی سطح سے بالاتر ہوکر جزرسی اور دقتِ نظر کے ساتھ رقم کیا جاتا ہے وہ تحقیقی وتنقیدی بساط پر بھی رکھے جانے کی مجاز ہوتی ہیں۔ پروفیسر غفران احمد کی تحریروں سے دی گئی بالا مثالیں جہاں منقولہ حوالوں پر منطبق ہوتی ہیں وہیں ان میں موجود تحقیقی عناصر بھی اپنی چھب دکھانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

کتابوں میں شامل تعارفی تحریروں میں جہاں موضوع کی علمی حیثیت ثابت کرنے کے لیے تاریخی پس منظر پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہیں بعض اوقات ان میں شامل احوال وآثار بھی فن تاریخ کا نمونہ ثابت ہوتے ہیں جن کے تحت صاحب تذکرہ کی شخصیت، خاندانی حالات، سیرت، سوانح، وطن، سماجی صورت حال، شکل وشمائل اور مالی حالات وغیرہ کی چھان بین کی جاتی ہے۔ ان چیزوں کی ضرورت بالعموم اس وقت پیش آتی ہے جب متن کچھ دنوں تک روپوش ہوتا ہے اور اسے ایک نئی شکل دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جاوید احمد خان و ڈاکٹر شگفتہ نکہت کی کتاب ''مفردات مسیحائی'' جو علم الادویہ پر مبنی ایک فارسی مخطوطے کا اردو ترجمہ ہے، اس کی تقریظ میں پروفیسر غفران احمد مرحوم نے اجمالی طور پر اس پہلو کا بھی احاطہ کیا ہے۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی تقدمہ جاتی تحریروں کا ایک خاص اسلوب اس میں موجود تنقیدی رویہ اور ان کی صاف گوئی بھی ہے۔ وہ یونانی طبی ادب میں پائی جانے والی یکسانیت سے بہت نالاں تھے۔ چونکہ وہ عصری آگہی سے آشنا تھے اور اس کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنے کے مؤید بھی تھے اس لیے انھیں وابستگان طب کی غیر ضروری تقلیدی روش شدید تکلیف پہنچاتی تھی۔ بالخصوص انھیں متاخرین کی تخلیقات میں تحقیقی اجتہاد کی ناموجودگی بری طرح کھلتی تھی۔ وہ طبی اداروں میں صرف چند گنی چنی اور نامور کتابوں کی تدریس کے بھی خلاف تھے۔ انھیں لگتا تھا کہ اس کی وجہ سے بہت ساری اہم کتابوں تک لوگوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ اس سلسلے میں ''مفردات مسیحائی'' کی تقریظ کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''طب کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ اس کے حاملین نے ہر زمانے اور ہر علاقے میں اپنے تجربے، فہم اور وجدان کی روشنی میں دواؤں پر نئے تجربات کیے ہیں اور اپنے تجربات کو رقم بھی کیا ہے چنانچہ ادویہ کے سلسلے میں معلومات کا ایک ذخیرہ موجود ہے جن میں سے کچھ سے ہم فائدہ اٹھا سکے ہیں باقی اب بھی ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ بعض کتب ایسی ہیں جو زیور طبع سے آراستہ نہ ہونے کے سبب عام قاری تک نہیں پہنچ سکیں اور اپنے محتویات میں مفید معلومات کا عنصر رکھنے کے باوجود طالبان طب ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ طب کی بعض کتب جن کو امہات الکتب کا درجہ دیا جاتا ہے اور جو طبی نصاب کا جزو اعظم فراہم کرتی ہیں ان کی یہ خوبی ہے کہ انھوں نے طبی نظام تعلیم کا لائحۂ عمل متعین کرنے میں معاونت کی ہے۔ لیکن ان کے اثرات نظام تعلیم وتدریس پر اتنے گہرے ہیں کہ بعض دیگر مفید معلومات کے ذخائر کو بھی یہ موقع نہ مل سکا کہ وہ معروف ومروج دفتر معلومات میں اپنے لیے کوئی جگہ بنا پائیں۔ پھر بعد کے مصنفین اور مؤلفین نے امہات الکتب کی کلوننگ کر کے ان کے سلسلہ جنبانی کو اس قدر دراز کیا کہ اس انبوہ میں بعض اچھی کتابیں اور مفید مخطوطے گم ہو گئے۔ ایسی کتب اور خاص طور سے مخطوطات کی بازیابی، ان کے تراجم اور تدوین بھی طبی سرمائے کی بقاء اور ترقی وترویج کے لیے ضروری ہیں۔''

پروفیسر غفران احمد مرحوم سے وابستہ مقدماتی ادب اردو قالب کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی محیط ہے۔ وہ جہاں اردو کی زلفیں سنوارتے تھے وہیں انگریزی ادب کی اہمیت کے پیش نظر اس کے خاموں پر بھی مضبوط گرفت رکھتے تھے۔ انگریزی زبان وادب سے ان کا یہ تعلق لسانی سطح پر کافی مستحکم تھا۔ یوں تو وہ تحقیقی مقالات میں سائنٹفک اسلوب کو ترجیح دیتے تھے لیکن تعارف کی سطح پر اس زبان کی زرخیزی وشادابی سے فیض اٹھانے میں گریز نہیں کرتے تھے۔ حکیم وسیم احمد اعظمی کی کتاب پر لکھے ہوئے ان کے فلیپ کا درج ذیل اقتباس جس قدر شخصی تعارف کی جمالیات کا دلکش نمونہ نظر آتا ہے اسی کے بقدر اس میں زبان و بیان کی چاشنی بھی موجود ہے:

''Hakim Wasim Ahmad Azmi is a prolific writer who is continuously penning and producing fine pieces of meticulous writings for about four decades. At the moment, he is widely hailed as an iconic figure of literary research in Unani medicine and venerated for his high level of scholarship and vast and versatile erudition. He is a person of great and varied learning who has contributed enormously in the field of Unani medicine and also enriched the Urdu literature. Before pursuing a curriculum and subsequently a career in Unani medicine, he managed to master different languages, classical literature, and oriental studies that helped him to study the subject matter of Tibb with a broader outlook; his authoritative command on the subject reflects in his writings all over. He has set a unique style and standard of academic writing that is terse, laconic, and compendious but full of literary flavor that fascinates the readers and invites them to contemplate. The art of fabulous, flawless, and flowering writing gives him an edge over the contemporary writers."

جیسا کہ ابتداء میں بتایا گیا ہے کہ استاذ محترم پروفیسر غفران احمد ایک ہشت پہلوی شخصیت کے مالک تھے۔ان کی ذات کئی لحاظ سے قابل تقلید ہے۔ان کی علمی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔زیر نظر مضمون میں ان کی علمیت کے جس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ ایک کمیاب پہلو ہے۔امید تھی کہ فن کی اس چادر میں وہ اور بھی ستارے ٹانکتے۔لیکن افسوس کہ زندگی نے ان سے وفا نہ کی اور وہ عمر کے نصف النہار پر ہی مالک حقیقی سے جا ملے۔خدا سے دعا ہے کہ وہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔آمین!

مراجع ومصادر:

۱- مولانا حبیب الرحمان شیروانی۔مقدمہ مشمولہ ''مقدمات عبدالحق'' مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔لاہور:اردو مرکز؛۱۹۶۴ء۔

۲- گیان چند۔تحقیق کا فن۔لکھنؤ:اتر پردیش اردو اکادمی؛۱۹۹۰ء۔

۳- ڈاکٹر خالد مبشر۔مقدماتی ادب (تحقیق وتنقید)۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس؛۲۰۱۹ء۔

۴- پروفیسر سید ظل الرحمٰن۔طبی تقدمے۔علی گڑھ:شعبۂ علم الادویہ،اجمل خان طبیہ کالج،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی؛۲۰۰۰ء۔

۵- جاوید احمد خان، شگفتہ نکہت۔مفردات مسیحائی۔دیوبند:مسعود پبلشنگ ہاؤس؛۲۰۱۲ء۔

۶- انتظار احمد، وسیم احمد۔سموم وتسمم۔نئی دہلی:ہدایت پبلشرس اینڈ ڈسٹری بیوٹرس؛۲۰۱۹ء:۱۵-۱۹۔

۷- غفران احمد،سعود الظفر علی۔اوصاف ادویہ:ضمانت سے محاسبہ تک۔علی گڑھ:شریف پبلشنگ ہاؤس؛۲۰۱۵ء۔

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی

ڈاکٹر شمشاد عالم ☆

سبیل الموت غایۃ کل حی

فداعیہ لاھل الارض داع

ترجمہ: ''ہر جاندار کو موت کے راستے پر چلنا ہے، موت کا منادی اہل دنیا کو ندا دے رہا ہے۔''

ہماری زندگیاں اللہ تبارک وتعالیٰ کی امانت ہیں، ہمیں اپنے جان و مال، اعزہ واقارب اور اپنی حرز جاں شئے کے جدا یا فوت ہونے پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہ امر کلیۃً خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس روئے زمین پر پیدا ہونے والا ہر ذی روح ایک نہ ایک دن فنا ہونے والا ہے، فرق صرف اتنا ہے کسی کی ساعتِ رحلت پہلے آجاتی ہے اور کسی کو مزید کچھ دنوں کی مہلت مل جاتی ہے۔ لیکن بہر حال ایک دن اس دار فانی کو الوداع کہہ کر سب کو لوٹ کر اللہ کے پاس ہی جانا ہے۔ کل من علیھا فان و یبقیٰ وجہ ربك ذوالجلال والاکرام (سورۃ الرحمٰن-۲۶)

ابھی تک ہم لوگوں نے خطرناک وبائی امراض اور اس کے مہلک انجام کے بارے میں صرف اپنے آباء واجداد اور بزرگوں سے سنا تھا۔ اس سے براہ راست سابقہ یا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ بزرگوں سے سنتے آئے تھے کہ ایک زمانہ میں فلاں علاقہ میں طاعون پھیلا تھا جس کے مہلک اثرات سے گھر کے گھر، گاؤں کے گاؤں، شہر کے شہر حتیٰ کہ پوری کی پوری آبادی انسانوں سے خالی ہوگئی تھی۔ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہماری نسل نے بھی اس کا مشاہدہ کرلیا اور ایک نہایت لرزہ خیز وبائی مرض سے ہمارا سابقہ پڑا جسے جدید طبی اصطلاح میں سائنسدانوں نے کووڈ-۱۹ کے نام سے موسوم کیا۔ دنیا بھر میں کروڑوں کی تعداد میں لوگ اس جان لیوا وبائی مرض کی زد میں آئے اور لاکھوں افراد نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔

مادر وطن ہندستان میں جب کورونا نے اپنا رخ دکھانا شروع کیا تو خلق کثیر اس سے متاثر ہوئی، البتہ اول وہلہ میں گرچہ لاکھوں افراد اس وباء کی زد میں آئے لیکن اس نے اتنی شدت اختیار نہیں کی، تھوڑے بہت معمولی عوارض وعلامات کے بعد بیشتر افراد شفایاب ہوگئے۔ آہستہ آہستہ اس وبا کے اثرات زائل ہو رہے تھے اور یہ امید ہو چلی تھی کہ شاید اس وباء کا بدترین دور گزر چکا ہے کہ یکا یک وبائے عام نے بظاہر جاتے جاتے پلٹ کر شدید وار کیا اور ۲۰۲۱ء کے اوائل یعنی اپریل، مئی کے مہینے میں کورونا کی دوسری اور قیامت خیز لہر نے ہندستان کے طول وعرض میں صف ماتم بچھادی۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ عالمی وباء پھر سے پلٹ کر آجائے گی اور گھر کے گھر ویران ہوجائیں گے۔ دولت، عہدہ اور اقتدار سب بے وقعت و بے معنیٰ ہوجائیں گے، انسانی زندگی بے اعتبار ہوجائے گی اور انسانی معاشرہ کو وحشت ودہشت زدہ کردے گی، ہر طرف سراسیمگی اور موت کا رقص ہوگا، شہر ویرانی کا منظر پیش کریں گے، لوگ اپنے ہی اعزہ واقارب کے جسم خاکی لینے سے گریز کریں گے، میتوں کو غسل دینے اور ان کی نماز جنازہ پڑھنے سے بچیں گے، کفن دفن کا نظام درہم برہم ہوجائے گا، قبرستانوں اور شمشانوں کے دامن تنگ ہوجائیں گے۔ شاید ہی کوئی گھر بچا ہو جہاں اس وباء نے دستک نہ دی ہو۔ ہسپتالوں میں بستر کم پڑ گئے، آکسیجن کی قلت ہوگئی، لوگ خالی سلنڈر لے کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، گویا قیامت صغریٰ کا ماحول تھا، ہر سو نفسی نفسی کا عالم تھا جس کا ہماری چشم خود نے بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔

کورونا کی دوسری لہر نے تعلیم گاہوں اور یونیورسٹیوں کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ دہلی یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سیکڑوں

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش۔ E-mail:shamshadalig@gmail.com، Mob.No:9897172014۔

اساتذہ اور ملازمین اس وباء کی زد میں آئے اور راہیٔ ملک عدم ہوگئے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی اس کے قہر سے بچ نہ سکی اور چمنستانِ سرسید کے بہت سارے تدریسی وغیر تدریسی ملازمین کو اپنی زندگیوں سے محروم ہونا پڑا، جن میں سبکدوش اور کہنہ سال اساتذہ کے علاوہ ایک بڑی تعداد نوعمر اساتذہ کی بھی تھی۔وفات پانے والوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور یونیورسٹی کا ماحول سوگوار ہوگیا۔یونیورسٹی قبرستان جو کہ صرف یہاں کے طلبہ، اساتذہ، ملازمین اور ان کے اقرباء کے لیے مخصوص ہے اس وباء کے دوران بھر گیا اور ایک دن میں ۹۲/تدفین ہوئی۔راقم نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے اتنی بڑی تعداد میں تدفین نہیں دیکھی۔اسی پُرفتن دور میں طبی دنیا کی ایک ہونہار اور مایہ ناز شخصیت اور یونانی طب کے افق پر ضوفشاں شہاب ثاقب استادمحترم پروفیسر غفران احمد بھی اس مسموم وباء کا شکار ہوئے اور بالآخر ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء بمطابق ۱۷/رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ بروز جمعہ مختصر علالت کے دوران اس دارفانی سے ہمیشہ ہمیش کے لیے رخصت ہوگئے اور ہزاروں چاہنے والوں کو ایک داغ مفارقت دے گئے۔ان کی رحلت کا زخم ابھی بھی تازہ ہے جسے آسانی سے زمانہ مندمل نہیں کرسکتا اور نہ ہی آپ کی پُروقار اور بافیض شخصیت کو اتنی جلدی بھلایا جاسکتا ہے۔

آپ کی رحلت کی خبر سن کر ایک لمحہ واقعی ایسا محسوس ہوا جیسے سب کچھ ٹھہر سا گیا ہو، زمین پیروں تلے کھسک گئی، آپ سے محبت کرنے والا ہر شخص گویا یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔غیر یقینی اور بے چینی کے عالم میں لوگ ایک دوسرے سے تصدیق کرنے میں لگ گئے اور ساتھ ہی اضطرابی کیفیت کی حالت میں رب کائنات سے دعا گو بھی تھے کہ کاش! گوش زد خبر غلط ثابت ہو۔آپ کے ایک بہت ہی عزیز اور مشفق استاد کا تو حال یہ تھا کہ جب شعبہ کے ایک فرد نے انھیں اطلاعاً پروفیسر غفران صاحب کی رحلت کی خبر دی تو انھیں یقین ہی نہیں آیا اور انھوں نے بے حد غصہ کی حالت میں خبر دینے والے کو ہی نصیحت کر ڈالی کہ دیکھیے جب تک بالکل مصدقہ خبر نہ ہو آپ اس طرح کی خبر ہرگز نہ دیں، پہلے اچھی طرح سے اس کی تصدیق کر لیجیے۔مگر خبر تو سچ تھی! گرچہ یہ ہمارے لیے اچانک و ناگہانی اور ناقابل یقین تھی۔اللہ تعالیٰ نے اتنی ہی زیست ان کے لیے متعین کر رکھی تھی۔قضائے الٰہی کو ایک ساعت کے لیے بھی مقدم یا مؤخر نہیں کیا جاسکتا۔اس کے لیے عمر کی قید نہیں ہے، کیا بچہ کیا جوان اور کیا بوڑھا جب وقت موعود آجاتا ہے تو ہر حال میں دنیائے جاودانی کی طرف رخ کرنا ہی پڑتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ومنکم من یتوفیٰ و منکم من یرد الیٰ ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علمٍ شیئاً (سورۃ الحج۔۵) ترجمہ! ''اور تم میں سے کتنے تو اپنے بچپن یا جوانی میں مرجاتے ہیں اور کتنے ایسے ہوتے ہیں جو بڑھاپے کی نہایت خراب عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں کہ بہت کچھ جاننے کے بعد بالکل بے علم ہوجاتے ہیں۔'' کوئی شخص اپنی مدت حیات میں نہ کمی کرسکتا ہے اور نہ بیشی۔اس امر حقیقی کے باوجود کہ موت برحق ہے اس کا وقت اور مقام بھی متعین ہے، اللہ نے فطرتاً انسان کے اندر یہ چیز ودیعت کر رکھی ہے کہ وہ کسی ناگہانی خبر یا اپنے کسی عزیز کے اچانک فوت ہونے پر شدید حزن وغم اور رنج والم سے دوچار ہوتا ہے مگر بحیثیت مؤمن یہ ہمارا عقیدہ بھی ہے کہ یہ اللہ کا حکم تھا اور اللہ کا حکم نافذ ہوکر رہتا ہے بلکہ ہوچکا ہے اور ہم اس سے راضی ہیں۔

اس دل خراش اور متزلزل خبر سے طبی برادری کے علاوہ ملک اور بیرون ملک میں مقیم آپ کے شناسا اور محبین حد درجہ مغموم اور افسردہ تھے اور ہر طرف گویا رنج وغم اور افسردگی کا سماں تھا۔میرے پاس بھی آپ کے اساتذہ، احباب اور بہت سارے طلبہ ومتعلقین نے بغرض تصدیق فون کیا اور بلا مبالغہ ان میں سے بیشتر افراد اس خبر کی تاب نہ لاسکے اور بآواز بلند رونے لگے اور بہتوں کی تو سسکیاں بندھ گئیں کیونکہ آپ سے لوگوں کی وابستگی والہانہ، جذباتی اور صدق دل سے تھی، محض رسمی نہیں تھی۔آپ سے بہت سارے لوگوں کو بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ایسے لوگ بڑے بیش قیمت ہوتے ہیں، ان کا وجود سیکڑوں اور ہزاروں زندگیوں کا سہارا ہوتا ہے، ایسے اہم اور بیش قدر لوگوں کی دنیا سے رخصتی پر صرف اہل خانہ اور رشتہ داروں میں ہی ماتم نہیں ہوتا بلکہ ان کی موت پر پوری قوم روتی ہے۔آپ کا یک لخت دارفانی سے دار بقاء کی طرف کوچ کر جانا ہمارے لیے اس عربی شعر کے مصداق ہے:۔

فما کان قیس هلکه هلك واحد ولکنه بنیان قوم تهدما

ترجمہ:''آپ کی وفات صرف ایک فرد واحد کا رخصت ہوجانا نہیں ہے بلکہ اس ناگہانی خبر نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔''

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

ذاتی صفات

اس خاکدانِ گیتی میں کچھ ایسی شخصیات کا ظہور ہوتا ہے جن کا وجودِ مبارک آئندہ نسلوں کے لیے منارۂ نور ثابت ہوتا ہے، ان کی نگاہیں صرف اپنے دور کے نشیب وفراز کی زاویہ پیمائی نہیں ہوتیں بلکہ وہ روشن وتابناک مستقبل کی محرابِ فکر کے لیے بھی راست سمت کا تعین کرتی ہیں، وہ صرف اپنی مدتِ زیست میں ہی فصل گل کے نقیب نہیں ہوتے بلکہ وہ متاع عنادل کو آئندہ نسلوں کے لیے بھی خزاں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ایسی ہی کچھ صفات سے مزین شخصیت کا نام پروفیسر غفران احمد تھا۔آپ ۲۵؍دسمبر ۱۹۶۴ء کو ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ بلریا گنج سے متصل چھیہیں نامی گاؤں کے ایک علمی اور مذہبی خانوادہ میں پیدا ہوئے۔آپ چار بھائیوں (۱-منصور احمد، ۲-محمود احمد، ۳-عرفان احمد، ۴-غفران احمد) میں سب سے چھوٹے تھے۔آپ کی دو بہنیں ہیں جن میں ایک بہن آپ سے چھوٹی ہیں۔آپ نے ابتدائی تعلیم جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ سے حاصل کرنے کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ۱۹۸۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پہلے بی اے (معاشیات) میں داخلہ لیا۔پھر گریجویشن کی تکمیل کے بعد طب کی طرف رغبت ہوئی چنانچہ ۱۹۹۲ء میں بی یو ایم ایس اور پھر ۱۹۹۵ء میں ایم ڈی علم الادویہ کا کورس امتیازی نمبرات سے پاس کیا۔تکمیلِ تعلیم کے بعد مادرِ علمی نے آپ کی علمی وتحقیقی صلاحیتوں کے اعتراف میں تدریسی خدمات کے لیے آپ کا حسن انتخاب کرلیا۔اس طرح سے ۲۷؍جنوری ۱۹۹۷ء میں شعبۂ علم الادویہ میں آپ کا بحیثیت استاد تقرر عمل میں آیا۔

تعلیمی، تحقیقی وتصنیفی مصروفیات کے باوجود مرحوم انتہائی باوضع، بااخلاق، مرنجامرنج اور باغ وبہار شخصیت کے مالک تھے۔خوش مزاج، خوش لسان، خوش گفتار، خوش اخلاق، علم دوست، غمخوار اور تواضع وانکساری جیسے تمام عناصر کو یکجا کیا جائے تو استادِ محترم کا پیکر سامنے آتا ہے۔استادِ محترم کی شخصیت کے کچھ عناصر جیسے فرض شناسی، دوراندیشی، نظم وضبط، انسانی اقدار، باکمال طریقۂ تدریس، تحریری و تحقیقی لیاقت، انتظامی صلاحیت، طلبہ کی صحیح رہنمائی اور دینی، سماجی وفلاحی کاموں میں دلچسپی نے آپ کو ایک کرشماتی استاد اور اس سے بڑھ کر ایک عظیم انسان کا درجہ عطا کیا۔استادِ محترم کی زندگی میں فرض شناسی کا ایک اہم مقام تھا۔انسان کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں، ہر پہلو کے فرائض کی منصفانہ نشاندہی اور ان کی بحسن و خوبی ادائیگی ایک عظیم کارنامہ ہے۔آپ کی ایک بہت بڑی خوبی تھی کہ آپ تحقیق و تصنیف کے لیے جتنی محنت کرتے تھے اور جتنا وقت اس میں صرف کرتے تھے، اسی قدر اپنے فرض منصبی کا بھی خیال رکھتے تھے۔تدریسی فرائض کے معاملہ میں ہمیشہ پابند تھے۔دوراندیشی آپ کی شخصیت کا حصہ تھی، آپ ایک فکری انسان تھے، آپ کے ذہن میں منصوبوں کی ایک دنیا آباد تھی، خاص طور پر یونانی طب کے تعلیمی، تحقیقی اور معالجاتی امور سے متعلق اپنے ذہن میں بڑے منصوبے رکھتے تھے۔درس وتدریس اور تعلیم وتحقیق کے میدان میں آنے والے وقت میں کون سے نصاب کی ضرورت ہوگی، مزید اس میں کیا ترمیم کی جاسکتی ہے جس سے وہ طلبہ کے لیے مفید اور کارآمد ہوگا، اکثر اپنے ہم عصر رفقاء اور شاگردوں سے ذکر کیا کرتے تھے۔

استادِ محترم کی شخصیت گوناگوں صفات سے معمور تھی، ان کی مقبولیت کی خاص وجہ ان کے اندر پائی جانے والی انسانی اقدار تھیں جو ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں نمایاں طور پر نظر آتی تھیں۔آپ کے اندر موجود انسانی ہمدردی، سلیمیت، انسان دوستی اور عزت واحترام کا جذبہ سبھی کو متاثر کرتا تھا۔دلوں کو فتح کرنے کا ہنر آپ کو معلوم تھا۔محبت کی بادِ بہاری اور ہمدردی کی نسیم سحری سے آپ کی شخصیت پُر تھی حتیٰ کہ لوگ آپ کی تاثیر گفتگو اور انداز بیان سے اس حد تک متاثر تھے کہ کہنے پر مجبور تھے کہ غفران صاحب جب زبان کھولتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے لفظ لفظ میں قند گھولتے ہیں۔کردار کے اعتبار سے یکتائے زمانہ اور اوصاف حمیدہ میں فرد یگانہ تھے۔آپ کے یہاں شانِ بے نیازی اور رواداری کے ساتھ ساتھ دلجوئی اور دلداری بھی بہت تھی۔جس طرح درخت اپنا پھل خود نہیں کھاتا، دریا اپنا پانی خود نہیں پیتا اسی طرح آپ کی زندگی بھی دوسروں کے لیے گویا وقف تھی۔اپنی پریشانی یا تکلیف حتی الامکان کسی سے ذکر نہیں کرتے اس کے برعکس دوسروں کی تکالیف سن کر مضطرب ہوجاتے اور اس کے حل کے لیے عملی تدبیر بھی کرتے۔اپنا آرام وسکون تج کردیتے حتیٰ کہ اپنا ذاتی نقصان بھی برداشت

کر لیتے خواہ سامنے والا کوئی بھی ہو۔ بہت سارے برادران وطن اور کمزور طبقہ کے لوگوں کی پریشانیوں کے تدارک کے لیے بھی متفکر رہتے تھے۔ راقم کو بھی متعدد بار اس کا تجربہ ہے، اکثر لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کے لیے مجھ سے بھی کہا کرتے تھے اور مقصد کی حصولیابی پر برملا خوشی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ بعض دفعہ جب کسی ایک ہی شخص کے کام کے لیے متعدد بار فرماتے تو میں کہتا کہ سر یہ آدمی بار بار ہر کام کے لیے آپ کو پریشان کرتا ہے تو بڑی ہی عاجزی وانکساری سے جواب دیتے اس کے وسائل محدود ہیں، ذریعۂ معاش بھی کوئی نہیں ہے لہٰذا اِس سے اُس کا بھلا ہو جائے گا۔

آپ نے اپنی زندگی میں شاید ہی کسی شخص کے لیے اپنے دل میں نفرت اور کدورت کو جگہ دی ہو یا اپنی ذات سے کسی کو نقصان پہنچایا ہو، چہ جائیکہ مخالف کی طرف سے آپ کو تکلیف پہنچی ہو۔ اس سلسلہ میں آپ کے فرزند نصران کا کہنا ہے کہ ڈیڈا اکثر عشائیہ سب کے ساتھ لیتے تھے اور دوران طعام ہم لوگوں کو کچھ نصیحتیں کرتے تھے۔ آپ فرماتے کہ کبھی اپنی ذات سے کسی کو تکلیف مت پہنچانا خواہ تمھیں کوئی زک یا نقصان بھی پہنچے اور دوسروں کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا۔ گویا دوسروں کے لیے جینا ہی اصل مقصد حیات ہے، ہم میں سے زندہ وہی رہے گا جو دلوں میں زندہ رہے گا اور دلوں میں وہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ وفات سے چند ماہ قبل شعبہ میں آپ کا ذاتی کمرہ تبدیل ہوا تھا اور آپ دوسرے کمرے میں منتقل ہو گئے تھے، خوش قسمتی سے آپ کے سابقہ کمرہ کا راقم وارث ہو گیا لہٰذا جیسے جیسے لوگوں کو آپ کے وصال کی خبر موصول ہوتی وہ حیران وششدر سیدھے میرے کمرہ میں تشریف لاتے اور لرزاں آواز میں آنکھوں میں ایک ہی شخص کی جستجو لیے سوال کرتے، کیا سن رہا ہوں؟ یہ صحیح خبر ہے؟ کیسے ہوا؟ کب ہوا؟ وغیرہ سوالات کر کے اشکبار اور افسردہ واپس ہو جاتے۔ بیشتر نے تو یہاں تک کہا کہ وہ میری بڑی مدد کیا کرتے تھے آپ ان کی جگہ ہیں چنانچہ اب آپ کو یہ کام انجام دینا ہے۔ ایک بزرگ میرے کمرے میں تشریف لائے اور بے ساختہ زار وقطار رونے لگے۔ فرمایا! غفران صاحب میرے بڑے کرم فرما اور محسن تھے، میری کافی مدد کیا کرتے تھے، میری تین بیٹیاں ہیں جن میں سے دو نے تعلیم مکمل کر لی ہے، تیسری بیٹی نے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا مگر معاشی حالت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے میں اسے تعلیم منقطع کرنے کو کہہ رہا تھا، اس کی خبر مرحوم کو ہوئی، چنانچہ آپ نے فرمایا بچی کی خواہش کی تکمیل کیجیے اور اس کی تعلیم جاری رکھیے، تمام صرفہ میرے ذمہ ہے۔

اس طرح کے بے شمار واقعات آپ کے ذاتی اوصاف کے شاہد ہیں۔ ان ہمہ جہت خصوصیتوں اور صلاحیتوں نے آپ کو شخص سے شخصیت بنا دیا تھا۔ اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے تئیں آپ کا والہانہ لگاؤ آج آپ کے پیچھے یاد بھی آرہا ہے اور ذکر کا متقاضی بھی ہے۔ ایک غیر مسلم شخص آیا جو استاد محترم سے کافی عرصہ سے منسلک تھا، اس کو آپ کی رحلت کی خبر ۱۵/دن بعد ہوئی، بہت جذباتی ہو گیا، بے ساختہ بولا وہ تو میرے بھگوان کی مانند تھے، ویسا انسان میں نے دیکھا ہی نہیں، کیا ہو گیا تھا ان کو؟ کیوں اتنے جلدی چلے گئے؟ طبیعت کی نفاست، مجد و شرف، تبحر علمی اور غیر معمولی ذہانت کی بنا پر طبی برادری خصوصاً مادرِ درسگاہ اور شعبہ میں ایک انفرادی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کی ظاہری شخصیت بھی نہایت پُر وقار، پُر کشش اور جاذب نظر تھی۔ نہ جانے خدا نے آپ کے اندر کونسی مقناطیسی کشش رکھی تھی کہ ہر نو وارد اور انجان شخص پہلی ہی ملاقات میں آپ کے انداز گفتگو اور اخلاق سے آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا اور خود کو مرحوم کا اقرب سمجھتا تھا۔ آپ بھی سامنے والے کو اتنا ہی باعزت اور محترم سمجھتے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے احباب اور محبین کا ایک وسیع حلقہ تھا جن میں اساتذہ، طلبہ، ریسرچ اسکالرز کے علاوہ سیاسی، سماجی، علمی اور دینی وملی افراد شامل تھے اور یہ تمام ہی افراد آپ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ اس کا مزید احساس مجھے اس وقت ہوا جب آپ اللہ کو پیارے ہو گئے اور آپ سے وابستگان کی ایک طویل اور لامتناہی فہرست سامنے آئی جنھوں نے ملک اور بیرون ملک سے استاد محترم کے لواحقین کے لیے اپنے تعزیتی پیغامات اور دعائیں ارسال کیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے جس کا ذکر یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے: ''اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تمھارا کیا مقام ہے تو یہ دیکھو خدا کی مخلوق تمھارے بارے میں کیا سوچتی ہے۔'' بلاشبہ دوسرے لوگوں کی مانند آپ بھی ایک بشر ہی تھے لیکن آپ جیسی خصوصیات اور اوصاف کے حامل انسان واقعی نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ ایک فارسی کا شعر

ہے جو استادمحترم کی شخصیت پر بالکل صادق آتا ہے:۔

آدم خوب مثل طلائے بینش است　　آنچہ بجستیم وکم دیدم درکار است ونیست

نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار است ونیست

ترجمہ: ''اچھے انسان کی مثال ایسی ہے جیسے کھرا سونا۔ جس چیز کو ہم نے بہت ڈھونڈا اور کم پایا اور جو بہت کثرت سے موجود ہونے کے باوجود مفقود ہے، ایسی چیز عالم میں اچھے انسان کے سوا کوئی نہیں ہے۔''

استادمحترم سے میری پہلی ملاقات شاگرد کی حیثیت سے ۲۰۰۲ء میں بی یو ایم ایس سیکنڈ پروفیشنل میں ہوئی جب آپ صیدلہ کی کلاس لینے کلاس روم میں داخل ہوئے۔ پہلی ہی ملاقات میں مرحوم کی پُروجیہ لیکن بے تکلف شخصیت کو بڑا ہی جاذب نظر اور پُر اثر پایا اور آپ کے باکمال طریقۂ تدریس نے دل و دماغ کو متأثر کیا۔ رفتہ رفتہ استادمکرم کے دیگر اوصاف اور جوہر سے شناسائی ہوئی۔ ۲۰۰۶ء میں جب میرا داخلہ شعبۂ علم الادویہ میں ایم ڈی میں ہوا اس وقت استادمحترم سے مزید قربت نصیب ہوئی اور آپ سے تدریس کے ساتھ تحقیق کے رموز و نکات سیکھنے کا موقع ملا۔ ایم ڈی سال اول میں آپ نے ہمیں ریسرچ میتھڈولوجی کا مضمون پڑھایا تھا جو آج بھی ذہن و دماغ پر نقش ہے۔ پورا لکچر آپ انگریزی زبان میں ہی دیتے تھے۔ اس سحر انگیز اور پُرمغز لکچر کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں ابتداء تا انتہاء ایک تسلسل اور ربط برقرار رہتا تھا، کہیں بے ربطی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ ہم لوگوں کو آپ کی معیت اور استفادہ کا موقع کم و بیش تین سال کے لیے موقوف ہو گیا کیونکہ آپ کی صلاحیت اور تبحر علمی سے فیضیاب ہونے کے لیے گویا بہت سارے لوگ تشنہ لب تھے۔ چنانچہ ۲۶ رنومبر ۲۰۰۷ء کو نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں استادمکرم کا براہ راست لیکچرر سے پروفیسر کے عہدہ پر انتخاب ہو گیا اور آپ مادر علمی، علی گڑھ سے بنگلور چلے گئے۔ ہم لوگوں کو شعبہ میں ایک خلا کا احساس ہونے لگا لہٰذا اکثر استادمحترم کو فون کیا کرتے تھے اور شعبہ میں ان کی عدم موجودگی کے احساس کا ذکر کرتے تھے، اس کے جواب میں آپ بارہا کہتے اب تو تکنیکی اور ای میل کا دور ہے، زمانہ کافی ترقی کر چکا ہے تم لوگوں کے جو سوالات اور دشواریاں ہوں مجھے میل کر دیا کرو میں اسے حل کر کے، تصحیح شدہ مسودہ واپس بھیج دوں گا۔ چنانچہ ہم لوگ ایسا ہی کرتے تھے اور آپ بغیر کسی تأمل اور ناپسندیدگی کے اظہار کے اپنی مصروفیات کے باوجود مختصر وقت میں ہمارے ارسال کردہ مسودے تصحیح کے بعد واپس میل کر دیا کرتے تھے۔ اس طرح دور رہ کر بھی استادمحترم نے گویا پاس ہونے کا احساس دلایا اور آپ کا ہر ممکن تعاون ہمارے ساتھ رہا۔ ۲۰۰۹ء میں دوبارہ جب آپ مادر علمی تشریف لائے تو اس وقت راقم ایک پروجیکٹ میں بحیثیت ریسرچ فیلو کے مصروف تھا لہٰذا اس وقت آپ سے پروجیکٹ کی تکمیل میں کافی مدد ملی۔ ۲۰۱۲ء میں خوش قسمتی سے میرا تقرر شعبہ میں تدریسی فرائض کے لیے عمل میں آیا اس طرح سے مجھے یہ شرف حاصل ہوا کہ میں طالب علم کے ساتھ ساتھ شعبہ میں آپ کا رفیق کار بھی ہو گیا پھر تو آپ سے مزید قربت اور بے تکلفی ہو گئی، گویا کوئی فرد خانہ۔ استادمحترم علمی گفتگو اور شعبہ کے دیگر امور کے علاوہ ذاتی اور گھریلو مسائل پر بھی گفتگو کرتے مثلاً بچوں کی خیریت، ان کی تعلیم و تربیت حتیٰ کہ آبائی وطن اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں بھی بڑی دلچسپی لیتے تھے اور ایک ایک فرد کی خیریت دریافت کرتے تھے۔

استادمکرم کے نزدیک حفظ مراتب کا لحاظ گویا جزوایمان تھا، آپ خاندانی رشتوں، اعزہ و اقارب، اساتذہ و احباب، طلبہ اور غیر تدریسی عملے کا ہر ممکن پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ اپنے والدین کی حتیٰ الامکان خدمت کرتے، ان کی ضروریات کا پورا خیال رکھتے، تمام اعزہ و اقارب کے ساتھ حسن سلوک نے آپ کو پورے خاندان کا محبوب بنا دیا تھا۔ اساتذہ کا احترام اور ادب کوئی آپ سے سیکھے، اگر کوئی استاد آپ کے کمرہ میں داخل ہو جاتا تو فوراً اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور اپنی نشست استادمحترم کو پیش کر دیتے تھے اور خود برابر میں بیٹھتے تھے۔ دوران گفتگو حتی الامکان نگاہ اور آواز پست رکھتے تھے۔ اساتذہ کا احترام تو اس حد تک تھا کہ اگر موبائل پر بھی کال آجاتی تو بھی آپ کھڑے ہو جاتے۔ اسی طرح رفقاء اور احباب کے منظور نظر تھے اکثر و بیشتر اپنے ہم سبق رفقاء کا ذکر کرتے، ہر ایک کی خبر رکھتے اور ان سے مل کر خوش ہوتے۔ بعض ساتھی جو معاشی طور پر کمزور ہوتے ان کی خفیہ مدد بھی کیا کرتے۔ کوئی آشنا یا رفیق علی گڑھ تشریف لاتا تو آپ سے ملے بغیر نہیں جاتا اور آپ بھی اس کی حتی المقدور ضیافت کرتے اور پورا وقت دیتے۔ اسی طرح آپ بیشتر اوقات محض اپنے رفقاء سے ملاقات کی غرض سے امتحان اور وائیوا کے بہانے دور دراز کے اسفار کیا کرتے تھے۔ بنگلور، پونہ اور ممبئی وغیرہ کا سفر

خصوصاً آپ دوستوں سے ملاقات کی غرض سے ہی کیا کرتے تھے۔احباب ورفقاء کی ترقی اور کامیابی سے کافی خوش ہوتے تھے،انھیں پہلی فرصت میں مبارکباد دینا اور خوشی کا اظہار کرنا اپنا ذاتی حق سمجھتے تھے۔طلبہ کے درمیان ایک قابل،مشفق اور محبوب استاد کی حیثیت سے مقبول تھے۔بحیثیت استاد نہ صرف اپنے شعبہ میں بلکہ کالج اور یونیورسٹی کے دوسرے شعبہ جات کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کے طلبہ میں آپ کی مقبولیت اور محبوبیت منفرد تھی۔سبب آپ کا جذبۂ ہمدردی اور ہر ایک کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا تھا۔

قدرت نے آپ کو مسائل اور مشکلات کے حل کے لیے ذہانت کا عجیب و غریب ملکہ عطا کیا تھا۔آپ کے درس وتدریس کا ایک منفرد انداز اور شائستہ زبان ہر طالب علم کے ذہن ودماغ پر ایک گہرا نقش چھوڑتی تھی۔باکمال تدریسی اور تحقیقی صلاحیت کی وجہ سے طلبہ کے درمیان بے حد محبوب تھے۔آپ کے لکچر فکر انگیز، پُرمغز اور معلومات سے پُر ہوتے تھے جو طلبہ پر مثبت اثر رونما کرتے تھے۔عمدہ تدریس ظاہر ہے مضمون پر عبور کے بغیر ممکن نہیں۔آپ نے یونانی طب کے مضامین کے علاوہ دیگر متعدد مضامین کو انتہائی شغف اور مہارت کے ذریعہ پڑھا کر طلبہ کے درمیان مقبولیت کا ایک اور باب رقم کیا۔آپ طلبہ سے روایتی استاد کی طرح پیش نہیں آتے تھے بلکہ آپ کا رویہ اپنے شاگردوں کے ساتھ بہت ہی مخلصانہ اور دوستانہ ہوتا تھا۔اپنے طلبہ کو صرف جاننے کی ہی نہیں بلکہ ان کو سمجھنے اور پرکھنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ہر ایک طالب علم کی تمام تر سرگرمیوں پر آپ کی گہری نگاہ ہوتی تھی اور اپنی ذہانت اور تجربہ سے ان کی صلاحیتوں کو پرکھ لیتے تھے۔ آپ بلاتخصیص ہر ایک طالب علم کے لیے ہر وقت دستیاب اور میسر ہوتے تھے۔ خواہ مسئلہ علمی،تحقیقی یا ذاتی نوعیت کا ہو استاد محترم بلا کسی ناگواری کے بلکہ خوش دلی سے طلبہ کی ضروریات اور ان کے مسائل کو سنتے اور پوری ایمانداری و دیانتداری سے تشفی بخش حل کے ذریعہ طلبہ کو مطمئن کردیتے۔مزید اپنے شاگردوں کی چائے وغیرہ سے ضیافت بھی کرتے تھے۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی آپ کا اپنے شاگردوں سے گہرا تعلق برقرار رہتا تھا نیز ان کی ملازمت کے لیے بھی فکرمند رہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ طلبہ کی ایک بڑی جماعت آپ کو آج بھی اسی شدت سے اپنی دعاؤں میں یاد کرتی ہے اور آپ کے خلا کو محسوس کرتی ہے۔اس کے علاوہ آپ غیر تدریسی عملے میں بھی بیحد مقبول تھے، ہر ایک ملازم آپ کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا،آپ ہر ایک سے ان کی ضروریات اور مسائل دریافت کرتے رہتے تھے۔ان کی واجب الاداء چیزوں کو بلا کسی تاخیر کے پورا کرنا یا اس کے لیے اپنی جانب سے کوشش کرنا ان کی فطری عادت تھی۔بلکہ مزید اس میں کامیابی پر مسرت کا اظہار بھی کرتے گویا ان کا ذاتی مسئلہ حل ہوگیا ہو۔چنانچہ آج بھی بہت سارے ملازمین آپ کو یاد اور آپ کے حق میں دعائیں کرتے ہیں۔استاد محترم کے یہ وہ اوصاف ہیں جو انھیں نہ صرف دیگر لوگوں سے ممتاز کرتی تھیں بلکہ دوسروں کی نگاہوں میں ان کی قدر ومنزلت میں اضافہ کرتی تھیں۔

نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن تا بماند نام نیکت برقرار

علمی وتحقیقی کمالات

استاد محترم کی ذات بلا مبالغہ مختلف الجہت اور متنوع صفات کی حامل تھی۔ ایک طرف جہاں آپ ایک با اخلاق، ماہر کلام اور تہذیب وتمدن کے عظیم پیکر تھے، دوسری طرف ایک بلند پایہ معلم ومحقق اور مرجع تقلید طب تھے۔طبی میدان میں عالمانہ اور محققانہ حذاقت کی وجہ سے اپنے معاصرین اور رفقاء کار میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔یونانی طب کے فروغ اور تعلیم وتحقیق کے میدان میں اس کی ترویج واشاعت کے لیے ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔طب کے بنیادی نظریات کو فنی تشخص سمجھتے تھے اسی لیے آپ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ یونانی طب کی روح کو چھیڑے بغیر اسے ایسی شکل میں پیش کیا جائے کہ وہ جدید دنیا کے لیے قابل فہم بھی ہو اور عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہوتا کہ عوام الناس میں مقبولیت کے درجے تک پہنچ سکے۔اپنے موضوعِ اختصاص یا بعض امور میں بعض اشخاص کو بڑا ملکہ ہوتا ہے۔یہ منفرد خصوصیت بھی مرحوم استاد محترم میں پائی گئی کہ موضوع گفتگو کچھ بھی ہو اس میں آپ درک وبصیرت اور خزینہ معلومات رکھتے۔ذکر معاشیات کا ہو یا سیاسیات کا، دینی مباحث کا ہو یا دنیاوی موضوعات کا، موٹر کار کا ہو یا ملبوسات کا، کھیلوں کا ہو یا کوائفِ عالم کا ان کی پُرلطف اور پُرمغز گفتگو پر گمان چلتی پھرتی قاموس (انسائیکلوپیڈیا) کا ہوتا۔گفتگو کے دوران کسی فکر کو واضح کرنے کے لیے گردوپیش سے ایسی حسی مثالیں پیش کرتے جو ان کی غیر معمولی ذہانت، معلومات کی وسعت اور اعلیٰ ادبی ذوق پر دلالت کرتی ہیں۔استاد محترم کو

بیک وقت کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم چونکہ مدرسہ سے ہوئی تھی۔ لہٰذا عربی ادب میں آپ کو ایک خاص قدرت حاصل تھی، ساتھ ہی انگریزی زبان میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ انگریزی کی تحریریں خواہ درخواست ہو یا کوئی ڈرافٹنگ (مسودہ تیار کرنا) یا پھر علمی تحریر یا مقالے بہت ہی عمدہ اور غیر معمولی ہوتی تھیں۔ تجزیاتی سوچ اور تخلیقی صلاحیت آپ کی تحریروں میں نمایاں نظر آتی تھی۔ نئے نئے الفاظ کا استعمال کرنا اور حتی الامکان تکرار سے احتراز کرنا آپ کا ذوق تھا۔ اکثر لوگ اپنے مقالے اور انگریزی گرامر کی تصحیح کی غرض سے آپ سے رجوع کرتے تھے۔ انگریزی زبان میں جب لکچر دیتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے ریکارڈنگ ہو۔ انداز بیان میں ایک مخصوص آہنگ اور تسلسل آخر تک برقرار رہتا گویا انگریزی ادب کا ایک خوش لسان اور خوش بیان عالم و فاضل۔ اسی طرح اردو تحریر ہو یا تقریر دونوں میں یکساں امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ جب بولتے تو ایسا لگتا جیسے الفاظ دست بستہ ہوں۔ دل یہی چاہتا کہ آپ بولتے رہیں اور ہم ان الفاظ کو محفوظ کرتے رہیں۔ اردو کی بہت ساری تحریریں میری نگاہوں سے گزری ہیں بلکہ دیگر حضرات بھی اس کے شاہد ہیں کہ آپ کی اردو تحریریں بھی قابل تحسین اور قابل رشک ہیں۔ الفاظ و معانی کے درمیان ایسی مطابقت، فکر و شعور کے درمیان ایسی مناسبت اردو ادب کے مستند ادباء کی تحریروں میں ہی ملتی ہیں۔

آپ متعلمین اور محققین کے درمیان یکساں مقبول تھے۔ طب میں بحث و تحقیق کے شہ سوار ہونے کے ساتھ دیگر علوم کے شناور بھی تھے۔ آپ کے تحقیقی مقالات انتہائی بلیغ اور معیاری ہوتے تھے جو عموماً اغلاق و ابہام اور ژولیدگی سے پاک ہوتے۔ آپ کی تحریروں میں شگفتگی ہوتی تھی، مقدار سے زیادہ معیار پر توجہ مرکوز رکھتے تھے۔ معیار سے کبھی کوئی سمجھوتا نہیں کرتے۔ اکثر فرمایا کرتے سال میں ایک یا دو مقالہ ہی شائع کراؤ مگر معیاری ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے تحقیقی مقالات حلقۂ اطباء اور دیگر لوگوں میں کافی پسند کیے جاتے ہیں۔ اس کامیابی کے پیچھے آپ کے عمیق مطالعہ اور طب سے دلچسپی کا دخل ہے۔ آپ کو مطالعہ کا بہت شوق تھا، زیادہ تر وقت کتابوں کے مطالعہ میں ہی گزرتا تھا، ساتھ ہی قلم کے ذریعہ اظہار مدعا پر قادر تھے۔ طبی مصادر کی کتابوں کے علاوہ دیگر علوم کی کتابوں کو بڑی دلچسپی اور انہماک سے پڑھتے تھے۔ شعبہ میں بھی کبھی آپ فارغ نہیں پائے گئے، بیشتر اوقات مطالعہ یا تحقیق و تحریر میں مشغول ہوتے اور کسی طرح کی دخل اندازی سے بچنے کے لیے کبھی کبھی کمرہ کو باہر سے مقفل کرا دیتے اور اندر اپنے علمی کام میں مصروف ہوتے۔ یہی معمول آپ کا گھر پر بھی تھا۔ آپ کے فرزند نصران کا کہنا ہے کہ ڈیڈ مغرب کی نماز کے بعد اکثر کتب بینی اور مطالعہ میں مصروف ہو جاتے تھے اور یہ معمول رات کے ۱۲ بجے تک جاری رہتا، درمیان میں صرف نماز اور کھانے کے لیے اٹھتے تھے۔

تحقیقی صلاحیت کے اعتبار سے استاد محترم کا ایک خاص مقام تھا، آپ کے اندر ایک محقق کی جملہ صلاحیتیں جیسے تجزیاتی دماغ، ذہانت، تجسس، مفکرانہ سوچ، تحریری اور مواصلاتی لیاقت، منظّم انداز اور عزم و حوصلہ بدرجۂ اتم موجود تھے۔ اللہ نے آپ کو علم و ادب کے ایک نفیس ذوق سے نوزا تھا۔ آپ نے اپنی ۲۴ سالہ تدریسی و تحقیقی زندگی میں لاتعداد نئے کام انجام دیے۔ یہ امر بھی قابل اطمینان ہے کہ آپ نے اپنی عطا کردہ صلاحیتوں سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور ساتھ ہی خلق خدا کو بھی اس سے فائدہ پہنچایا۔ اپنی نگرانی میں تحقیق کرنے والے شاگردوں میں بھی آپ محنت اور ایمانداری کا جذبہ فروغ دیتے۔ تقریباً ۳۸ طلبہ نے آپ کے زیر نگرانی طب کے مختلف اہم اور اطلاقی موضوعات پر ریسرچ و تحقیق کا کام انجام دیا ہے۔ آپ کے ۱۰۰ سے زائد تحقیقی مقالے مختلف موقر اور معیاری قومی اور بین الاقوامی جرائد اور میگزین میں شائع ہوئے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے کتابی ابواب عالمی معیار کے پبلشرز کے ذریعہ شائع ہوئے ہیں۔ صیدلہ پر آپ کی ایک اہم تصنیف ''اوصاف ادویہ'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اصول دواسازی کے نام سے تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل آپ کا ایک عظیم سرمایہ اور معرکۃ الآراء تالیف جس کا ہم میں سے بیشتر شاگردوں کو شدت سے انتظار تھا جو جلد ہی منظر عام پر آنے والی تھی، لیکن خدا کو شاید منظور نہیں تھا کہ آپ کی حیات میں یہ کام ہو۔ لیکن ان شاء اللہ عنقریب یہ ہمارے درمیان ہوگی اور استاد محترم کے لیے ایک بہترین خراج تحسین اور صدقۂ جاریہ ثابت ہوگی۔

استاد محترم ریسرچ اور تحقیق کے شہ سوار تھے چنانچہ آپ بہت سے عالمی اور قومی معیاری جرائد کے مدیر، نائب مدیر اور مجلس ادارت کے ممبر بھی تھے۔ آپ کو طب کے علمی و تحقیقی میدان میں گرانقدر خدمات کے اعتراف میں حکومتی اور ادارہ جاتی سطح پر متعدد موقر اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ اعزازات، مناصب اور عہدے بہت سے افراد کے لیے باعث فخر اور موجب شناخت ہو سکتے ہیں مگر استاد محترم کا معاملہ یہاں بھی برعکس تھا۔ آپ کے نزدیک اس کی بہت زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ آپ نے بہت ساری ملکی اور عالمی سطح کی کانفرنسز اور سیمیناروں میں شعبہ اور یونیورسٹی کی طرف سے طب کی نمائندگی کی ہے، یہی وجہ ہے کہ طب میں آپ کی گرانقدر معلومات اور گرفت کی وجہ سے بیرون ممالک جیسے سری لنکا، موریشس وغیرہ میں آپ کو مدعو کیا گیا۔ وہاں آپ نے یونانی طب پر متعدد کلیدی خطبے پیش کیے جسے کافی سراہا گیا، اس کے علاوہ لندن کی ایک مشہور تعلیمی اکیڈمی البلاغ نے طب پر آپ کے ایک آن لائن لکچر سیریز کا انعقاد کیا تھا جس میں شاید ابھی ایک یا دو لکچر ہی ہوئے تھے کہ آپ نے رخت سفر باندھ لیا اور طب کے شائقین کو تشنہ لب چھوڑ گئے۔ اس کے علاوہ آپ نے سیکڑوں کانفرنسز اور علمی نشستوں میں جلسے کی صدارت کی ہے اور اپنے بیش قیمتی مشوروں اور تنقیدی نکات سے لوگوں کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ ابھی حال ہی میں عالمی ادارۂ صحت نے یونانی طب کی اصطلاحات کو منظم اور مرتب کرنے کے لیے ایک ڈرافٹ کمیٹی تشکیل دی تھی جس میں استاد محترم کو ایکسپرٹ ممبر کی حیثیت سے نامزد کیا تھا چنانچہ آپ نے اس کی کئی نشستوں میں شرکت کی اور اپنے بیش قیمتی مشوروں کو قلم بند کرایا۔ حکومتی اور یونیورسٹی کی سطح پر آپ بہت ساری اہم کمیٹیوں کے ممبر بھی تھے۔ اس کے علاوہ بہت سارے پروگرامس میں ڈائریکٹر، ڈپٹی ڈائریکٹر، کوآرڈینیٹر اور کنوینر کی حیثیت سے بھی آپ کی خدمات حاصل رہی ہیں۔ مقامی طور پر فیکلٹی اور کالج میں بیشتر کمیٹیوں میں آپ کا نام ہوتا، کوئی کمیٹی آپ کے نام کے بغیر گویا ناقص ہوتی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آپ کو کچھ کمیٹیوں سے مجبوراً معذرت کرنی پڑی تھی۔

استاد محترم کی ذات کے یہ محض چند گوشے ہیں جو راقم کے ذاتی مشاہدات اور تجربات ہیں۔ ظاہر ہے استاد محترم کی بے شمار خوبیوں اور ہمہ جہت کارناموں کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے وقت اور اشخاص کی ضرورت ہے۔ بہرحال یونانی طب کے فروغ میں استاد محترم کی ان کاوشوں کو سنہری الفاظ میں لکھا جائے گا اور ان عظیم کارناموں اور گرانقدر خدمات کو ایک بیش قیمت باب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ بلاشبہ آپ طب کے مایہ ناز فرزند تھے۔ آپ کا اس دنیا سے رخصت ہونا افراد خانہ خصوصاً اہلیہ؛ صوفیہ خاتون، بیٹوں؛ نصران وریان، بیٹی؛ ہبہ رمان اور خاندان کے لیے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ شعبہ کے لیے، ہم لوگوں کے لیے اور طبی برادری نیز ان سب لوگوں کے لیے ایک بڑا اور ناقابل تلافی نقصان ہے جن سے ظاہری زندگی میں آپ سے کسی نہ کسی وجہ سے تعلق رہا ہے۔ لہٰذا صدمہ سے دوچار حلقۂ اطباء میں ان کا ماتم تو ہونا ہی تھا لیکن ان کی رحلت سے طب اور اطباء کے علاوہ دیگر بہت سارے افراد کا بھی نقصان ہوا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آپ کے انتقال کی خبر سن کر آپ کے اعزہ و احباب، شاگردوں، رفقاء اور یونیورسٹی برادری کے علاوہ ایک بڑی جماعت افسردہ اور اشکبار تھی جن کا بظاہر نہ تو یونیورسٹی سے تعلق تھا اور نہ ہی فن طب سے۔ آپ کی عملی زندگی قابل تقلید اور قابل رشک ہے۔

استاد محترم اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی یادیں، ان کا خلوص، ان کی شفقتیں، ان کا بخشا ہوا ولولہ علمی اور عملی طور پر کاربند رہنے کی تلقین کر رہا ہے۔ وہ بہت قیمتی شخص تھے، بے پناہ عزم و حوصلہ کے حامل، ایک باکردار اور وفا شعار انسان تھے۔ آج یادوں کے سمندر میں کتنی موجیں مضطرب ہو کر ذہن کے پردے سے ٹکرا رہی ہیں اور بھنور بن کر دل میں ہلچل پیدا کر رہی ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تقریباً دو دہائیوں سے استاد محترم کی شفقتوں، محبتوں، ان کی عنایتوں اور ان کے بیکراں علم و فضل سے برابر مستفید ہوتا رہا۔ اللہ تعالی سے دعاء ہے کہ وہ استاد محترم کی بشری لغزشوں کو معاف فرما کر ان کے اعمال حسنہ اور خدمات کے عوض ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے نیز متعلقین و لواحقین کو صبر جمیل اور طبی برادری اور شعبہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

ڈاکٹر شبیر احمد پرّے ☆

کووڈ کی وبا نے پوری دنیا میں تہلکہ مچادیا، اس موذی وبا نے نہ جانے کتنے گھروں کو نیست و نابود کردیا، کتنے سروں سے ان کے سرپرستوں کا سایہ چھین لیا، کتنے بچوں کو ماں کی ممتا سے محروم کردیا، کتنے بوڑھے والدین کا سہارا چھین لیا، سچ پوچھیں تو یہ ایک قیامت صغریٰ سے کم نہ تھی۔ اسی قیامت صغریٰ نے ہم سے یونانی طب کے ایک معتبر معلم، محقق اور بے نظیر ایڈمنسٹریٹر کو ہم سے چھین لیا، جی! میں بات کررہا ہوں استاذ محترم پروفیسر غفران صاحب کی۔ مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہ بہترین اخلاق و کردار کے مالک تھے، دور اندیش، حکمت سے مالا مال، طب قدیم و جدید پر مہارت رکھنے والے، اقتصادیات و معاشیات سے واقف، پانچ سے زائد زبانوں کے عالم، گفتار و کردار میں یگانۂ روزگار، ان کے در پر علم کے موتیوں کو سمیٹنے کے لیے ہر کوئی بلا تکلف جایا کرتا تھا، وہ ایسے ساقی تھے جن کے یہاں ہر کوئی علم کے ساغر بھرتا، وہ ایسے سایہ دار درخت تھے جن کے یہاں ہر کوئی سکون محسوس کرتا تھا، اگر یوں کہا جائے تو درست ہوگا کہ ان کی زندگی انتہائی قیمتی، بامقصد اور عین اس حدیث مبارکہ کی مصداق تھی:

الْمُؤْمِنُ يَأْلَفُ وَيُؤْلَفُ، وَلَا خَيْرَ فِيمَنْ لَا يَأْلَفُ وَلَا يُؤْلَفُ وَخَيْرُ النَّاسِ أَنفَعُهُمْ لِلنَّاسِ۔

ترجمہ: ''مؤمن الفت کرتا بھی ہے اور لوگ اس سے الفت رکھتے بھی ہیں اور اس شخص میں کوئی بھلائی نہیں جو الفت نہیں رکھتا اور نہ لوگ اس سے الفت رکھتے ہیں اور لوگوں میں بہترین وہ ہے جو لوگوں کے لیے نفع مند ہو۔'' (السلسلۃ الصحیحۃ، علامہ البانی)

بہر حال جس شجر ثمر دار کے سائے تلے سکون کی سانسیں مل جایا کرتی تھیں، وہ شجر کٹ چکا ہے، اب علم و عرفان کے ساغر لٹانے والا میر مجلس جاچکا ہے، جگر مرادآبادی نے سچ کہا۔

جان کر منجملہ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

ان کی اچانک وفات طبی دنیا کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے، ان کی رحلت سے در آنے والے خلا کو کوئی فی الحال پورا کرنے والا نظر نہیں آرہا ہے۔ ذیل کی تحریر میں، میں نے استاذ محترم کے حوالے سے اپنے احساسات، جذبات اور مشاہدات کو قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے جو دیکھا، پرکھا، جانچا وہی کچھ احساسات اور جذبات کی رو میں تحریر کیا ہے، سچ یہ ہے کہ ان کے ان خصائص اور صلاحیتوں کا اعتراف ہر کس و ناکس کو ہوگا۔

پہلی ملاقات

اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مارچ، اپریل ۲۰۰۲ء کی بات ہوگی، ہماری سیکنڈ پراف کی کلاس بیکٹر یالوجی لیب کے پاس والے کمرے میں شروع ہوچکی تھی، نئے ٹائم ٹیبل کے مطابق پونے گیارہ بجے کی کلاس صیدلہ کی ہونی تھی۔ ٹھیک پونے گیارہ پر استاد محترم اپنے مخصوص انداز میں کلاس روم کے اندر آئے، ہمارے کئی کلاس فیلوز ان سے اچھی طرح واقف تھے، ان کے ہاتھ میں رجسٹر تھا، جس پر طلبہ کے نام درج تھے لیکن اس اندراج کی خاص بات یہ تھی کہ اسے قلم سے تحریر نہیں کیا گیا تھا بلکہ ناموں کو کمپیوٹر سے ٹائپ کرکے اسے پرنٹ کرکے رجسٹر کی لائنوں کے متوازی خالی جگہوں پر سلیقے سے فٹ کیا گیا تھا، اس زمانے میں

☆ میڈیکل آفیسر، جموں و کشمیر۔ E-mail:saparray@gmail.com، Mob.No:7972000413,7768938797۔

کمپیوٹر پرنٹنگ بڑی بات ہوا کرتی تھی۔ ایسا میں نے پہلی بار دیکھا تھا اس لیے مجھے استاذ محترم کی تکنیک آشنائی کے ساتھ ساتھ ان کے حسن شعار اور رکھ رکھاؤ کا معترف ہونا پڑا۔ انھوں نے آتے ہی کلاس میں ایک ہلکی سی نظر دوڑائی، طلبہ اس وقت کلاس روم میں کم تھے، میں کلاس کی پہلی قطار میں بیٹھا تھا، جس کی دو وجہیں تھیں، ایک تو یہ کہ ہمارے کلاس میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ تھی، تقریباً ۱۰۴ طلبہ تھے، جس کی وجہ سے بعض دفعہ کلاس میں نقطۂ اعتدال ڈگمگا جاتا، دوسری بات یہ تھی کہ شروع سے ہی مجھے پہلی یا دوسری رو میں بیٹھنے کی عادت تھی، مزید یہ کہ میرے سینئر حضرات نے کہا تھا کہ صیدلہ کے ٹیچر بہت دھیمے دھیمے لہجے میں پڑھاتے ہیں، اور وہ لکھواتے بہت ہیں، جو لکھواتے ہیں وہ کتابوں میں اکثر نہیں ملتا ہے، اور ان میں بہت کارآمد باتیں ہوتی ہیں جو صرف پریکٹیکل فیلڈ میں ہی حاصل ہوسکتی ہیں، یہی سب وجوہات تھیں جن کی وجہ سے اس روز بھی میں پہلی رو میں موجود تھا، حسن اتفاق انھوں نے میرے ہی سامنے رجسٹر کھول کر حاضری لینی شروع کی، اور اس طرح میں اس رجسٹر پر موجود پرنٹیڈ ناموں سے واقف ہوسکا تھا۔

ان کے آتے ہی کلاس میں موجود طلبہ حسب روایت کھڑے ہونے لگے، استاذ محترم نے جلدی سے بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا، اس کا احساس مجھے بعد میں ہوا کہ اصل میں استاذ محترم طلبہ کے اس روایتی انداز سے کھڑے ہونے کے حق میں نہیں تھے، اس روایت کو وہ غیر مناسب سمجھتے تھے اور اشاروں کنایوں میں انھوں نے کہا بھی، لیکن کبھی کھل کر اس لیے نہیں کہا کہ کہیں دوسرے سینئر اساتذہ برا نہ مان جائیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تأمل نہیں کہ اجمل خان طبیہ کالج میں کئی اساتذہ ایسے تھے جو کلاس میں داخل ہونے کے بعد کبھی کبھار کم سے کم ایک منٹ تک خاموش کھڑے رہتے یہاں تک کہ سارے طلبہ بالرضاء و بالجبر کھڑے ہوجائیں، پھر ان کے چہرے پر ایک عجیب سی فاتحانہ مسکراہٹ چھا جاتی لیکن پروفیسر غفران احمد مرحوم کا اس سلسلے میں دیگر انداز تھا، آتے ہی فوراً ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے اور حاضری لینے لگتے، حاضری لیتے وقت ان کی گردن جھکی رہتی، لیکن آواز کو بھانپ لیتے، پیچھے کی بنچوں پر بیٹھے طلبہ کبھی کبھار پر اکسی لگاتے، عموماً استاذ محترم ان کو نہیں چھیڑتے، کئی بار حاضری کے بعد انھوں نے دبی زبان میں چند طلبہ کو متنبہ کیا کہ اس طرح کی غیر اخلاقی حرکت نہ کریں، لیکن نام لے کر کبھی بھی کسی کو کھڑا نہ کیا، وہ یقیناً ان طلبہ کو جانتے تھے جو اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ حرکت کرتے تھے۔ کلاس میں حاضری کے بعد وہ اِدھر اُدھر کی باتیں نہ کرتے بلکہ لکھوانا شروع کردیتے، درمیان میں کچھ چیزیں سمجھاتے بھی رہتے پھر خود ہی اس کی وضاحت کرتے، اکثر شروع میں سمجھ نہیں آتا تھا کہ استاذ محترم کیا لکھواتے ہیں اور کیا سمجھا رہے ہیں، آواز دھیمی رہتی تھی، آرام سے بولتے لیکن روانی اتنی کہ اچھے اچھے لکھنے والے بعض دفعہ پیچھے رہ جاتے۔ پری طب والوں کے لیے درمیان میں خالص عربی یا فارسی کی اصطلاح استعمال کرتے تو سائنس سے آنے والے طلبہ کے لیے جدید میڈیکل یا خالص انگریزی اصطلاح استعمال کرتے۔ ایک بار اخیر بینچ کے طلبہ نے شرارت کی، عربی اور انگریزی اصطلاحات کو مختلف طریقوں سے شرارتاً بولنے لگے۔ اس وقت پہلی بار استاذ محترم کے لہجے میں ہلکی تلخی سننے کو ملی، وہ بولے ''میں عربی، اردو اور انگریزی جس زبان میں کہو گے بلا تکلف لکھوا سکتا ہوں''۔ کلاس کے نوٹ وہ کتابوں سے نہیں لکھواتے بلکہ وہ صیدلہ کو عملی دوا سازی سمجھتے اور کلاس میں وہ کسی بھی موضوع کو اسی طرز پر لکھواتے، وہ نوٹ اس قسم کے ہوتے گویا محسوس ہوتا تھا کہ آنکھ بند کرکے ان کے سامنے فلم کی صورت میں مرحلہ وار دوا مختلف اسٹیج میں گزر رہی ہو، اور استاذ محترم اس کا مشاہدہ کرتے کرتے لکھوا رہے ہوں، اس دور میں عموماً ہم طلبہ ان باریکیوں کو نہیں سمجھ پاتے، کبھی کبھی لکھتے لکھتے بوریت محسوس ہوتی لیکن امتحان کی تیاری کے وقت اور پھر صیدلہ کے وائیوا کے دوران یہ باتیں دل کو چھو لیتیں، ہمارے جواب سے ممتحن کافی خوش ہوتا۔ بعد میں جب میرا داخلہ ایم ڈی، علم الادویہ میں ہوا، تو استاذ کی جتنی باتیں یاد تھی سب ریوائنڈ ہوتی گئیں اور ان کے مرحلے وار تو سیعی لیکچرز کی اہمیت کا اعتراف اور بھی زیادہ ہوتا گیا۔

این آئی یو ایم کی بستی میں

اجمل خان طبیہ کالج میں سیکنڈ پراف کے بعد استاذ محترم سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا، بس رسماً کبھی کبھار علیک سلیک ہوجاتا۔ طلبہ کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ

سے، دوسرے ان کی طبیعت میں کلاس کے دوران صرف تعلیم پر بات کرنے کی وجہ سے، اور ان کے مشکل سوالات (یہ صرف ہم لوگوں کی کم ذہانت تھی، جو ان سوالات کے لیے یہ اصطلاح بنائی تھی) کی وجہ سے اکثر طلبہ ان سے ملنے سے کتراتے تھے، میں بھی ان ہی طلبہ کی فہرست میں تھا، البتہ جب کبھی سیکنڈ پراف کے دوران کوئی سوال ذہن میں ابھرتا، یا کسی دوا کے تعلق سے پوچھنے کی نوبت آجاتی اور کتابوں میں اس کا خاطر خواہ جواب نہ ملتا تو میں ڈرتے ڈرتے ان کے چیمبر میں چلا جاتا، وہ تپاک سے اندر بلا لیتے اور خوشی خوشی اس کا جواب دیتے بلکہ اس سوال کے بعض ان زاویوں پر بھی بات کرتے جو میرے ذہن میں نہیں آتے تھے، اس وجہ سے ان کو میری شکل یاد رہی تھی۔

غالباً ۲۰۰۷ء کے آخری دنوں میں یہ خبر موصول ہوئی کہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن میں علم الادویہ میں پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ سے ڈاکٹر غفران صاحب کا تقرر ہوا ہے اور فی الحال وہ پانچ سالوں کے لیے جوائن کریں گے۔ ان دنوں شعبۂ علم الادویہ میں ڈاکٹر غلام الدین صوفی صاحب، ڈاکٹر نسرین جہاں میڈم، ڈاکٹر نجیب جہاں میڈم اور پروفیسر عبد الودود صاحب اپنی خدمات انجام دے رہے تھے، گرچہ ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر مستحسن علی جعفری صاحب کا نام بھی شامل تھا، لیکن این آئی یو ایم جیسے نونہال ادارہ کو سنبھالنے، استقامت عطا کرنے اور اس کو بلندیوں پر پہنچانے کے لیے وہ فکری اور عملی طور پر بحیثیت ڈائریکٹر مصروف رہتے تھے۔ جب استاذ محترم سے ان کے جوائن کرنے کے بعد، ہم سب کلاس فیلوز جن کا داخلہ کچھ مہینوں پہلے ہی ہوا تھا، ان کے چیمبر میں ملاقات کی غرض سے گئے، انھوں نے بہت پیار سے سب کو بٹھایا اور اپنے تعارف کے ساتھ ہم لوگوں کے نام پوچھے، تب مجھے دیکھ کر انھوں نے کہا کہ تمھاری شکل سے میں واقف ہوں۔ باتوں باتوں میں عاجزی کے ساتھ انھوں نے کہا کہ میرے پاس کوئی کتابوں کا سرمایہ نہیں ہے، بس چند ریسرچ پیپرز ہیں، جو معیاری ہونے کی وجہ سے میرے سلیکشن کا باعث بنے ہیں۔ شاید ہمارے کلاس فیلو میں کسی نے اس سے ملتا جلتا سوال کیا تھا۔ ان کے جواب میں عاجزی اور انکساری صاف چھلک رہی تھی، اور میں اس سوچ میں گم ہو گیا کہ آخر یہ چار، پانچ معیاری پیپر کس پائے کے ہوں گے کہ بڑی بڑی کتابوں کو تحریر کرنے والے نامور پروفیسر حضرات سے آگے نکل گئے۔

نئے دور کا آغاز

استاذ محترم کے این آئی یو ایم آنے کے بعد ادارے کے ماحول اور خود پروفیسر غفران صاحب دونوں میں، میں نے ایک نئے دور کا آغاز دیکھا۔ شعبۂ علم الادویہ میں جرنل کلب اور پریزنٹیشن کا ایک نیا انداز دیکھنے کو ملا، سائنٹفک پیپر کا پوسٹ مارٹم کیسے کیا جاتا ہے، اس میں موجود خوبیوں اور خامیوں کو کیسے جانچا جاتا ہے، ریسرچ پیپر کو لکھتے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے، استاذ محترم کے آنے کے بعد علم الادویہ کے طلبہ میں زیادہ باریک بینی سے یہ صلاحیتیں اجاگر ہوئیں، گرچہ اس سے پہلے بھی شعبہ میں اس کا رواج تھا، لیکن ان کی آمد کے بعد ان معلومات میں تکنیکی سطح پر کافی اضافہ ہوا۔ اس دور میں سارا این آئی یو ایم ایک کنبہ کی حیثیت رکھتا تھا، اور طلبہ یہاں تک کہ اساتذہ بھی ایک دوسرے کے ڈپارٹمنٹل جرنل کلب اور پریزنٹیشن میں آتے تھے۔ استاذ محترم کے آنے کے بعد وہ طلبہ جنھیں ریسرچ پیپرز لکھنے اور پرکھنے کا شوق تھا، بہت اہتمام سے حاضری لگاتے تھے اور اس بات کا اعتراف کرتے کہ یہاں بہت ساری ٹیکنیکل باتیں سیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

کچھ ہی مہینوں بعد استاد محترم کو اس وقت کے ڈائریکٹر پروفیسر مستحسن علی جعفری صاحب نے ڈپٹی ڈائریکٹر شپ کی اضافی ذمہ داری پر مامور کر دیا، گویا جعفری صاحب کے لیے ''موسیٰ کو بمثل ہارون'' سہارا مل گیا۔ حالانکہ ڈائریکٹر صاحب اس نئے ادارہ کے لیے دن رات محنت کرتے تھے، باہر کے معاملات وہ سنبھال لیا کرتے تھے، لیکن ماتحتین کی ناتجربہ کاری کے سبب بعض اندرونی معاملات بہتر نہیں تھے نیز طلبہ اور اسٹاف کے درمیان دوریاں بڑھتی جا رہی تھیں، باغبان کو محسوس ہوا کہ باغ اندرونی طور پر اضمحلال کا شکار ہوا جا رہا ہے، اس کی خوشبو دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سینچا ہوا گلستان اپنی امیج کھو دے لہٰذا انھوں نے اس کی شادابی کو برقرار رکھنے اور اسے قائم و دائم رکھنے کے

لیے استاذ محترم کا انتخاب کیا۔ یقیناً یہ پروفیسر مستحسن علی جعفری صاحب کا دوراندیشی بھرا فیصلہ تھا۔اس عہد میں موجود طلبہ، اساتذہ اور دیگر اسٹاف ممبران اس بات کے گواہ ہیں کہ کیسی آسانی سے لوگوں کی ضرورتیں تکمیل کو پہنچ جاتی تھیں اور ان کے مسائل حل ہوجایا کرتے تھے۔

استاذ محترم کے ڈپٹی ڈائریکٹرشپ کے اضافی عہدے کو سنبھالنے کے بعد علم الادویہ کے طلبہ کو پھر سے ایک بار قربانی دینی پڑی، پہلے ہی انھیں جعفری صاحب کی مصروفیات کی وجہ سے ان کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کرپانے کا موقع کم نصیب ہوتا تھا، اب ایک اور استاذ کو انتظامی امور کی مسند پر جلوہ افروز کردیا گیا۔ استاذ محترم کو اس چیز کا بڑا احساس تھا، وہ اکثر طلبہ سے عموماً اور ہمارے بیچ سے خصوصاً اس کا اظہار کرتے رہتے تھے، ہمارے بیچ سے ان کا خصوصی لگاؤ تھا، شاید این آئی یو ایم میں یہ ان کا پہلا بیچ تھا، یا اس بیچ سے دو طلبہ نے ان کی سرپرستی میں ایم ڈی کی یا پھر ہمارے بیچ کی مجموعی کارکردگی پر انھیں اطمینان تھا یا ہم طلبہ میں انھیں مستقبل کے بہترین اسکالرز نظر آرہے تھے، وجہ جو بھی رہی ہو، وہ ہمارے بیچ پر بہت اعتماد کرتے تھے، ہم لوگ بھی ان کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ بلاتکلف سوال کرتے، ڈسکشن کرتے اور اپنی الجھنوں کو سلجھاؤ کے مراحل تک لے آتے۔

اجمل خان طبیہ کالج میں جس غفران صاحب سے میں واقف تھا، وہ کم گو تھے، سوال پوچھتے تھے لیکن جواب کے لیے ہمیں تجسّس میں ڈالتے، سرسری سلام علیک کرتے، ہمیں لگتا تھا استاذ کے پاس علم کا ذخیرہ ہے لیکن دوسروں تک پہنچانے کا بہتر طریقہ ان کے پاس نہیں ہے، وہ تحقیقی سوالات، سائنٹفک انداز میں پوچھتے لیکن اس کا جواب نہیں دیتے۔ایک عجیب قسم کا تضاد تھا، جو طلبہ محسوس کرتے تھے۔ لیکن این آئی یو ایم میں غفران صاحب ایک نئے انداز میں سامنے آئے۔ وہ ملنسار ثابت ہوئے، چہرے پر بشاشت جھلکتی تھی، وہ اب جھجکتے نہیں، اپنی بات صاف اور واضح انداز میں کہتے، وہ طب کے ان گوشوں پر بھی اظہار خیال کرتے جن پر شاید ہی اجمل خان طبیہ کالج میں کھل کر بولتے ہوں گے، سارے طلبہ جو ان کو علی گڑھ سے جانتے تھے (لیکن میری طرح سرسری) وہ غفران صاحب کے اس نئے اور بہتر اوتار کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے، اور ان سب کی رائے پرانے غفران صاحب کے برعکس ہوجاتی۔

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی

ایسا نہیں ہے کہ این آئی یو ایم کی بستی میں آکر پروفیسر غفران صاحب کی ذہنی اور فکری صلاحیت یکلخت ارتقاء پذیر ہوگئی، بلکہ وہ بالقوۃ ان ساری صلاحیتوں کے مالک تھے لیکن علی گڑھ کے ماحول میں وہ جان بوجھ کر ایک خول میں بند رہنا پسند کرتے تھے اور اپنے افکار اور نظریات کی ترویج میں خود حائل رہتے۔ اس کا احساس مجھے بعد میں اس وقت ہوا جب وہ ایک بار مالیگاؤں دو تین دن کے لیے آئے۔ میں نے ان کے پاس ایک تفصیلی سوال نامہ جو صیدلہ اور مفردات کے تعلق سے تھا تحریری شکل میں ارسال کیا تھا، مصروفیات کی وجہ سے وہ ان کا جواب نہیں لکھ پائے، لیکن مالیگاؤں کے اس قیام کے دوران میں نے وہ سارے اشکالات ان کے روبرو رکھے اور انھوں نے اس میں اکثر کا تفصیلی جواب دیا۔ پھر خود ہی کہا کہ ان اشکالات کے علاوہ دیگر اس طرح کی متضاد باتوں کو میں نے اپنی آنے والی صیدلہ کی کتاب میں بھی ذکر کیا ہے، امید ہے صیدلہ کے تعلق سے تم کو نئے گوشے پڑھنے کو ملیں گے۔ ان کے مطابق اس کتاب کی ضخامت ۸۵۰/ سے زائد صفحات کی ہوگئی تھی اور کچھ دیگر حصوں پر مزید لکھنے کے بعد اسے اشاعت کے مرحلے سے گزارا جانا تھا۔ پھر عاجزی وانکساری کے ساتھ دھیمی آواز میں گویا ہوئے کہ اس کتاب میں بہت ساری ایسی چیزیں ہیں جو میرے اساتذہ کی آراء کے خلاف ہیں، اس کتاب کے مسودہ کو وہ نہ جانے کتنے سالوں سے لکھ رہے تھے، ہر وہ رائے یا نظریہ جو ان کے مطابق روایتی طب کے خلاف یا برعکس ہے، جس کی ترویج ان کے اکثر اساتذہ نے اپنی کتابوں میں کی ہے، ان کے رد میں جب تک قابل تسلیم ریفرنس نہیں ملتا وہ اس پر تنقید کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ اسی ضمن میں انھوں نے مجھ سے ایک واقعہ شیئر کیا کہ ہماری طب کی کتابوں میں جو تعریف قرابادین کی لکھی جاتی ہیں وہ صحیح نہیں ہے، اس کی صحیح تعریف کے لیے انھوں نے اپنی کتاب میں دو سطر لکھنے کے لیے پانچ مختلف ریسرچ پیپرز تلاش کیے، اور دو ریسرچ پیپر جو پرانے تھے

اورانٹرنیٹ پر موجود نہیں تھے اسے کسی باہری ملک سے اپنے کسی رشتے دار کے توسط سے ۴۰/دن کے انتظار کے بعد حاصل کیا، پھر ان کے حوالے کے ساتھ ڈرتے ڈرتے انھوں نے درست تعریف کو اپنی کتاب میں رقم کیا۔ مجھے مرحوم کا وہ چہرہ ابھی بھی یاد ہے، جس میں عاجزی و انکساری کے ساتھ اساتذہ کی رائے سے اختلاف کرنے پر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی گناہ میں مبتلا ہوگئے یا کسی بے ادبی کے شکار ہوئے۔ استاد مرحوم علی گڑھ کے روایتی فریضہ سینئر حضرات اور اساتذہ کی عزت کو لازمی سمجھتے، یہی وجہ ہے کہ وہ علی گڑھ کے ماحول میں کھل کر اپنی تحقیقات اور نظریات کو بیان کرنے سے ہچکچاتے تھے (یہ میری ذاتی رائے ہے جو میں نے محسوس کیا ہے، کیونکہ کئی بار انھوں نے اپنی رائے کو اسی طرز پر بیان کیا، جیسے لگ رہا ہو کہ اساتذہ سے اختلاف رائے بے ادبی ہو)۔

کنفیوژن یا چھٹی حس کی بیداری

علی گڑھ میں جب کلاس روم میں پڑھانے کے لیے آتے یا جب ہم صیدلہ کے پریکٹیکل میں جاتے تو کبھی کبھار استاد محترم اپنے مخصوص انداز میں یونانی طب کے حوالے سے متعدد سوالات پوچھتے یا اشکالات پر استفسار کرتے۔ معجون کے قوام میں کل ۲۰-۲۵ فیصد دوا ہوتی ہے، باقی فیصد قوام پر مشتمل ہے، کیا اتنی مقدار یعنی ۵-۷ گرام کی مقدار خوراک، جس میں دوا کی مقدار ڈیڑھ سے دو گرام سے زائد نہیں ہوگی، مریض کی شفاء کے لیے کافی ہوگی، جب کہ ان دواؤں کی انفرادی مقدار خوراک اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمارے یہاں مختلف قسم کی جڑی بوٹیوں میں مختلف اجزاء فراریہ ہوتے ہیں جن کا نقطۂ ابال الگ الگ ہوتا ہے، کچھ جڑی بوٹیوں کا ۶۵-۷۰ جب کہ کچھ کا نقطۂ ابال ۹۰ یا ۱۰۰/سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے، ایسے میں ۱۰۰/ڈگری پر مسلسل ۱۲-۱۵/منٹ تک جوش دینے سے ان میں موجود اجزاء فراریہ کہیں ضائع تو نہیں ہوجاتے۔ کبھی کبھی اس طرح کے سوالات ڈسکس کرتے اور جواب کے لیے ہمیں تجسّس میں ڈال دیتے، ہم ان کے سوالات کو سائنسی پہلو سے سوچتے تو آواز آتی بات تو ٹھیک ہے اور جب یونانی طب کے روایتی پہلو سے دیکھتے تو ایک طرح کی کشمکش میں مبتلا ہوجاتے۔ عجیب شخص ہے جو ہمیں کنفیوژ کر دیتا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہمیں ان سوالات واشکالات کی اہمیت کا احساس ہونے لگا، جب نباتی ادویہ کو دنیا میں ابھرنے والی نئے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا، اسٹینڈرڈائیزیشن (دوا کے معیاری ہونے) سے وابستہ نئے زاویوں سے لاتعداد تحقیقات سامنے آئیں، روایتی دواسازی میں جدید مشینری کا استعمال ہونے لگا، روایتی انداز کے بجائے دواؤں کی تیاری جدید انداز میں ہونے لگی، کیونکہ جہاں دواؤں کی کھپت زیادہ ہورہی تھی وہیں جی ایم پی سے وابستہ پیرامیٹرز کو پرکھنے اور عمل میں لانے پر زور دیا جانے لگا۔ غالباً یہ ساری وجوہات اور دیگر اسباب تھے، جنھیں استاذ محترم طلبہ میں آنے والے چیلنجز کی بیداری کے سلسلے میں اجاگر کرنا چاہتے تھے۔ گویا استاذ محترم ہمیں کنفیوژ نہیں کررہے تھے بلکہ ہمیں مستقبل کے لیے تیار کررہے تھے۔ اس کا احساس مجھے تب ہوا جب ان کے سوالات میں ایک دو کا جواب میں نے اپنے تئیں تلاش کیا اور اس کو لے کر ان کے چیمبر میں حاضر ہوا۔ وہ بڑے خوش ہوئے کہ کم سے کم کوشش تو کی گئی ہے، پھر بیٹھے بیٹھے انھوں نے سرسری کئی باتیں بتائیں۔ اسی طرح پھر پی جی میں آنے کے بعد جب ہمیں صیدلہ کے جدید اسباق پڑھاتے تو بہت سارے روایتی طریقوں پر کھل کر بات ہونے لگی۔

یقین محکم، عمل پیہم

ایسا نہیں تھا کہ استاد محترم کو طب کے روایتی انداز پر شک وشبہ تھا، بلکہ کشتہ سازی، تدبیر ادویہ کے طریقے اور دوا کی سمیت کو دور کرنے کے لیے جو تدبیریں طب کی قدیم روایتی کتب میں درج تھیں وغیرہ کو وہ سب سے بہتر مانتے تھے اور اس کے لیے جدید تحقیقات کی روشنی میں باضابطہ حوالوں کے ساتھ بات کرتے۔ وہ طبی حکماء کی قابلیت اور دوراندیشی سے ہمیں اس انداز سے واقف کراتے کہ ہم ان کی ذہانت اور خدمات پر عش عش کرتے۔ سچ یہ ہے انھوں نے ہم طلبہ کے اندر یونانی طب پر یقین کو محکم کیا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ دوسرے سائنسی شعبہ جات کے احباب جب کسی حوالے سے ہمارا مذاق اڑانے کی کوشش کرتے تو ہم اپنا بھرپور انداز میں دفاع کرنے پر قادر رہتے۔ استاذ محترم یونانی طب کو سائنس سمجھتے، اس کو

طلبہ کے درمیان اسی پہلو سے ابھارتے، طب کی نئی تحقیقات کو سامنے رکھ کر بات کرتے۔ وہ دواؤں کی مضرت ان کے نئے اثرات اور ان کی ہاف لائف ومقدار خوراک کو ازسرنو پرکھنے کے قائل تھے، ان کے مطابق نہ صرف ہربل ادویات کی کمپوزیشن میں تبدیلیاں آتی ہیں بلکہ انسانوں میں بھی کیمیکل لیول پر جدید طرز زندگی کی وجہ سے کافی تبدیلیاں دیکھنے کو ملی ہیں۔ طب کے اخلاط اربعہ اور ان کی ڈائریکشن میں بیماریوں کے تجزیہ وتشخیص میں جدید طب سے وہ کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرتے، ان کا ماننا تھا کہ مرض کی تشخیص، اصول علاج اور علاج میں ہمیں یونانی طبی فلاسفی کو ہی مقدم رکھنا چاہیے۔ اگر اس میں ہم نے جدید میڈیکل سائنس پر اعتماد کیا تو ہم اپنی انفرادیت کھودیں گے، دوسری اہم بات وہ اکثر کہتے کہ یونانی طب کے علاج کا اپروچ تکمیلی (ہالسٹک) ہے جب کہ جدید طب کا ریڈکشنزم ہے۔ وہ نہ صرف مذکورہ باتوں کے حوالے سے یونانی طب کو مضبوطی سے پکڑنے پر زور دیتے بلکہ دواؤں کے جدید ٹرینڈ، الکلائڈس، خصوصی اجزاء کو الگ کرکے ان کو بنیاد بنا کر یونانی طب کے اصول پر علاج معالجہ کرنے پر سخت تشویش کا اظہار کرتے۔ انھوں نے ایسی کئی مثالیں دیں کہ سالم دوا کے استعمال کرنے پر وہ مضر اثرات پیدا نہیں ہوتے جو ان کے اجزاء مؤثرہ کو نکالنے کے بعد مرتب ہوئے۔ اصل السوس، اذاراقی، اسرول پر ہونے والی جدید تحقیقات اس کا ثبوت ہیں۔ اسی طرح استاذ محترم اکثر کہا کرتے تھے کہ طب کی اولین کتابیں یا وہ کتابیں جو موجودہ دور میں ریفرنس شمار ہوتی ہیں، یعنی جو عربی اور فارسی زبان میں ہیں، کوشش یہ کرنی چاہیے کہ ان کو ان کے اصل مآخذ یا زبان میں پڑھا جائے، کئی بار اصل مصنف کچھ اور کہنا چاہتے ہیں اور ترجمہ یا ترجمانی کرتے وقت وہ کچھ اور ہوگیا (انھوں نے بتایا کہ کئی مثالیں انھوں نے نوٹ کرکے رکھی ہوئی ہیں) اور اس غلط ترجمانی کی وجہ سے آگے لوگوں نے ان ترجموں پر ہی تکیہ رکھا تو پھر بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ استاذ محترم کو یونانی طب پر یقین محکم تھا، اس کے ساتھ ساتھ وہ جدید انداز میں طب کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے عمل پیہم کی عملی مثال تھے۔

چند نصیحتیں

اجمل خان طبیہ کالج میں ۲۰۱۱ء یا ۲۰۱۲ء میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، استاذ محترم نے اس کے انعقاد میں بہت جاں فشانی کا مظاہرہ کیا۔ حسن اتفاق کہ مجھے بھی اس میں شامل ہونے کا موقع دستیاب ہوا۔ مصروفیت کے سبب ان سے تفصیلی ملاقات تو نہیں ہوسکی لیکن سرسری طور پر ان کی معیت میں کچھ وقت ضرور گزارنے کا موقع نصیب ہوا۔ اس مختصر وقت میں بھی آپ نے حسب موقع چند نصیحتوں سے نوازا۔ انھوں نے فرمایا کہ ''اردو میں وقتاً فوقتاً مضامین لکھا کرو اور اسے اردو کے یونانی مجلوں میں شائع کراؤ، اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ طب اور اردو سے تمھارا رشتہ استوار رہے گا، دوسرا جس موضوع پر تم نے ایم ڈی کی ہے اس موضوع سے وابستہ کم سے پانچ جرنلز کو ضرور سبسکرائب کرو تاکہ اس موضوع پر جدید تحقیقات تمھاری نظروں میں رہیں۔ یہ چیزیں مستقبل میں اکثر انٹرویوز میں تمھیں مدد پہنچائیں گیں، تیسرا یو جی سی سے منظور شدہ یا کم از کم کسی بھی باوثوق جرنل میں سال میں ایک، دو ریسرچ پیپر ضرور لکھا کرو، چاہے وہ ریویو ہی کیوں نہ ہو یہ آنے والے دنوں میں تمھیں مدد دے گا۔'' غور سے دیکھا جائے تو ان نصیحتوں میں آنے والے چیلنجز کا علاج تھا یا یوں کہیے کہ جاب اپارچونٹیز کے لیے نسخہ تجویز کیا گیا تھا۔

اپنے منصب کی پہچان

غالباً ہمارے سینئر میں کوئی اسٹیٹ بینک آف انڈیا ماگڑی روڈ کے لیے کسی ذاتی کام سے گئے تھے، ان دنوں تھیسس سے وابستہ کام بڑے زوروں پر تھا، کچھ پریکٹکلس باقی تھے، دو بجے کے آس پاس ان لوگوں کو انیمل ہاؤس میں جاکر باقی کام کرنا تھا، ہم لوگ سر کے چیمبر میں کلاس کے لیے بیٹھے تھے، ایک سینئر ساتھی کی آواز سن کر استاذ نے بلایا اور کام کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ چند ساتھی بینک گئے ہیں اور ابھی تک واپس نہیں آئے۔ استاذ محترم نے کہا جوں ہی آئیں مجھ سے ملنے کے لیے کہو۔ جب وہ واپس آئے تو انھوں نے بتایا کہ لمبی قطار اور بھیڑ کی وجہ سے تاخیر ہوگئی۔ استاذ محترم ان دنوں ڈپٹی ڈائریکٹر شپ کے

عہدے پر فائز تھے، انھوں نے طلبہ کو بٹھایا اور ایس بی آئی کے منیجر کو فون کیا اور بتایا ہر مہینے کم وبیش ۶۰-۶۵/لاکھ روپئے کی سیلری ہمارے انسٹی ٹیوٹ سے آپ کے بینک میں آتی ہے، اس کے باوجود بھی ہمارے طلبہ لائن میں لگتے ہیں، ان کی کلاسس چھوٹ جاتی ہیں، یا تو آئندہ ہمارے یہاں سے کوئی بھی آئے خصوصاً طلبہ، ان کا کام جلدی ہونا چاہیے یا پھر ہم اپنے اکاؤنٹ دوسرے کسی بینک میں شفٹ کردیں گے۔ یہ بات ہمارے سامنے ہوئی تھی، انھوں نے یقین دلایا کہ آج کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔ فون کاٹنے کے بعد، انھوں نے کہا کہ یہ صرف ایک دھمکی تھی، ورنہ میں کہاں اتنے سارے اکاؤنٹ ٹرانسفر کراتا پھروں گا۔ پھر انھوں نے ہمیں سمجھایا کہ ہمیں اپنے منصب کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس کے پاور کے بارے میں بھی معلوم ہونا چاہیے، اور اس پاور کا صحیح استعمال بھی ضروری ہے اس لیے جب بھی کوئی منصب ملے اس سے وابستہ ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس کے ڈوز اور ڈانٹس کو بھی معلوم کیا کرو، ایڈمنسٹریشن سے وابستہ یہ چھوٹا سا واقعہ اس چیز کے لیے کافی ہے کہ وہ طلبہ کے ٹائم اور وقت کو کتنی اہمیت دیتے تھے، اور کسی منصب سے وابستہ پاور کا صحیح استعمال کرنے سے کس طرح واقف تھے۔

علی گڑھ کے نادر پروفیسر

این آئی یو ایم میں ایک بار استاذ محترم نے مجھے بلایا، چیمبر میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ کھڑے کھڑے کاغذات جمع کررہے تھے اور ایک فائل میں سمیٹتے جارہے تھے، سمیٹنے کے بعد ایک لفافہ نکالا اور بڑی محبت سے بولے، ''شبیر تمھیں زحمت ہوگی، لیکن یہ کام ضروری کرنا ہے، آج اگر یہ ڈاک نہ گیا تو وقت مقررہ پر نہ پہنچ پائے گا، اس لیے یہ لفافہ کسی بھی صورت میں پوسٹ کرنا ہے، کیا کرپاؤ گے؟'' استاد تھے، ایچ او ڈی بھی تھے، ان سب کے علاوہ علی گڑھ کے ماحول میں رہے تھے، پھر بھی ایک معمولی کام کے لیے استاذ محترم کے لہجے میں نہ کوئی حکم تھا اور نہ کوئی دباؤ، بلکہ ایک طرح کی عاجزی تھی، ایک استدعا تھی سچ پوچھیں تو جیسے محسوس ہورہا تھا التماس کررہے ہوں۔ میں شرمندہ ہوا، زبان گنگ ہوگئی، میرے الفاظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔ ان کی کچھ ڈایریکٹر صاحب و دیگر عملے کے ساتھ ضروری میٹنگ تھی۔ میں نے لفافہ لیا اور سنکڈ کٹے میں جاکر پوسٹ کردیا۔ کچھ دنوں بعد اچانک میرے لیے سر کی جانب سے خصوصی بلاوا آیا، میں ڈر گیا، مجھے لگا کسی نے میری شکایت کی ہے، میں عموماً دوپہر کے کھانے کے بعد، علی گڑھ کے طرز پر (بری عادت کہیں یا اچھی) قیلولہ کا قائل تھا، اور کبھی کبھی قیلولہ لمبا ہوجاتا، پھر حاضری کے لیے تین سوا تین بجے کے بعد جاتا، ان دنوں دوپہر کے بعد ہمیں تھیسس سے وابستہ لٹریچر سروے کے لیے موقع دیا جاتا۔ جب میرے پاس خبر پہنچی کہ سر خاکسار کو یاد کررہے ہیں تو میں ڈرا، بہرحال سامنا کرنا تھا، ڈرتے ڈرتے چیمبر میں پہنچ گیا، اجازت طلب کی، تو سر پھر کاغذات کی ورق گردانی میں مصروف تھے، بٹھالیا کچھ وقفے کے بعد جیب سے سو روپے نکال کر کہا ''معذرت چاہتا ہوں، اس دن جلدی میں تھا، لفافہ دیتے وقت تمھیں پوسٹیج کے لیے پیسے دینا بھول گیا، یہ لے لو''۔ میں نے منع کیا تو محبت سے ڈانٹنے لگے، میں نے کہا ''سر یہ تو بہت زیادہ ہے، تیس روپے سے زائد نہیں لگے تھے'' بولے ''تمھارا کرایہ بھی لگا، وقت بھی، جو زائد رقم ہے وہ میری طرف سے رکھ لو، جوس وغیرہ پی لینا''۔ ہائے!! کہاں گئے ایسے لوگ جو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اس معاملے میں استاد محترم کا کردار علی گڑھ کے روایتی ماحول سے بالکل الگ تھا۔

جہانِ رنگ و بو میں کیا نہیں ہے
مگر کوئی، کہیں، تجھ سا نہیں ہے

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر

ڈاکٹر خالد اختر علیگ ☆

غالباً اپریل ۲۰۲۱ء کا دوسرا ہفتہ رہا ہوگا، میں وزارت آیوش، حکومت ہند کے تحت چلنے والے ایک پروجیکٹ میں بطور ریسرچ اسوشئیٹ (یونانی) لکھیم پور کھیری کے مضافات میں واقع ایک سی ایچ سی پر تعینات تھا، ایک شناسا کا فون آیا کہ میرے مربی ومحسن پروفیسر کوثر عثمان صاحب، شعبۂ میڈیسن، کنگ جارج میڈیکل یونیورسٹی، لکھنؤ کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر میں سکتہ میں آ گیا، سکتہ اس لیے کہ وہ بہت مشفق تھیں، اور اپنائیت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ ایک دن پروفیسر کوثر صاحب نے جب انھیں بتایا کہ میں غفران بھائی (پروفیسر غفران احمد صاحب) کا شاگرد ہوں، تو وہ پوچھنے لگیں غفران کیسے ٹیچر ہیں، میں نے جواب دیا ایکسیلنٹ، اور وہ بہت خوش ہوگئیں۔ پروفیسر غفران احمد، پروفیسر کوثر عثمان کے خالہ زاد بھائی کے ساتھ ان کے بہنوئی بھی تھے۔ بہر حال میں نے اگلے دن تعزیت کے لیے پروفیسر کوثر عثمان صاحب کو فون کیا تو تمام رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے بتایا کہ غفران بھائی کو کووڈ-۱۹ ہوگیا ہے اور وہ سخت علیل ہیں، انھیں جے این ایم سی ہسپتال میں داخل کرایا گیا ہے۔ مادر علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اس دوران نہ جانے کتنے برسرِ کار اور سبکدوش اساتذہ اس وبائی مرض کا شکار ہوکر راہی ملک عدم ہو چکے تھے، جن میں اکثریت نابغۂ روزگار شخصیات کی تھی۔ مگر شاید پروردگار عالم کو ان کا دنیاوی قیام اتنا ہی پسند تھا۔ استاذ محترم کی بیماری اور وہ بھی ایسی کہ جس نے پوری دنیا میں ایک کہرام مچا رکھا ہو، کے بارے میں جیسے ہی سنا تو دل دھک سے ہوگیا اور بے اختیار بارگاہ ایزدی میں شفاء کاملہ وعاجلہ کی دعا زبان سے نکلی اور چہرے کے سامنے ان کا نہایت سنجیدہ مگر مسکراہٹ لیے ہوئے چہرہ گردش کرنے لگا۔ اجمل خان طبیہ کالج کے فارغین کے وہاٹس ایپ گروپ سے استاد محترم کی صحت میں اتار چڑھاؤ کی خبریں ملتی رہیں، ایک دن معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت زیادہ بگڑ چکی ہے جس کی وجہ سے ان کے برادر نسبتی پروفیسر کوثر عثمان نے انھیں لکھنؤ بلوا کر کنگ جارج میڈیکل یونیورسٹی میں داخل کرا دیا، مگر کوئی افاقہ نہ ہوا، بالآخر ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء بروز جمعہ بمطابق ۱۷/رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ کو انھوں نے اپنی جان خالق کائنات کے سپرد کر دی اور اسی لکھنؤ میں ہی ان کی آخری آرام گاہ بن گئی جہاں سبکدوشی کے بعد وہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام گذارنا چاہتے تھے۔

باوقار شخصیت اور بہترین مدرس

استاذ محترم پروفیسر غفران احمد صاحب باوقار شخصیت کے مالک تھے، ہلکی خشخشی داڑھی رکھتے، قد لمبا تھا اور بدن چھریرا، جسمانی رنگت صاف تھی، آنکھیں مسکراتی ہوئی اور تبسم زیر لب رہتا، چہرہ پُر تپاک تھا مگر اس پر سنجیدگی کی ایک دبیز تہہ چڑھی رہتی، خوش لباس تو تھے ہی، خوش گفتار ہونے کے ساتھ خوش مذاق بھی تھے، شرم وحیا کا پیکر تھے، جب راستہ چلتے تو ان کا سر قدرے جھکا رہتا، سلام کا جواب بہت ہی مسکرا کر دیا کرتے۔ اسے بدقسمتی ہی کہا جائے گا کہ میرا ان سے ذاتی تعلق کبھی نہیں رہا، جو بھی رشتہ رہا وہ استاذ وشاگرد کا ہی تھا، مگر میرے لیے یہ بھی کم فخر کی بات نہیں تھی کہ وہ مجھے پہچانتے تھے۔ وہ بی یو ایم ایس کے سیکنڈ پروف میں علم الصیدلہ پڑھاتے تھے، جس میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ قدیم علم کو جدید سائنسی علم کے ساتھ اس طرح مربوط کرتے کہ میرے جیسا ادنیٰ طالب علم بھی اس مضمون کو بآسانی سمجھ جاتا، علم الصیدلہ کے ضمن میں ان کے کلاس لیکچر بہت اہمیت کے حامل تھے۔ ان لیکچروں میں وہ علم الصیدلہ کی دقیق باتوں کو بہت ہی سائنٹفک انداز میں پیش کیا کرتے تھے۔ دوران لیکچر وہ فرماتے تھے کہ میں جو کچھ بتا رہا ہوں وہ مروجہ کتابوں میں نہیں ملے گا، واقعتاً ایسا ہی ہوتا تھا۔ ان کا طریقِ درس بہت مؤثر اور سلیس ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے انھوں نے

☆ دارالسلام، E-449/151، عقب حسین آباد پولس چوکی، حسین آباد لکھنؤ-226003، اتر پردیش۔ Mob.No:9359724505، E-mail:mkahashmi.alig@gmail.com۔

طلبہ کے درمیان اہم مقام حاصل کرلیا تھا۔ وہ جب کلاس میں داخل ہوتے تو پوری کلاس میں ایک سناٹا چھا جاتا اور ہر طالب علم ہمہ تن گوش ہوکر ان کا لیکچر سماعت کرتا تھا۔ دوران لیکچر ان کا لہجہ بہت ہی سنجیدہ اور متانت بھرا رہتا، مگر آواز قدرے خفیف ہوتی، پیچھے کی صف میں بیٹھے ہوئے لوگ جن میں راقم الحروف بھی شامل ہے، اس بات کے شاکی رہتے کہ وہ بہت سارے نکات کو سن نہیں پائے۔ مگر آگے کی صفوں میں بیٹھنے والے احباب سے جب ان کے لیکچر کے نوٹس حاصل ہوجاتے تو وہ شکایت بھی رفع ہوجاتی۔ علی گڑھ سے فراغت کے بعد میں اپنے وطن لکھنؤ واپس آ گیا، کچھ عرصہ کے بعد پروفیسر کوثر عثمان نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیش کش کی جسے میں نے قبول کرلیا، اسی زمانے میں انھوں نے مجھے غفران احمد صاحب سے اپنے رشتہ کے بارے میں بتایا۔ جب تک میں ان کے ساتھ منسلک رہا، پروفیسر غفران احمد صاحب سے گاہے بگاہے ملاقات ہوتی رہی، وہ ان ملاقاتوں میں بڑی اپنائیت کے ساتھ ملتے اور دعاؤں سے نوازتے۔ میری ان سے آخری ملاقات غالباً جون ۲۰۱۶ء میں ہوئی تھی، اس کے بعد میں ملازمت کے لیے لکھیم پور کھیری چلا گیا، لیکن کوثر صاحب سے ان کے بارے میں معلوم ہوتا رہتا تھا۔

تحقیق کا اعتراف اور اعلیٰ عہدوں کی پیشکش

پروفیسر غفران احمد صاحب اجمل خان طبیہ کالج کے ان اساتذہ میں سے تھے جو خاموشی کے ساتھ تحقیق و تالیف میں لگے رہتے تھے۔ جن کی علمی سیادت و قابلیت کا ایک زمانہ معترف رہا ہے۔ وہ یونانی طب کو مقبول بنانے اور اسے سائنسی خطوط پر استوار کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے، جس کے لیے انھوں نے حکومت ہند کے کئی پروجیکٹ حاصل کیے جس میں یونانی ادویہ کی معیار بندی کرنا اور اس کو مؤثر بنانا، نیز یونانی ادویات کی افادیت کو مختلف امراض میں ثابت کرنے کے لیے ان کا جدید سائنسی معیار پر مطالعہ کرنا شامل تھا، جس میں انھیں کافی حد تک کامیابی حاصل ہوئی اور ان پروجیکٹوں کو بحسن خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ پروفیسر غفران احمد صاحب نے اپنے ۲۴ ربرس کے تدریسی اور تحقیقی سفر میں کافی تجربات کیے اور مختلف نوعیت کے کاموں کو انجام دیا، انھوں نے مختلف موضوعات پر تحقیقی کام کرنے والے ۳۸ رایم ڈی ریسرچ اسکالروں کی نگرانی کا فریضہ انجام دیا اور مختلف اداروں میں متعدد مقالات کے ممتحن رہے۔ اعلیٰ معیار کے قومی اور بین الاقوامی تحقیقی جریدوں میں ان کے کم وبیش سو سے زائد تحقیقی مقالے شائع ہوئے ہیں جن میں سے بعض مقالات کے امپیکٹ فیکٹر بہت زیادہ ہیں۔ دو چیپٹرس Springer میں شائع ہوئے ہیں۔ یوں تو ان کی زیادہ تر تحریریں انگریزی زبان میں ہوتی تھیں مگر اردو زبان میں بھی انھوں نے دو کتابیں لکھیں؛ ایک ''اوصاف دواسازی: ضمانت سے محاسبہ تک'' جو کہ شریف پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ سے شائع ہوئی تو دوسری کتاب ''اصول دواسازی'' جس کی طباعت ابھی زیرِ التوا ہے۔ اس کے علاوہ اندرونِ ملک اور باہری ممالک میں منعقد ہونے والی مختلف کانفرنسوں اور سیمیناروں میں بطور مندوب شریک ہوئے، اور بیشتر علمی نشستوں میں انھوں نے سائنٹفک اجلاس کی صدارت کرکے شعبہ اور یونیورسٹی کی بھرپور نمائندگی کی۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) کے ایک اہم پروجیکٹ ڈی آر ایس-۲ (DRS-II) کے کوآرڈینیٹر کا شرف بھی حاصل کیا۔ ان ہی سب خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند کی جانب سے انھیں این آئی یو ایم کے مستقل ڈائریکٹر شپ کی پیش کش ہوئی لیکن انھوں نے انکار کردیا۔ عالمی ادارۂ صحت (WHO) نے جنیوا میں آیوش ایکسپرٹ کے طور پر منسلک ہونے کی درخواست کی مگر اسے بھی انھوں نے منع کردیا۔ اسی طرح دیگر ممالک میں قائم کی جانے والی یونانی چیئر کے سربراہ کے طور پر خدمات انجام دینے کی درخواست کی گئی مگر انھوں نے اسے بھی نہایت خوش اسلوبی سے ٹال دیا۔ ان تمام مناصب و مراعات سے انکار کے پیچھے دراصل ان کی کچھ خانگی ذمہ داریاں تھیں جن کو وہ آخری سانسوں تک ادا کرنا چاہتے تھے، آخر ہوا بھی وہی۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ ذمہ داریوں سے فرار چاہتے تھے بلکہ ان پیشکش سے قبل اور بعد میں انھوں نے مختلف انتظامی ذمہ داریاں نبھائیں اور مختلف مناصب پر فائز بھی رہے۔

تعلیم اور ملازمت

پروفیسر غفران احمد ۲۵؍دسمبر ۱۹۶۴ء کو ضلع اعظم گڑھ میں ایک علمی اور مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد مسعود احمد صاحب مرحوم ایک سرکاری اسپتال میں فارماسسٹ تھے، وہ نہایت شریف النفس اور بہت خوش مزاج طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ غفران صاحب نے بھی اپنے والدین کی خواہشات کا پاس رکھا اور تمام امتحانات میں امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوتے رہے۔ انھوں نے جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ سے عالمیت کی سند حاصل کی، جہاں مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا عبدالحسیب اصلاحی، مولانا شبیر احمد اصلاحی، مولانا صغیر حسن اصلاحی اور مولانا نظام الدین اصلاحی جیسی عبقری اور نابغۂ روزگار شخصیات کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ جامعۃ الفلاح سے عالمیت کرنے کے بعد وہ علی گڑھ آ گئے، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۸۳ء میں بی اے (معاشیات) میں داخلہ لیا۔ مدرسے سے فارغ کسی طالب علم کے لیے بی اے میں معاشیات جیسے مضمون کا انتخاب کرنا بہت عزم و حوصلے کی بات تھی، کیوں کہ جدید درسگاہوں سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ بھی اس سے گھبراتے تھے۔ حالانکہ ان کے بعض ساتھی جنھوں نے یہ مضمون لیا تھا اسے بعد میں تبدیل کرلیا تھا، لیکن غفران صاحب نے بہت ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا، انگریزی اور ریاضی کا علم جو اس مضمون کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے، اس میں مہارت حاصل کی اور امتیازی نمبرات سے ۱۹۸۵ء میں معاشیات میں بی اے آنرس کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے معاشیات کے مضمون کو بہت دلجمعی سے پڑھا تھا اس لیے ملک کے معاشی مسائل پر ان کی گہری نظر رہتی تھی۔ ان کے والد محترم چاہتے تھے کہ وہ طب کے شعبے میں جائیں، اس لیے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے پری طب کے داخلہ کے لیے مقابلہ جاتی امتحان میں شریک ہوئے اور کامیابی حاصل کی، ۱۹۸۵ء ہی میں ان کا داخلہ اجمل خان طبیہ کالج میں ہوگیا۔ ۱۹۹۲ء میں بی یو ایم ایس کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور پھر یونانی طب میں پوسٹ گریجویٹ کورس میں داخلہ کے مقابلہ جاتی امتحان میں شریک ہوئے اور پہلی کوشش میں ہی ایم ڈی میں داخلہ لینے کے اہل ٹھہرے، انھوں نے علم الادویہ کا انتخاب کیا اور مختلف قلبی امراض میں زہرمہرہ اور دیگر مقوی اعضائے رئیسہ ادویہ کی افادیت پر تحقیق کی اور نہایت کامیابی کے ساتھ ۱۹۹۵ء میں ایم ڈی (علم الادویہ) کی ڈگری حاصل کی۔ دوران تعلیم انھوں نے پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، حکیم سید ایوب علی قاسمی، پروفیسر سعدالحسن آفاق، پروفیسر کنور محمد یوسف امین اور پروفیسر نعیم احمد خان صاحبان سے علمی استفادہ کیا۔ مطالعہ سے انھیں ہمیشہ شغف رہا، جب وہ بی یو ایم ایس کے طالب علم تھے اس دوران نصابی کتب کے علاوہ غیر نصابی کتابوں کا پابندی سے مطالعہ کیا کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ انھیں جہاں طب کے مضامین پر دسترس حاصل تھی وہیں دیگر مضامین پر بھی خاطر خواہ صلاحیت رکھتے تھے، چاہے وہ سیاست ہو یا معیشت، ادب ہو یا پھر سائنس، بیش تر علوم میں ان کی صلاحیت کے جوہر کھلتے تھے۔ ان کی تحریری صلاحیت بھی کمال درجہ کی تھی، زمانۂ طالب علمی سے ہی ان کے مضامین مختلف قومی اور بین الاقوامی جرائد میں شائع ہونے لگے تھے، انھوں نے ۱۹۹۰ء میں طبی سوسائٹی کی میگزین آئینۂ طب کے انگریزی سیکشن کی ادارت بھی کی تھی۔ ان کی ان ہی تمام صلاحیتوں کے سبب ہم عصر طلبہ ساتھیوں اور اساتذہ میں وہ کافی معروف ہوگئے تھے۔ اپنے مضمون میں مہارت کی وجہ سے ملک کے مختلف طبیہ کالجوں کی جانب سے انھیں لیکچررشپ کی پیشکش کی گئی۔ لیکن انھوں نے ۱۹۹۷ء میں اپنی مادر علمی، اجمل خان طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں مستقل استاد کی حیثیت سے تقرری کو ترجیح دی، انگریزی میں قدرت اور مضمون میں مہارت نے انھیں اپنے معاصر رفقاء کے درمیان امتیازی مقام دلا دیا تھا۔ ان کا مزاج محققانہ تھا، یونانی طب میں ان کی تحقیقی صلاحیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ طبیہ کالج میں لیکچرر رہتے ہوئے جب انھوں نے بنگلور میں واقع نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن (NIUM) میں پروفیسر کے عہدے کے لیے درخواست دی تو جنرل سلیکشن کمیٹی نے پروفیسر کے عہدے پر کام کرنے والے امیدواران کو چھوڑ کر اتفاق رائے سے انھیں پروفیسر منتخب کرلیا۔ جس کے بعد انھوں نے مختصر دورانیہ میں بنگلور میں بہت سارے یادگار کارنامے انجام دیے، انسٹی ٹیوٹ کے ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر اضافی طور پر فائز رہے اور شعبہ کی صدارت کی، اس کے علاوہ بہت ساری مقامی اور بیرونی کمیٹیوں کے ممبر بھی رہے، وہ ۲۰۰۷ء سے ۲۰۰۹ء تک ڈیپوٹیشن پر اس مرکزی ادارے میں اپنی خدمات انجام دے کر علی گڑھ واپس آ گئے۔ بنگلور میں قیام کے دوران ہی طبیہ کالج

میں ہونے والی سلیکشن کمیٹی میں ریڈر بنادیے گئے تھے، واپس آنے کے بعداسی عہدے پروہ اپنی خدمات انجام دینے لگے۔۲۰۱۲ء میں پروفیسر کے عہدے پران کی ترقی ہوئی اور۲۰۲۰ء میں تین برسوں کے لیے صدر شعبہ بنائے گئے۔ وہ اس شعبہ کی ترقی کے لیے کچھ کر پاتے کہ اس سے پہلے ہی موت نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

بیرون ملک یونانی کی اشاعت

یونانی طب میں ان کی تحقیقی صلاحیتوں کو نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی سراہا گیا، دوسرے ملکوں نے بھی ان کے ذریعہ یونانی طب کی اہم اور مفید معلومات سے استفادہ کیا۔انھوں نے عالمی سطح پر یونانی طب کی بہترین نمائندگی کی۔۲۰۱۷ء میں کولمبو(سری لنکا) میں یونانی طب کی اہمیت اوراس کے محفوظ کارگر طریقۂ علاج پرکلیدی خطبہ پیش کیا۔۲۰۱۹ء میں انھوں نے موریشس کے ایک ہفتہ کے دورے میں مختلف مقامات پرسماج کے ہرطبقہ،جن میں اسکول وکالج کے طلبہ و اساتذہ، میڈیکل پروفیشنلس ،حکومت کے اہلکار اورعوام وخواص سبھی شامل تھے، کے درمیان یونانی طریقۂ علاج پرگفتگو کی،جس سے وہاں پر یونانی طب کے سلسلے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں ختم ہوئیں اوراب وہاں اس کے لیے مثبت کوشش کی امید ہے۔اسی طرح البلاغ اکیڈمی،لندن کے زیر اہتمام یونانی طب پرایک لیکچر سیریز سے خطاب کیا، جوکہ لوگوں کوکافی پسند آیا اوران کے انداز تخاطب نے بہت متأثر کیا۔

ادارت واعزازات

پروفیسر غفران احمد صاحب نے بین الاقوامی جریدہ 'یونانی میڈیکس' میں بطور اسوشئیٹ ایڈیٹر،'سرلنکا جرنل آف انڈیجینس میڈیسن'،'ہپوکریٹک جرنل آف یونانی میڈیسن' اور'ترجمان طب' بنگلور کی مجلس مشاورت کے رکن اور'جرنل آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن'، بنگلور، کی مجلس نقد کے رکن کی حیثیت سے بھی اپنا تعاون پیش کیا۔ تدریس، تحقیق اور یونانی طب میں گراں قدر خدمات کے اعتراف میں انھیں بہت سارے اعزازات سے بھی نوازا گیا۔۲۰۱۴ء میں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز، نئی دہلی کے ذریعے انسٹی ٹیوشنل ایوارڈ ملا، تو ۲۰۱۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں بہترین یونانی اسکالر ایوارڈ دیا گیا۔ ۲۰۱۷ء میں وزارت آیوش، حکومت ہند کے ذریعہ یونانی طب میں ڈرگ ریسرچ زمرہ میں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ اور۲۰۱۸ء میں وزارت آیوش کے ذریعہ ہی یونانی ادویہ میں تحقیق کے لیے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اختتامیہ

استاذ محترم پروفیسر غفران احمد عمل سے عبارت تھے، وہ ہر چیز کو بہت پرفیکٹ انداز میں دیکھنا چاہتے تھے،جس کی جھلک ان کی پوری زندگی میں نظر آتی ہے۔ وہ یونانی طب کے دانشور اور مفکر تھے، بہترین مدرس اور مایہ ناز محقق تھے۔ ان کے اچانک انتقال سے یونانی طب میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا بھرپانا ناممکن ہے۔جب ہماری طب کوان جیسے محقق اور مدرس کی بہت ضرورت تھی اس وقت ان کا یوں چھوڑ کر چلے جانا دل کو اداس کررہا ہے۔ ؎

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مراجع ومصادر

۱- ڈاکٹر شمشاد عالم۔ طب یونانی کا سورج غروب ہوگیا۔ نئی دہلی: جریدہ حیات نو۔ جولائی۲۰۲۱ء۔

۲- پروفیسر محمد سمیع اختر فلاحی۔ تجھ سا کہیں کسے۔ نئی دہلی: جریدہ حیات نو۔ جولائی۲۰۲۱ء۔

۳- پروفیسر نعیم احمد خان۔ پروفیسر غفران احمد (۱۹۶۴ء-۲۰۲۱ء)۔ علی گڑھ: ماہنامہ تہذیب الاخلاق۔ جون- جولائی۲۰۲۱ء۔

۴- شمیم ارشاد اعظمی۔ اجمل خان طبیہ کالج کی صحافتی خدمات۔ مارچ ۲۰۱۸ء: اشاعت ۸۔ مضامین ڈاٹ کام۔

۵- https://api.amu.ac.in/storage//images/empcv/8904-1613646520.pdf

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

آہ! پروفیسر غفران احمد

ڈاکٹر جاوید احمد خان ☆ ڈاکٹر شگفتہ نکہت ☆☆

کووڈ-۱۹ نے پوری دنیا پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی ہے جس سے اکیسویں صدی کے فخریہ سائنسی ایجادات سے لیس اور علاج ومعالجہ کے اعلیٰ معیار سے مزین انسان بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکا۔ اس کے طفیل دنیا نے صحت عامہ کی ایسی پامالی اور انسانیت کی ایسی زبوں حالی کا مشاہدہ کیا کہ مانو قیامت برپا ہوگئی ہو۔ ایک عجیب قسم کی افراتفری اور تباہی نے پورے عالم کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا، ہر چہار جانب ہاہا کار کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ اموات کا ایک سیلاب تھا جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کم ہی ایسے افراد ہوں گے جن کے کسی عزیز، رشتہ دار یا قرابت دار کو اس وبا نے لقمۂ اجل نہ بنایا ہوگا۔ ہر علاقے، ہر مقام اور ہر شعبے میں سیکڑوں افراد پس ماندگان کو روتا بلکتا چھوڑ کر راہی عدم بن گئے۔ اس موذی وبا نے جہاں عام لوگوں کو اپنا نشانہ بنایا وہیں بے شمار علمی وادبی شخصیتوں کو بھی موت کے حصار میں داخل کر دیا۔ اسی دوران طبی دنیا سے وابستہ ایک عبقری شخصیت نے بھی زندگی سے دامن چھڑا کر داعی اجل کو لبیک کہا جس کو ہم اور آپ پروفیسر غفران احمد کے نام سے جانتے تھے۔ ان کی موت طبی دنیا کے لیے ایک بڑے سانحے سے کم نہیں ہے۔ یقینی طور پر ان کی وفات سے ہونے والے خلا کو بہت دنوں تک محسوس کیا جاتا رہے گا۔

پروفیسر غفران احمد (۱۹۶۴ء-۲۰۲۱ء) ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت تھی جو غرور اور بے جا شان وشوکت سے بالکل عاری تھی۔ وہ ہر کس وناکس سے یکساں برتاؤ کرتے، ان سے قلبی لگاؤ اور اپنائیت کا اظہار کرتے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے سرگرداں رہتے۔ قدرت نے ان کی شخصیت میں ایک عجیب قسم کا علمی رعب اور جلال رکھ چھوڑا تھا جس سے لوگوں کو باوقار طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ وہ خود اپنی شخصی خوبیوں سے واقف تھے، جس کا استعمال انھوں نے تدریسی اور انتظامی سرگرمیوں میں بڑی ہی دیانت داری سے کیا اور ایک ممتاز استاذ، ریسرچر اور منتظم کی حیثیت سے کافی عرصہ تک طبی دنیا پر فائز رہے۔

پروفیسر غفران صاحب کم وبیش ۲۱/سال تک اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے، یہاں انھوں نے تدریس وتحقیق اور انتظام و انصرام کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ دوران طالب علمی استاد محترم سے ہماری پہلی شناسائی بی یو ایم ایس سیکنڈ پروف میں ہوئی۔ آپ علم الصیدلہ کی تدریس کیا کرتے تھے۔ آپ نے اپنے ذوق وشوق اور محنت ولگن سے اس فن میں حد درجہ کمال حاصل کر لیا تھا۔ ان کا طریقۂ تدریس کسی حد تک معروضی لیکن دوسروں سے الگ تھا جس کی وجہ سے طلبہ کی دلچسپی برقرار رہتی تھی۔ دوران تدریس کسی بھی موضوع پر بڑی ہی شفافیت اور سلاست وروانی کے ساتھ محو گفتگو ہوتے۔ ان کے لہجے کی سبک روی اور انداز بیان اکثر اوقات دھیمے سروں میں بہتی ہوئی ندی کا احساس دلاتا۔

پروفیسر غفران احمد کا علمی مرتبہ دراصل ان کی تخلیقی وتحقیقی سرگرمیوں کے توسط سے قائم ہوتا ہے۔ ان کی کاوشیں زیادہ تر انگریزی زبانوں میں ریسرچ پیپرس کی شکل میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن انھوں نے اردو زبان میں بھی دو کتابیں اور کچھ مقالہ جات تحریر کیے ہیں جو طالبان طب کے لیے مشعل راہ سے کم نہیں ہیں۔ آپ کا انداز بیان بڑا نرالا تھا، جملے اکثر لمبے ہو جاتے تھے مگر نہ ربط وتسلسل میں کمی آتی تھی نہ کہیں عبارت میں جھول پیدا ہوتا تھا۔ ان کے مضامین میں عربی، فارسی اور انگریزی الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے مگر اس سے زور بیان میں کوئی کمی نہیں آتی۔ ذیل میں ان کی چند تحریروں سے کچھ اقتباس پیش کیے جا رہے ہیں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ مختلف زبانوں پر عبور کے ساتھ ساتھ، کس دلنشیں انداز میں الفاظ کا استعمال کرتے تھے، یہ تحریریں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا لفظوں کے موتی کو فکر

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ امراض اذن، انف وحلق، ☆☆ اسوشیئٹ پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ، محمدیہ طبیہ کالج، منصورہ، مالیگاؤں، ناسک، مہاراشٹر۔
☆ مسئول مقالہ E-mail:jvd.khan@gmail.com،Mob.No:8554042650

کی مالا میں پرو کر پیش کیا جا رہا ہو:

''طب کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ اس کے حاملین نے ہر زمانے اور ہر علاقے میں اپنے تجربے فہم اور وجدان کی روشنی میں دواؤں پر نئے تجربات کیے ہیں اور اپنے تجربات کو رقم بھی کیا ہے چنانچہ ادویہ کے سلسلے میں معلومات کا ایک ذخیرہ موجود ہے جن میں سے کچھ سے ہم فائدہ اٹھا سکے ہیں، باقی اب بھی ہماری توجہ کی مستحق ہیں۔ بعض کتب ایسی ہیں جو زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہونے کے سبب عام قاری تک نہیں پہنچ سکیں اور اپنے محتویات میں مفید معلومات کا عنصر رکھنے کے باوجود طالبانِ طب ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ طب کی بعض کتب جن کو امہات الکتب کا درجہ دیا جاتا ہے اور جو طبی نصاب کا جزءِ اعظم فراہم کرتی ہیں ان کی یہ خوبی ہے کہ انھوں نے طبی نظامِ تعلیم کے لائحہ عمل متعین کرنے میں معاونت کی ہے۔ لیکن ان کے اثرات نظامِ تعلیم و تدریس پر اتنے گہرے ہیں کہ بعض دیگر مفید معلومات کے ذخائر کو بھی یہ موقع نہ مل سکا کہ وہ معروف و مروّج دفتر معلومات میں اپنے لیے کوئی جگہ بنا پائیں۔ پھر بعد کے مصنفین اور مؤلفین نے امہات الکتب کی کلوننگ کر کے ان کے سلسلۂ جنبانی کو اس قدر دراز کیا کہ اس انبوہ میں بعض اچھی کتابیں اور مفید مخطوطے گم ہو گئے۔ ایسی کتب اور خاص طور سے مخطوطات کی بازیابی، ان کے تراجم اور تدوین بھی طبی سرمائے کی بقاء، اس کے Enrichment (ترقی و ترویج) کے لیے ضروری ہے۔''
(بحوالہ مفردات مسیحی۔۔)

حکیم محمد طیب صاحب کی زندگی پر لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''پروفیسر حکیم طیب صاحب نہ تو منہ میں چاندی کا چمچہ اور نہ ہی ہاتھ میں قلم لے کر پیدا ہوئے تھے، جو جادہ و منزل کی تعین میں ان کے لیے نقوش راہ ثابت ہوتے یا زندگی کا لائحہ عمل تیار کرنے میں ان کی معاونت کرتے، لیکن قدرت نے انھیں ایک درّاک ذہن جس میں Sharpness، Arrogance اور Confidence کی مساویانہ آمیزش تھی، کے اثاثہ سے ضرور سرفراز کیا تھا اور یہی عناصرِ ثلاثہ ان کی شخصیت کی تشکیل میں جزواعظم کے طور پر شامل رہے۔ انھیں عناصر کے زور سے انھوں نے اپنے لیے ایک ایسی روش متعین کی جو عام ڈگر سے ہٹی ہوئی لیکن درخشاں اور ممتاز تھی۔'' (بحوالہ رازیٔ ہند۔۔)

استادِ محترم جب لکھتے تھے تو بڑی ہی دیانت داری سے نفسِ مضمون کے ساتھ انصاف کیا کرتے تھے۔ چاہے وہ کوئی بھی شخصیت ہو اس سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ اس کے عکس کو بیان کر کے مضمون کے اندر ایک نئی چھاپ ڈالتے تھے جس کا اکثر نگارشات میں فقدان پایا جاتا ہے۔ حکیم طیب صاحب پر تحریر کردہ مقالے میں انھوں نے جو کچھ تحریر کیا، آپ بھی ملاحظہ کریں:

''طیب صاحب کے مطب و معالجہ سے شعبۂ علم الادویہ کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، البتہ ان کے تجربات سے دواخانہ طبیہ کالج نے ضرور فائدہ اٹھایا۔ دواخانہ بہت سی مصنوعات طیب صاحب کے ودیعت کیے ہوئے نسخوں پر تیار کرتا ہے، انھوں نے اس کے بعض نسخوں میں حذف و اضافہ بھی کیا ہے۔..... طیب صاحب نے دماغین کے نسخہ میں ضروری تبدیلی کی اور یہ دوا، اب جس نسخہ کے مطابق بنتی ہے وہ انھیں کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ دواخانہ کا انتظام و انصرام اکثر مرفوع القلم قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں رہا ہے جن کو نہ طب سے کوئی لگاؤ تھا نہ ہی دواخانہ کی ترقی سے کوئی دلچسپی، یہ لوگ طیب صاحب کے مجربات کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ ہی نہ سکے کہ اسے پیٹنٹ کراتے، مصنوعات کی تعمیم کرتے اور مالی منفعت حاصل کرتے، طیب صاحب کی خدمات کا یہ لوگ اعتراف بھی نہ کر سکے۔''

پروفیسر غفران احمد صاحب اصول و ضوابط کے بڑے ہی پابند تھے اور ان کی دلی چاہت تھی کہ ان کے طلبہ بھی انہیں کی طرح اصول و ضوابط کے پابند ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ سیکنڈ پروف میں ادویہ مرکبہ کے پریکٹیکل کے درمیان ''معجون ثعلب'' کی تیاری کے وقت (جو کہ آپ ہی کا ترتیب دیا ہوا تھا) فرمایا کہ یہ دوا کسی مریض کے لیے ہے آپ لوگ اس کو کھا کر چٹ نہ کر جائیں بلکہ اس کو اچھی طرح سے محفوظ کر لیں تا کہ اس تک آسانی سے رسائی ہو سکے۔ ہم طلبہ نے پریکٹیکل کے دوران اصرار کیا کہ اس مرکب کے بارے میں ہمیں تفصیلی معلومات فراہم کریں تو آپ نے کہا کہ کسی دوسرے دن اس کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوگی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آج کے دن جو چار طلبہ پریکٹیکل میں موجود ہیں انہیں کو بتاؤں گا لیکن چار سے تین یا چار سے پانچ ہوئے تو نہیں بتا سکتا کیوں کہ خیانت ہوگی اس لیے کہ جس نے پریکٹیکل کیا ہے یہ اس کا حق ہے اور جس نے نہیں کیا اس کا حق نہیں۔

استادِ محترم بظاہر بہت ہی کم گو اور خاموش طبیعت کے مالک تھے لیکن جب آپ کی تقرری ۲۰۰۷ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ کے طور پر ہوئی تو اس دوران ایک تقریب میں آپ کی تقریر سے آپ کے ظریفانہ مزاج کا انکشاف ہوا جس سے اکثر و بیشتر لوگ نابلد

تھے۔سر نے ڈائننگ ہال میں اپنے طلبہ کے ذریعہ کی گئی خدمات کے اعتراف میں کچھ یوں کہا کہ میرے دل میں یہ خیال بار بار آرہا تھا کہ پہلی مرتبہ رمضان المبارک کے دوران گھر اور بچوں سے دور رہنا ہوگا، پتہ نہیں کس حال سے دوچار ہونا پڑے گا کیوں کہ میں امور خانہ داری کے طرائق وضوابط سے بالکل نابلد تھا۔لیکن میں نے جب ڈائننگ ہال کو جوائن کیا تو خواب وخیال کے برعکس یہاں نہ صرف دسترخوان کی فروانی دیکھی بلکہ مجھے طلبہ کی لگن اور ان کی دلجوئی کے ساتھ ساتھ حنا کی حنائی، افروزہ کی افروزگی، شبنم کی شبنمی اور شگفتہ کی شگفتگی بھی میسر تھی۔

پروفیسر غفران صاحب ایک حلیم الطبع اور منکسر المزاج شخصیت کے حامل تھے۔انھیں کبھی بھی اپنی پوسٹ اور علم کا غرور نہیں تھا۔نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں قیام کے دوران ان کے رفقاء کار اور دوسرے شعبہ جات میں کام کرنے والے حضرات آپ کے ساتھ بتائے ہوئے دنوں کو یاد کرتے ہوئے کفِ افسوس ملتے ہوئے اکثر روہانسے ہوجاتے ہیں کہ کینٹین میں دوپہر کا کھانا کھانے کے دوران جب استادمحترم آتے تو ان کی پوسٹ اور رتبہ کو دیکھتے ہوئے لوگ کنارہ کشی اختیار کرنے لگتے لیکن آپ خود ہی ان کے ساتھ بیٹھ کر نہ صرف کھانا تناول فرماتے بلکہ اکثر غمگین دلوں کی دلجوئی کرتے نظر آتے۔

استادمحترم ہمیشہ اپنے طلبہ کا بے حد خیال رکھتے تھے خصوصاً تعلیمی سرگرمیوں میں ان کے شانہ بشانہ ہوتے۔این آئی یو ایم میں طلبہ کی کثیر تعداد اپنی ریسرچ کے تعلق سے بلاتفریق شعبہ آپ سے رہنمائی کی طالب ہوتی اور آپ نے اپنی مشغولیت کے باوجود کبھی کسی کو محروم نہیں کیا بلکہ دلجوئی کے ساتھ اس کی رہنمائی کی۔حقیر کو ایم ڈی کے دوران ایک دن اپنے چیمبر میں بلا کر فرمایا کہ سب اپنی اپنی تھیسس لے کر آتے ہیں تم کیوں نہیں لاتے کسی قسم کی کوئی پریشانی تو نہیں؟ تو میں نے ان کی مشغولیت اور اپنی کم علمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ استادمحترم غلام الدین صوفی صاحب اور تنزیل احمد صاحب کو دکھاتا ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ہی ہوجائے گا۔

پروفیسر غفران احمد صاحب کی زندگی علمی خیانت داری سے بالکل عاری تھی۔حقیر نے امراض چشم پر مشتمل مخطوطہ ''رسالۂ اجمل واکمل'' تصنیف مرزا باقر محمود کے ترجمہ کی اصلاح کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضری لگائی تو آپ نے نہ صرف مفید مشوروں سے نوازا بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی۔استادمحترم نے ایک دن کہا جاوید اگر تمھیں اعتراض نہ ہو تو میں امراض چشم میں دواؤں کے استعمال کرنے کے طرائق کو اپنی آنے والی کتاب میں شامل کروں کیوں کہ اس طرح کے مواد دوسری کتابوں میں موجود نہیں ہیں۔

تصنیف وتالیف اور تراجم کے توسط سے ہمارا استادمحترم سے ایک گہرا تعلق تھا۔آپ کی طرف سے یہ خصوصی رعایت حاصل تھی کہ شب وروز کے کسی بھی وقت تبادلۂ خیال کرسکتے ہیں۔ان کی اس حوصلہ افزائی اور کرم نوازی سے مجھے کافی فائدہ ملا۔جب آپ سے ملاقات ہوتی اور میں دوران انٹرویو تصنیف وتالیف کو درکنار کیے جانے کا شکوہ کرتا تو بڑے مشفقانہ انداز میں سمجھاتے کہ ٹھیک ہے آج لوگ نہیں دیکھ رہے ہیں لیکن ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ لوگ تمھارے کاموں کو دیکھیں گے، حوصلہ مت ہارو بلکہ موقع کو غنیمت جانو اور یکسوئی ودلجمعی سے اپنا کام کرتے چلے جاؤ ان شاء اللہ تعالیٰ کامیابی ضرور بالضرور ملے گی۔کووڈ-۱۹ کے ابتدائی دور میں جب کالج کی ڈیوٹی سے فراغت ملی تو وقت کی فراوانی کو دیکھتے ہوئے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ادویہ مفردہ پر ایک ایسی کتاب لکھی جائے جو نہ صرف نصابی ضرورتوں کو پورا کرتی ہو بلکہ ان پر کیے گئے کلینکی اور تجرباتی مشاہدات (Clinical and Experimental Studies) کو بھی اجاگر کرتی ہو۔اہلیہ سے مختلف امور پر غور وخوض کے بعد استادمحترم کے سامنے اپنے مدعا کو رکھا اور ان سے مزید رہنمائی کا طلبگار ہوا تو آپ نے بڑی ہی دلچسپی کے ساتھ ہماری باتوں کو سنا اور پُرتپاک اور جوشیلے انداز میں اس کام کو بلاتاخیر شروع کرنے کی ہدایت دی اور فرمایا کہ پہلے کم سے کم دو دواؤں کو لکھ کر ہمیں واٹس اپ کرو اس کے بعد میں مزید نکات پر توجہ دلاؤں گا۔استادمحترم کے حکم کے مطابق ہم نے ویسا ہی کیا آپ نے نہ صرف مختلف تبدیلیوں کے ساتھ پورے طور پر لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی بلکہ اس میں چار چاند لگادیے۔ہم نے موقع کو غنیمت جانا اور بڑی ہی مستعدی اور سرعت کے ساتھ اس کو تکمیل تک پہنچایا۔آج وہ کتاب منصۂ شہود پر ہے لیکن افسوس صد افسوس! کہ وہ سایہ دار درخت اب ہمارے درمیان نہیں جس کی شفقتوں اور علمی حلاوتوں سے ہم اپنے دلوں کو سکون بہم پہنچاتے تھے۔علم کے متلاشی بے آب وگیاہ سرگرداں ہیں لیکن استادمحترم جیسا مربی فی الحال میسر نہیں جو ان کی پیاس کو بجھا کر منزل مقصود تک پہنچا سکے۔

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

پروفیسر غفران احمد
طبی دنیا کا ایک سنجیدہ اور مخلص طبیب

ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی ☆

پچھلے برس 'کووڈ-۱۹' کی دوسری لہر کے دوران صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ پورا ہندستان بہت زیادہ متأثر ہوا۔ یہ بڑی ہولناکی کے دن تھے، یہاں تک کہ مسلم یونیورسٹی کیمپس اور اس کے اردگرد محلوں میں ایک ہؤ کا عالم تھا۔ اس دوران اس موذی مرض سے ایک بڑی تعداد میں یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات کے اساتذہ اور غیر تدریسی ملازمین بھی متأثر ہوئے اور ہماری یونیورسٹی ۵۰ سے زائد موجودہ اور سبکدوش اساتذہ اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں غیر تدریسی ملازمین سے محروم ہوگئی۔ ایک تعلیمی ادارہ کے لیے اتنی بڑی تعداد میں اساتذہ کا گزر جانا علمی اور اکیڈمک طور پر بہت بڑا نقصان تھا۔ جس سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعلیمی، تدریسی، تحقیقی، علمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں خلا پیدا ہوگیا۔

کورونا کی اس دوسری لہر نے جن عظیم اساتذہ اور قریبی لوگوں کو ہم سے جدا کیا ان میں سے ایک اجمل خان طبیہ کالج کے ہر دلعزیز استاد پروفیسر غفران احمد فلاحی بھی تھے جو ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء کو ہم سب کو داغ مفارقت دے کر اس دنیائے فانی سے ہمیشہ ہمیش کے لیے رخصت ہوگئے۔ غفران صاحب اپریل کے دوسرے ہفتے میں کووڈ سے متأثر ہوئے تھے جس کے بعد انھیں مستقل بخار آتا رہا۔ ۲۳/اپریل کو ان کو آکسیجن کی کمی کی وجہ سے جواہر لعل نہرو میڈکل کالج علی گڑھ میں داخل کیا گیا جہاں انھیں آئیسولیشن وراڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ جس کے بعد سے مرض کی شدت میں کمی کے بجائے ہر دن اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ۲۶/اپریل کو یہ خبر آئی کہ ان کے برادر نسبتی پروفیسر کوثر عثمان، جو کہ کے جی ایم یو لکھنؤ میں شعبۂ میڈیسن میں سینئر استاد ہیں، نے ان کو بہتر علاج کے لیے ایمبولینس سے لکھنؤ شفٹ کیا ہے۔ لیکن لکھنؤ جا کر بھی ان کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آئی اور ان کو وینٹی لیٹر پر منتقل کر دیا گیا جہاں سے ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء بمطابق ۱۷/رمضان ۱۴۴۳ھ کو وہ ہولناک خبر بھی موصول ہوئی کہ دوران علاج ان کا انتقال ہوگیا۔ اجمل خان طبیہ کالج کے لیے یہ ایک عظیم سانحہ تھا، جب اس نے اپنا ایک مخلص اور سنجیدہ استاد کھو دیا۔ انتقال کے وقت استاد محترم کی عمر ۵۶/برس تھی۔ اس موقع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ پروفیسر طارق منصور نے اپنے تعزیتی پیغام میں ان کے انتقال پر شدید رنج وغم کا اظہار کیا اور اپنا بڑا ذاتی نقصان بتایا، نیز ان کے ان حالات میں رخصت ہوجانے کو نہ صرف یونانی طب بلکہ پوری یونیورسٹی کا ایک بڑا علمی نقصان بتایا۔ شیخ الجامعہ نے ان کو یونانی طب کی وہ نمائندہ شخصیت بتایا جو ہر بل میڈیسن میں اپنے علمی وتحقیقی کاموں کی وجہ سے پہچانی جاتی تھی۔ ان کے انتقال پر طبی دنیا کی اہم شخصیات نے اپنے تعزیتی پیغام ارسال کیے۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، اعزازی خازن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اس غمناک موقع پر کہا:

> ''پروفیسر غفران کا اچانک انتقال بہت ہی تکلیف دہ ہے، یہ ایک ایسا غم ہے کہ آسانی سے بھلایا نہیں جاسکتا۔ پروفیسر غفران چونکہ میرے شاگرد تھے لہٰذا ان سے میرا ذاتی لگاؤ تھا۔ میں بہت قریب سے انہیں جانتا تھا وہ ایک انتہائی پڑھے لکھے اور قابل شخص تھے ان کے چلے جانے سے یونانی طب میں اور خصوصاً شعبہ میں ناتلافی خلا پیدا ہوگیا ہے۔ ان کی ابھی سسٹم

☆ شعبۂ ترسیل عامہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش۔ Mob.No:9412595891، Email:asadfaisalmau@gmail.com۔

کوضرورت تھی۔ان کے انتقال سے پوری طبی برادری ایک ممتاز محقق اور استاد سے محروم ہوگئی ہے۔''

ان کے زمانۂ طالب علمی کے دوست اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے استاد پروفیسر سمیع اختر اپنے ایک تعزیتی مضمون میں اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے یوں تحریر کرتے ہیں:

''یقین نہیں آتا کہ اب ہماری بے تکلف ملاقاتیں، پرلطف باتیں محض یادیں بن کر رہ جائیں گی۔ ابھی بھی جب کبھی ان کا خیال آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے ان کی باوقار شخصیت اور مسکراتا چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ وہ اپنے عزم وحوصلہ کے حامل ایک باکردار اور وفاشعار انسان تھے۔''

غفران صاحب سے میری آخری ملاقات کووڈ کی وبا پھیلنے سے چند ماہ قبل ۲۰۱۹ء میں ہوئی تھی۔ یہ موقع تھا جب حکومت کی سائنسی فروغ کی ایجنسی ''وگیان پرسار''، نئی دہلی کی ایک میٹنگ علی گڑھ میں ہوٹل سٹی شیف میں ڈاکٹر عبدالمعز شمس کی کوششوں سے منعقد ہوئی۔ دراصل وگیان پرسار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور انجمن فروغ سائنس کے اشتراک سے اردو میں فروغ سائنس کی ایک ورکشاپ منعقد کرنا چاہتی تھی۔ اس سلسلہ میں اس کے عہدہ داروں نے انجمن فروغ سائنس، علی گڑھ کو یہ ذمہ داری عطا کی کہ وہ مرکز فروغ سائنس علی گڑھ کے ساتھ ایک میٹنگ منعقد کروائے۔ اس میٹنگ کے لیے ڈاکٹر عبدالمعز شمس صاحب نے پہل کی اور مرکز فروغ سائنس کے ڈائریکٹر نسیم احمد صاحب (شعبۂ کیمیکل انجینئرنگ) اور مرکز کے دیگر عہدیداران کو اس میں مدعو کیا جس میں غفران صاحب جو اس وقت مرکز کے ڈپٹی ڈائریکٹر تھے وہ بھی شامل ہوئے۔ میٹنگ بڑی کامیاب رہی اور یہ طے پایا کہ اس پروگرام کا ایک مکمل خاکہ تیار کرکے اس کے بعد ورکشاپ کا انعقاد کیا جائے گا۔ میٹنگ کے دوران ورکشاپ سے متعلق انھوں نے چند مشورے بھی دئے۔ یہ غفران صاحب سے ایک مختصر ملاقات تھی لیکن اس میٹنگ کے بعد انھوں نے میری سائنسی فروغ کی کوششوں کو سراہا اور اس سلسلہ میں تہذیب الاخلاق میں شائع میرے مضامین کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔ اس میٹنگ کے بعد کووڈ کی ہولناکیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو وہ تقریباً دو برس جاری رہا اور جس کی زد میں وہ بھی آگئے۔

پروفیسر غفران احمد سے میرا تعلق استاد اور شاگرد کا تھا، انھوں نے راقم الحروف کو ۲۰۰۵ء میں علم الصیدلہ کا مضمون پڑھایا تھا۔ وہ فطرتاً شرمیلے، نہایت سنجیدہ اور کم گو انسان تھے اور فلسفیانہ مزاج رکھتے تھے، لیکن جب بھی کوئی علمی وطبی موضوع پر گفتگو میں شامل ہوتے تو اس کے ہر نکتے پر مدلل روشنی ڈالتے۔ جس سے موضوع پر ان کی گرفت اور ان کے وسیع مطالعہ کا اندازہ ہوجاتا۔ پروفیسر غفران کو راقم نے ہمیشہ سر جھکا کر چلتے دیکھا، چاہے وہ کلاس لینے آرہے ہوں یا پھر کسی میٹنگ میں شرکت کرنے جارہے ہوں۔ سلام کرنے پر جواب دیتے لیکن نظریں ہمیشہ نیچی ہی رہتیں۔ غفران سر کے نزدیک ان کے تمام طلبہ یکساں تھے اور وہ اپنے شاگردوں سے ہمیشہ شفقت سے پیش آتے، لیکن اگر طالب علم ان کے سبجیکٹ میں ذرا سی بھی کوتاہی کرتا تو وہ نہ صرف اس سے سختی سے پیش آتے بلکہ اس کو سمجھانے کی بھی کوشش کرتے۔ وہ ہمیشہ وقت کی پابندی کا خیال کرتے اور مقررہ وقت پر کلاس لینے آجاتے، پورے مضمون کو بڑی تفصیل سے پڑھاتے اور ایک ایک اصطلاح کو اس طرح سمجھاتے کہ طلبہ اس سے پوری طرح استفادہ کرسکیں۔

راقم نے جب ۲۰۰۴ء میں طبیہ کالج کی میگزین کا پلیٹینم جوبلی نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا تو ان سے مشورے کے لیے کئی بار ملاقات ہوئی کیونکہ وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں طبیہ کالج میگزین کو ایڈٹ کرچکے تھے اس لیے ہر موقع پر ان سے میگزین سے متعلق بہتر صلاح ملی۔ طبیہ کالج سے ۲۰۰۷ء میں تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد راقم الحروف ماس کمیونی کیشن کی تعلیم کی طرف رجوع ہوگیا اور اس دوران طبیہ کالج کے اساتذہ سے بھی کم ہی ملاقات ہوپاتی، لیکن آتے جاتے جب کبھی بھی غفران سر سے ملاقات ہوتی تو بڑی خندہ پیشانی اور محبت سے ملتے۔

اس کے علاوہ راقم الحروف کو پی ایچ ڈی کے دوران ان سے ایک اور

ملاقات یاد آتی ہے جب پروفیسر یوسف امین صاحب، شعبۂ علم الادویہ اور شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے ریسرچ میتھڈولوجی ایک ملٹی ڈسپلینری ورکشاپ کا انعقاد ۲۰۱۷ء میں کیا۔ راقم الحروف کو بھی اس ورکشاپ میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہونے کا موقع ملا، غفران سر اس ورکشاپ کے کوآرڈینیٹر تھے اس دوران ان سے کئی بار ملاقات ہوئی اور بار ہا ان کے لیکچرس سننے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر غفران احمد کا تعلق اتر پردیش کے مردم خیز شہر اعظم گڑھ کے ایک علمی اور دیندار گھرانے سے تھا۔ وہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۶۴ء کو محمد آباد گوہنا، اعظم گڑھ میں مسعود احمد صاحب کے یہاں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سرکاری اسپتال میں فارماسسٹ اور جماعت اسلامی کے کارکن تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی تھی۔ غفران صاحب نے اپنی تعلیم کا آغاز جامعۃ الفلاح سے کیا جہاں سے انھوں نے ۱۹۸۱ء میں مولوی کا امتحان جو کہ ہائی اسکول کے مساوی ہوتا ہے درجہ اول میں پاس کیا۔ جامعۃ الفلاح سے ہی انھوں نے ۱۹۸۳ء میں عالمیت کا امتحان پاس کیا جو کہ انٹر کے مساوی ہوتا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اسی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قصد کیا جہاں ان کا داخلہ بی اے اکنامکس (معاشیات) میں ہوگیا۔ ۱۹۸۵ء میں انھوں نے بڑی محنت سے معاشیات بی اے آنرس کا امتحان اول پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ یہ ایک مدرسہ کے طالب علم کے لیے بڑی بات تھی۔ اس دوران ان کا رجحان طب کی تعلیم کی طرف ہوگیا اور انھوں نے اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں داخلہ لے لیا، ۱۹۹۲ء میں بی یو ایم ایس کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۹۵ء میں انھوں نے اجمل خان طبیہ کالج سے ہی ایم ڈی علم الادویہ کی ڈگری حاصل کی۔ دوران طالب علمی آپ کی رہائش وقار الملک ہال کے جوبلی ہوسٹل میں رہی۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی ڈاکٹر غفران صاحب یونیورسٹی کی علمی، ادبی وثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے، انھوں نے ۱۹۹۰ء میں وقار الملک ہال کی میگزین ''وقار'' کی ادارت بڑی خوش اسلوبی سے انجام دی نیز اسی سال وہ اجمل خان طبیہ کالج کے علمی مجلّہ ''آئینہ طب'' کی ادارت پر بھی فائز ہوئے اور بڑی کامیابی کے ساتھ اس کو شائع کیا۔

طب کی اعلیٰ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۹۷ء میں ان کا تقرر اجمل خان طبیہ کالج کے شعبۂ علم الادویہ میں لیکچرر کے عہدے پر ہوگیا۔ اس طرح سے ڈاکٹر غفران احمد کا درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ ۲۰۰۶ء تک بحیثیت لیکچرر علم الصیدلہ کی درس وتدریس میں مشغول رہے۔ ۲۰۰۷ء سے ۲۰۰۹ء تک وہ ریڈر اور اسوشیئٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ ۲۰۰۷ء میں ان کا تقرر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں پروفیسر کے عہدے پر ہوگیا جہاں انھوں نے ۲۰۰۹ء تک نہ صرف اپنی تدریسی خدمات پیش کیں بلکہ وہ صدر شعبہ کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ لیکن وہ ۲۰۰۹ء میں اپنے مادر علمی کی خدمت کے جذبہ کے تحت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی واپس آگئے اور انھوں نے شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج میں بحیثیت اسوشیئٹ پروفیسر پھر سے جوائن کرلیا۔ جنوری ۲۰۱۲ء میں علی گڑھ میں ان کو پروفیسر کا عہدہ حاصل ہوا۔

پروفیسر غفران احمد نے تقریباً ۲۵ر برس درس وتدریس کی خدمات انجام دیں، وہ طب کی تحقیقی دنیا میں اپنے معاصرین کے درمیان ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ یونانی طب میں جدید سائنسی طریقہ کار پر مستعمل تحقیق پر وہ کافی زور دیتے۔ اس سلسلہ میں مغربی طب میں ہونے والی عصری تحقیق پر بھی وہ گہری نظر رکھتے۔ علمی تحقیق کی اس روش کو پروان چڑھانے میں دراصل ان کے مشفق اساتذہ؛ پروفیسر یوسف امین صاحب اور پرفیسر نعیم احمد خان صاحب کا بھی اہم کردار رہا تھا، جنھوں نے ان کی تربیت اور سرپرستی بہت خوبی سے کی جس کا ذکر وہ اکثر اپنے طالب علموں سے کیا کرتے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے استاد تھے بلکہ ایک اچھے منتظم بھی تھے۔ اپنے پوری تدریسی زندگی میں انھوں نے ۳۴ر ایم ڈی کی تھیسس کو سپروائز کیا۔ ان کے طلبہ ہمیشہ ان سے خوش رہتے۔ اس کے علاوہ کئی اہم یونانی طبی جرنل کے ادارتی اور مشاورتی بورڈ میں بھی شامل رہے۔ جن میں سری لنکا جرنل آف انٹیگریٹیو میڈیسن، ہپوکریٹک جرنل آف یونانی میڈیسن، نئی دہلی، ترجمانِ طب، بنگلور، جرنل آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن، بنگلور وغیرہ ممتاز طبی وتحقیقی جرنل

شامل تھے۔اس کے علاوہ وہ شعبۂ کلیات سے شائع ہونے والے طبی جرنل یونانی میڈیکس کے بائب مدیر کے عہدے پر بھی فائز رہے، نیز انھوں نے یونانی میڈیسن اور علم الادویہ سے متعلق کئی اہم قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت کی اور ۳۰ سے زائد علمی مقالے پیش کیے۔اس کے علاوہ دس سے زائد یونانی تعلیم کے سلسلہ میں منعقد قومی اور بین الاقوامی علمی ورکشاپوں میں شرکت کی۔انتقال سے ۹/ماہ قبل ۱۶/نومبر ۲۰۲۰ء میں وہ شعبۂ علم الادویہ کے صدر کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن ان کی زندگی نے وفا نہیں کی۔غفران صاحب کی علمی خدمات کو قومی اور بین الاقوامی طور پر سراہتے ہوئے ان کو کئی ایوراڈ سے بھی نوازا گیا۔۲۰۱۴ء میں ایمس، دہلی میں بین الاقوامی طبی کانفرنس میں ان کے مقالہ کو روایتی طریقۂ علاج کے زمرے میں بیسٹ پیپر ایوارڈ دیا گیا۔۲۰۱۶ء میں آئی ایچ ایف ایس، حیدرآباد نے ان کو بیسٹ یونانی اسکالر گلوبل ایوارڈ سے نوازا۔۲۰۱۷ء میں حکومتی سطح پر یونانی طب کے سب سے بڑے تحقیقی ادارے سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، وزارت آیوش، نے ان کو بیسٹ ٹیچر کے قومی ایوارڈ سے نوازا۔۲۰۱۹ء کو سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن نے ہی ان کی طبی تحقیق سے متعلق مجموعی خدمات کے لیے لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے علاوہ انھوں نے یونانی طب کے ایکسپرٹ کی حیثیت سے سری لنکا اور موریشس کے دورے کیے اور یونانی میڈیسن پر خصوصی لیکچر دیے۔سردست وہ عالمی ادارۂ صحت کے اشتراک سے کئی طبی اور علاج ومعالجہ سے متعلق تحقیقی پروجیکٹو ں پر عملی طور پر کام کررہے تھے،اس سلسلہ میں ابھی ان کو بہت سے علمی وتحقیقی کام انجام دینے تھے لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا اور اجل کا فرشتہ چلنے کا پیغام لے کر آ گیا اور وہ اپنے ہزاروں چاہنے والوں کے درمیان سے رخصت ہو گئے۔اللہ سے دعا گو ہوں کہ استادِ محترم کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور طبی دنیا کے لیے ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔آمین!

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

☆☆☆☆☆

تعزیتی پیغام

كُلُّ نَفسٍ ذَائِقَةُ المَوت

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جسے بھی زندگی دی ہے اسے ایک نہ ایک دن موت کا کڑوا گھونٹ پینا ہے۔یہی دنیا کا نظام ہے کہ کوئی آتا ہے تو کوئی جاتا ہے۔مگر کچھ لوگ اپنی زندگی میں ایسے کارنامے کر جاتے ہیں کہ اُن کے جانے کے بعد بھی دنیا اُنھیں یاد کرتی ہے۔ایسی ہی عظیم شخصیات میں پروفیسر غفران احمدؒ صاحب کی شخصیت تھی۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اُن کی یادیں ہمارے لیے سرمایۂ حیات ہیں۔محترم پروفیسر صاحب کا تصور آتے ہی اُن کے کریمانہ اخلاق اور شریفانہ برتاؤ اور اُن کی پُروقار شخصیت نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ہمیں پروفیسر صاحب کی جدائی کا غم ہے لیکن ہم دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ہماری دعا ہے کہ اللہ عزوجل پروفیسر غفران احمد صاحب کو غریقِ رحمت فرمائے اور آں محترم کی تُربت پر رحمت ونور کی بارش فرمائے۔آمین ثم آمین!

(مولانا اقبال احمد قاسمی، بنگلور)

ISSN:2454-4507

وہ شخصیت جو مری خاک کو سورج بنا گئی

ڈاکٹر محمد شفاعت کریم ☆

''میں زندہ رہنے کے لیے اپنے والد کا مقروض ہوں، لیکن بہتر زندگی کے لیے اپنے استاد کا مقروض ہوں۔'' سکندر اعظم

بہت دیر سے قلم لے کر بیٹھا ہوں، کہاں سے شروع کروں؟ سمجھ نہیں آتا! جس کے بارے میں لکھنا ہے وہ صرف میرے لیے ہی نہیں بلکہ پوری یونانی دنیا کے لیے محترم تھے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بدقسمتی کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں، وہ ہمیں افسردہ وغم زدہ چھوڑ کر دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ ان کے تعلق سے تحریر کرتے ہوئے کچھ ایسے الفاظ نہ استعمال ہو جائیں جو میری گرفت کا سبب ہوں کیونکہ وہ خود میڈیکل سائنس یا یونانی طب کے علاوہ ادب پر بھی عبور رکھتے تھے۔ وہ جب بولتے تھے تو مسحور کر دیتے، جب کلاس لیتے تو لگاتار گھنٹوں لکچر دیتے، لیب میں ہوتے تو بڑی دلجمعی اور تندہی سے کاموں کی نگرانی کرتے، جب اڈمنسٹریٹیو بلاک میں ڈپٹی ڈائریکٹر کی کرسی پر بحیثیت انچارج ہوتے تو نظم وضبط کی مثال نظر آتے، جب کھیل کے میدان میں ہوتے تو نوجوان کھلاڑی کی طرح ہمارے مقابل کھیلتے۔ خدا نے ان کو ہمارے درمیان سے بہت جلد بلا لیا۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں ستمبر ۲۰۰۸ء میں پہلی بار انٹرنس ٹسٹ دینے کے لیے جانا ہوا، اس سے قبل میں پروفیسر غفران احمد صاحب کے نام تک سے واقف نہیں تھا۔ گرچہ میں ہندستان کے قدیم ترین طبی اسکول سے تھا لیکن ہمارے یہاں طلبہ میں ایم ڈی کرنے کا رجحان نہ ہونے کی وجہ سے بھی دوسرے کالجوں کے اور یونانی دنیا کے مشاہیر اطباء کے بارے میں کم ہی علم رکھتا تھا۔ جب میں نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں شعبۂ علم الادویہ میں داخلہ لیا تو معلوم ہوا کہ میرے شعبہ کے صدر پروفیسر غفران احمد صاحب ہیں، دوستوں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ موصوف صدر شعبہ علم الادویہ کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ کے ڈپٹی ڈائریکٹر کے (عارضی) فرائض بھی انجام دے رہے ہیں اور آج کل آفس میں کام کی مصروفیت کی وجہ سے شعبہ میں وقت کم ہی دے پاتے ہیں۔

اسی اثنا ایک دن جب میں ڈپارٹمنٹ گیا تو صبح میں صدر شعبہ والے چیمبر میں ہی ان سے ملاقات ہوگئی، یہ میری ان سے پہلی بالمشافہ ملاقات تھی، انھوں نے میرا نام پوچھا اور طب کی چند اہم کتابوں کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا کہ آپ نے ان کا مطالعہ کیا ہے، میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس کے بعد انھوں نے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو یعنی کس کالج سے بی یو ایم ایس کیا ہے؟ میں نے جواب میں کہا گورنمنٹ طبی کالج واسپتال، پٹنہ، یہ سن کر انھوں نے قدرے تعجب کا اظہار کیا، کیونکہ اس وقت ایم ڈی میں داخلہ لینے والے زیادہ تر طلبہ اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی وغیرہ سے ہی ہوا کرتے تھے، گورنمنٹ طبیہ کالج، پٹنہ سے تو غالباً میں پہلا طالب علم تھا اس لحاظ سے ان کا استعجاب بجا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں میں سے افصح الکلام، ندیم اشرف، احتشام الدین اور نظام الحق (یہ تمام بھی علی گڑھ سے بی یو ایم ایس کر کے آئے تھے) سے دریافت کیا کہ کیا آپ لوگوں نے ان سب کتابوں کو پڑھا ہے؟ سب نے کہا کہ یو جی میں ان کتابوں کو کہاں پڑھتے ہیں۔ اب میں نے ان سب کتابوں کو یکے بعد دیگرے نکال کر پڑھنا شروع کیا اور اس کے نوٹس بنا کر ان کو دکھاتا گیا، یہاں تک کہ موصوف نے مجھے قریب تر کر لیا۔ جلد ہی ریسرچ کے لیے گائیڈ چننے کی باری آئی تو

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ، گورنمنٹ طبی کالج واسپتال، پٹنہ، بہار۔ Email:shafatkarim@gmail.com، Mob.No:9852560980۔

سر نے کہا کہ شفاعت کا گائیڈ میں رہوں گا اور باقی کے لیے قرعہ اندازی کی جائے۔ آخر کار یہی ہوا، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں ان کی رہنمائی میں کام کرنے والا میں ان کا آخری شاگرد تھا۔

ایم ڈی کے پہلے سال میں جب امتحان کا وقت قریب آیا اور انھوں نے مصروفیت کی وجہ سے اپنے حصے کا نصاب پورا نہیں پڑھایا تھا، تو انھوں نے کہا کہ ہماری کلاس جاری رہے گی اور ہم لوگ نصاب مکمل کریں گے۔ امتحان سر پر تھا، ساری کلاسس بند ہو چکی تھیں لیکن غفران سر ان دنوں بھی کبھی دو گھنٹے کبھی تین گھنٹے لگا تار کلاس لیا کرتے، حتیٰ کہ دو امتحان کے درمیان کے دنوں میں بھی انھوں نے کلاس لے کر اپنا نصاب مکمل کیا۔ پڑھانے کا طریقہ سب سے جدا تھا، گھنٹوں کے کلاس میں لکچر کے دوران کبھی کوئی نوٹ، یا پرزہ یا لیپ ٹاپ کا سہارا نہیں لیتے۔ اس طرح تسلسل اور دل نشیں انداز میں کلاس لیتے کہ کوئی پلک تک نہیں جھپکاتا۔ تدریس و تفہیم کا طریقہ اتنا عمدہ تھا کہ کلاس کی ساری باتیں دماغ میں اتر جاتیں۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میرے سینئر ڈاکٹر شبیر احمد پرّے صاحب کی ریسرچ میں خرگوش کے قلب کا اورطی (Aorta) نکالنا تھا۔ پوری ٹیم کے ساتھ لیب میں کام چل رہا تھا۔ محترمہ ڈاکٹر نجیب جہاں کی نگرانی میں ڈاکٹر شبیر، ڈاکٹر پرویز، ڈاکٹر وجئے بھان سنگھ، ڈاکٹر فیصل اقبال، ڈاکٹر سبودھ کمار اور ڈاکٹر تبارک حسین کے علاوہ ہم جونیئر بھی لیب میں تھے۔ جونیئر کے ناطے میرا کام ویڈیو ریکارڈ کرنے کا تھا۔ بہت دیر سے مشقت چل رہی تھی، خرگوش کو مردہ کر کے قلب سے Aorta نکالنے کی کوشش جاری تھی کہ اسی اثناء میں پروفیسر غفران صاحب بھی لیب میں آ گئے۔ پانچ منٹ تک بغور دیکھا پھر خود دستانہ پہن کر سرجیکل بلیڈ پکڑ لیا، مشکل سے دو منٹ میں پہلے قلب کو جسم سے الگ کیا پھر قلب سے Aorta کو نکال لیا، سب لوگ دیکھتے رہ گئے۔ اس سے قبل جس وقت نجیب میڈم کے ہاتھ میں نشتر تھا اور طلبہ کے ساتھ Aorta نکالنے کی جد و جہد چل ہی رہی تھی کہ میڈم کے خاوند جناب ڈاکٹر وقار صاحب کا فون آ گیا۔ میڈم کا ہاتھ خون میں لت پت تھا، غفران سر نے میڈم کی اجازت سے فون اٹھالیا، ان کے دریافت کرنے پر غفران سر نے بڑے ہی مزاحیہ انداز میں کہا کہ 'اس وقت میڈم دل پر نشتر چلا رہی ہیں'، ان کے مزاحیہ الفاظ نے ماحول میں سرور بھر دیا اور لیب میں قہقہے گونج اٹھے اور آج بھی ہر ایک کے ذہن میں وہ پل ایک یادگار لمحے کے طور پر درج ہے۔

میں ایم ڈی کے دوسرے سال میں تھا اور ابھی ریسرچ کا کام شروع ہونے کو ہی تھا کہ ایک روز دن کے تقریباً ۱۱/ بجے غفران صاحب نے فون کر کے کہا، آپ کہاں ہیں؟ جلدی سے میرے چیمبر میں آیئے، میں فوراً بھاگا بھاگا ڈپارٹمنٹ میں داخل ہوا، سلام کے بعد انھوں نے کہا کہ میں جا رہا ہوں، میں چپ کھڑا تھا کہ انھوں نے پھر سے کہا کہ میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور سے واپس اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ جا رہا ہوں، لیکن تم غم نہ کرنا، میں کہیں بھی رہوں تمھارا کام ہوتا رہے گا۔ میرے واپس جانے کا علم کسی کو نہیں ہے، تم آخری اسٹوڈنٹ ہو جو میرے زیر نگرانی کام کر رہے ہو اس لیے تمھیں بتانا ضروری سمجھا۔ میں بالکل سکتے میں تھا اور میری زبان خاموش۔ میں وہاں سے نکلا تو آنکھیں نم، حواس باختہ، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے ایسے میں کیا کرنا چاہیے۔ پھر میں نے ڈاکٹر نسرین جہاں (جو کہ میری کو گائیڈ بھی تھیں) کو بتایا، پھر ساتھیوں کو اور اس طرح سے علم الادویہ ڈپارٹمنٹ میں بات پھیل گئی۔ پھر ہم لوگوں نے شعبہ کے دیگر اساتذہ کی مدد سے فوراً ڈپارٹمنٹ میں ہی ایک چھوٹی سی الوداعیہ تقریب منعقد کی جس میں ڈائریکٹر جناب پروفیسر ایم اے جعفری صاحب کو بھی دعوت دی گئی لیکن وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ اساتذہ کرام میں سے پروفیسر عبدالودود صاحب، ڈاکٹر غلام الدین صوفی صاحب، ڈاکٹر نسرین جہاں صاحبہ، ڈاکٹر نجیب جہاں صاحبہ نے اپنے اپنے تأثرات کا اظہار کیا اور پھر طلبہ میں سے بھی کچھ نے اپنے خیالات ظاہر کیے۔ اس چھوٹے سے پروگرام میں جب موصوف کے بولنے کی باری آئی تو گھنٹوں مزاح کے ساتھ بولنے والا شخص آج دو منٹ بھی نہ بول پایا۔ سب کی آنکھیں نم تھیں، گلا بھر آیا تھا، سر نے جلد ہی رخصت لینا بہتر سمجھا اور پھر این آئی یو ایم سے ہمیشہ کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔

فی الواقع ڈائریکٹر پروفیسر مستحسن علی جعفری صاحب نے پروفیسر غفران احمد

صاحب کو اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ سے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور لانے کا بڑا کام کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہی وہ شخص ہے جو یہاں کے ماحول میں Scientific temperament لاسکتا ہے۔ مرحوم نے بھی دن رات پوری دلجمعی کے ساتھ ادارے کی خدمت کی اور اس کے لیے بے شمار خدمات انجام دیں۔ پروفیسر غفران احمد صاحب اور شعبہ کے دیگر تمام اساتذہ کی وجہ سے شعبۂ علم الادویہ پورے انسٹی ٹیوٹ میں سب سے ممتاز ہوا کرتا تھا۔ شعبۂ علم الادویہ کا پریزنٹیشن یا سیمینار یا جرنل کلب دیگر شعبہ جات سے اعلیٰ ہوتا تھا۔ دوسرے ڈپارٹمنٹ سے پی جی اسکالر شعبۂ علم الادویہ میں پہنچتے، خصوصاً پروگرام کے اخیر میں اکسپرٹ کمینٹ کے طور پر غفران صاحب کا تجزیہ مثالی ہوا کرتا تھا۔ موصوف نے علم الادویہ ڈپارٹمنٹ کے پی جی اسکالرس کو ریسرچ میں جانوروں پر ریسرچ کرنے کے لائق بنانے کے لیے ڈائریکٹر صاحب کی مدد سے NIMHANS کے Central Animal Reaseach Facility میں ایک مہینے کی Animal Handling کی ٹریننگ کا انتظام کیا۔ اسی طرح FRLHT سے اس وقت شعبۂ علم الادویہ کے تمام طلبہ نے موجودہ ڈائریکٹر پروفیسر عبدالودود صاحب، ڈاکٹر غلام الدین صوفی صاحب کے ساتھ Herbarium Training بھی کی۔ اسی دوران این آئی یو ایم کے کیمپس میں ہی ہربل گارڈن بنانے کا کام بھی شروع ہوا۔ علم الادویہ کے سینٹرل لیب میں نئے نئے آلات Install کیے گئے، جن میں HPTLC اور Gas Chromatography Machine نہایت اہم تھیں۔ انہیں دنوں انڈور گیم کے لیے ہال بن کر تیار ہوا تھا جس میں غفران سر خود بھی بیڈمنٹن کھیلتے اور سامنے ہم طلبہ ہوا کرتے، اور وہ ہم جیسا یا گاہے ہم طلبہ سے بہتر کھیل کا مظاہرہ کرتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ سارے کام مرحوم کے مرہون منت تھے لیکن یہ ضرور تھا کہ ڈائریکٹر صاحب کی مدد سے ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے بہت سارے کام انھوں نے بہ آسانی کرالیے۔ طبی دنیا اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ پروفیسر مستحسن علی جعفری صاحب ایک کامیاب ڈائریکٹر رہے ہیں اور ان کے کئی بڑے کام میں یہ بھی ایک کام تھا کہ انھوں نے اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ کے علم الادویہ کے لیکچرر جناب غفران صاحب کو چن کر نہ صرف یہ کہ علم الادویہ ڈپارٹمنٹ کا ایچ او ڈی بنایا بلکہ ان کو ڈپٹی ڈائریکٹر کی اضافی ذمہ داری بھی دے دی۔ غالباً ۲۰۰۸ء سے ہی غفران صاحب علی گڑھ لوٹنا چاہتے تھے جس کے لیے کئی دفعہ موصوف نے ڈائریکٹر پروفیسر سید مستحسن علی جعفری صاحب سے تحریری طور پر علی گڑھ واپس جانے کی اجازت مانگی جس میں تاخیر ہوتی رہی، بالآخر کچھ دن کے پس وپیش کے بعد موصوف ایک دن اپنا استعفیٰ نامہ رکھ کر علی گڑھ لوٹ ہی گئے۔

میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کیونکہ میں ان کے طالب علموں میں سے تھا اور میں ان سے ذاتی طور پر قربت رکھتا تھا۔ انھوں نے بہت ساری زندگیوں کو سنوارا، بہت سے طلبہ کی مدد کی، انھوں نے ہمیں ریسرچ پیپر کی اہمیت سے آشنا کرایا۔ جب میں حکومت بہار میں این آر ایچ ایم میں میڈیکل آفیسر کی پوسٹ پر بحال ہوا تو ان کا کہنا تھا کہ مجھے تدریس کا شعبہ اختیار کرنا چاہیے۔ جب بھی میں ان سے کچھ دریافت کرتا یا سمجھنا چاہتا وہ ہمیشہ میری رہنمائی کرتے۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اپنے جذبات کو بیان کرسکوں۔

سنگِ بے قیمت تراشا اور جوہر کردیا
شمع علم و آگہی سے دل منور کردیا
چشم فیض اور دست وہ پارس صفت جب چھو گئے
مجھ کو مٹی سے اٹھایا اور فلک پر کردیا
خاکۂ تصویر تھا میں خالی از رنگ حیات
یوں سجایا آپ نے مجھ کو کہ قیصؔر کردیا

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

پروفیسر غفران احمد
ایک ہمہ جہت شخصیت

ڈاکٹر محمد شیراز ☆

اختصاریہ

پروفیسر غفران صاحب، حلقۂ طب و ادب کے لیے ایک سرمایہ بلکہ گنج گراں مایہ تھے۔ ان کی زندگی زمانی رقبے کے لحاظ سے اگرچہ مختصر تھی مگر معنوی رقبے کے لحاظ سے وسیع و جامع تھی۔ معنوی رقبہ اس لیے وسیع تھا کہ وسعت علم اور علم کی پختگی و رسوخ، خدمت خلق، بصیرت، طلبہ سے رابطۂ تربیت، تحقیق و تدقیق، مادری و عصری زبانوں پر عبور، مدعا کو پیش کرنے کی زبردست صلاحیت، ان سب پہلوؤں اور گوشوں پر ان کی زندگی محیط تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ شاید ہی (کم سے کم ہندستان میں) کسی علمی وطبی شخصیت کو ایسی ہر دلعزیزی، شہرت ومقبولیت اور مختلف طبی، سرکاری و غیر سرکاری، قومی اداروں اور جماعتوں کا اعتماد حاصل ہوا ہوگا، جو ان کو حاصل تھا۔ اس مقالہ میں ان کی زندگی کے مختلف گوشوں وشذرات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلوب سیرت نگاری کے آداب میں سے یہ ہے کہ کسی بھی علمی شخصیت، جس کی خدمات کا دائرہ متنوع و وسیع ہو، اس کے محاسن کو کسی رنگ آمیزی، داستان طرازی اور تزئین و آرائش کے بغیر سامنے رکھ دینا چاہیے کہ جمال فطرت اور حسن حقیقت کو ظاہری رنگ و روغن اور مہکتے ہوئے تازہ پھولوں کو مصنوعی رنگ و بو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس مقالہ میں ان تاریخی دستاویزوں اور مصادر و مراجع سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے جو بظاہر اس موضوع پر نہیں تھیں، مگر ان میں وہ قیمتی لعل و جواہر موجود تھے جو براہ راست خاص اس موضوع پر لکھنے والوں کو ملنے دشوار تھے۔ نیز مرحوم کے ابتدائی حالات و تدریجی ترقیات پر قلم اٹھانے والے احباب تو بکثرت ہیں اس لیے اس مقالے میں تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے، مرحوم کی علمی، تحقیقی و اخلاقی خدمات پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں یونانی طب نے دیسی طبوں میں اپنا ایک امتیازی مقام بنالیا تھا۔ مگر انگریزوں کی ہندستان میں آمد کے بعد تدریجاً اس قدیم طب کی شعاعیں مدھم پڑنے لگیں۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ چند سالوں میں ہر خاص و عام کے ذہن پر جہاں مغربی تہذیب کا اثر قائم ہوا وہیں مغربی طب کا اثر بھی قائم ہوتا چلا گیا اور لوگ انگریزی طریقۂ علاج کو ترجیح دینے لگے۔ ظاہر ہے کہ جس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر یونانی طب کے بال و پر نیز اس کی پرواز پر پڑنا تھا اور وہ پڑا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ دور حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے افق علم پر کوئی ایسی شخصیت وارد ہو، جو یونانی طب کی روح کی سچی، مؤثر اور صحیح ترجمان ہو، وسیع النظر اور دقیق العلم ہو، یونانی طب اور اس کے ذیلی مضامین (مفردات، مرکبات، صیدلہ) اس کا اوڑھنا بچھونا ہو۔ یونانی طب اور اس کے طریقۂ علاج نیز اس کے مؤثر ہونے کو تحقیقات اور سائنسی اصولوں کی بنیاد پر مغربی دنیا اور سائنس کے حلقہ میں ان ہی کی زبان میں نہ صرف پیش کر سکے بلکہ انھیں متأثر بھی کر سکے، اپنے فن کی طرف سے مدافعت کی ضرورت پڑے تو اس کے اندر اس کی زبردست صلاحیت موجود ہو بلکہ وہ یونانی طب کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکے کہ اس کی

☆ سائنسداں(I) ولکچرر، شعبۂ معالجات، آر آر آئی یو ایم، سری نگر، جموں وکشمیر۔ E-mail:sheeraz.rrium@gmail.com، Mob.No:9797750472۔

صدائے بازگشت کے علاوہ کوئی دوسری آواز سننے میں نہ آئے۔ اپنے فن کے لیے اس کا معاملہ حمایت سے آگے بڑھ کر حمیت تک پہنچا ہو۔ اس مقصد کے لیے حلقہ طب و ادب سے بہت سے لوگ اٹھے اور اپنی اپنی سطح پر انھوں نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ انھیں لوگوں کی فہرست میں ایک قد آور نام پروفیسر غفران احمد صاحب کا بھی ہے۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ مرحوم کا مقام بلند تر ہے۔

مرحوم کا تعلق ایک عرصے تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے عظیم و جلیل القدر اور بین االاقوامی شہرت والے ادارے سے رہا اور وہ دن رات اس ادارے کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ یوں تو علی گڑھ نے کئی عبقری شخصیات پیدا کیں مگر راقم کے نزدیک علی گڑھ کا تصور تین شخصیات کے بغیر ممکن نہیں کہ ان میں ایک کا تصور دوسرے کے ساتھ آتا تھا۔ ایک پروفیسر نادر علی خان صاحب مرحوم، دوسرے مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی مرحوم اور تیسرے پروفیسر غفران احمد صاحب مرحوم۔ ان شخصیات نے جو کام انجام دیے وہ آج ہماری تنظیمیں اور ادارے بھی مل کر انجام دینے سے قاصر ہیں۔ ان کی اس عام مقبولیت اور جامعیت اور ان کی ذات کے اختلافات سے بہت حد تک بالاتر ہونے کا ہی نتیجہ تھا کہ فارمیکوپیا کمیٹی برائے آیوش ادویہ، وزارت آیوش، حکومت ہند کے وہ ممبر رہے۔ ایک سال وہ این آئی یو ایم، بنگلور میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے اضافی منصب پر فائز رہے، نیز اسی ادارہ میں دو سال پروفیسر شپ کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ان کے دور اہتمام میں اس ادارے نے ایسی ترقی کی جو اس کے ابتدائی دور کے دیکھنے والوں کے گمان سے بڑھ کر تھی۔ انھوں نے بڑے بحرانی موقعوں پر اس ادارہ کی حفاظت کی اور اس کے مکینوں کی رہنمائی کی۔

انسان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف سننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور سخت سے سخت بات برداشت کرے، راقم نے غفران صاحب کو اس معاملے میں بہت عالی ظرف اور قوی الارادہ پایا۔ واقفیت رکھنے والے پورے حلقے میں یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ غفران صاحب نہایت کریم النفس، بدی اور بدلے کے جذبے سے خاصی دور، بڑے شیریں اخلاق، نرم خو، نرم رو اور نرم گفتگو تھے۔ بقول علامہ اقبالؔ: ع

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو

غفران صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے طلبہ کے درمیان علم الادویہ اور علم الصیدلہ کو ہر دلعزیز بنا دیا اور ان کا اس سے تعلق پیدا کر دیا۔ یونانی طب کو عالمی سطح پر متعارف کرنے کے لیے سری لنکا اور موریشس کا دورہ کیا۔ قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں نہ صرف شرکت کی بلکہ وہاں وہ شیر کی طرح گرجے اور بلبل کی طرح چہکے۔ اس مقدس علم کی اہمیت و افادیت کو اہل مغرب و مشرق کے محققین اور سائنسدانوں کے سامنے جدید سائنسی اصولوں کی بنیاد پر واضح کیا۔ اہل تدبر کو باور کرایا کہ یہ علم آج بھی اپنا لوہا منوانے کی تاثیر رکھتا ہے، نیز اس کی افادیت مسلم ہے۔

مرحوم کی دوسری خصوصیت ان کے تحقیقی و تدقیقی کام ہیں جو انھوں نے اس دور میں انجام دیا جب کہ حلقۂ یونانی طب میں تحقیقی مقالے لکھنے کا رجحان بہت کم تھا۔ راقم کو بھی غفران صاحب سے نیاز حاصل ہوتا رہا۔ آخری مرتبہ بین الاقوامی کانفرنس ۲۰۱۹ء، دہلی میں ملاقات ہوئی۔ موصوف نے سینئر جونیئر کا خیال کیے بغیر گرم جوشی سے ملاقات کی، جیسے ہم میں سالوں کا یارانہ رہا ہو۔ آخری بار ایک معاصر سے فون پر بات کرتے ہوئے سنا۔ فرما رہے تھے کہ ''ابھی ابھی خالد زماں صاحب کو سپرد خاک کر کے آرہے ہیں۔'' عجیب بات ہے کہ اس سانحہ کے چند ماہ بعد ہی وہ خود بھی مالک حقیقی سے جا ملے جہاں انھیں اپنی خدمات کا اصل بدلہ ملنا ہے۔

پروفیسر غفران صاحب اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ بعد ازاں ان کا خاندان لکھنؤ منتقل ہو گیا تھا۔ موصوف نے ۱۹۸۱ء میں اپنی ابتدائی تعلیم اور ۱۹۸۳ء میں عالمیت، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ سے مکمل کی۔ لیکن بعد ازاں تعلیم و تربیت کے سلسلے میں علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے معاشیات سے ایم اے کیا۔ پھر بی یو ایم ایس کی ڈگری اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ سے حاصل

کی۔ گریجویشن کے بعد علم الادویہ میں پوسٹ گریجویشن کے مراحل بھی اسی یونیورسٹی سے مکمل کیے۔ بدر باغ، علی گڑھ میں موصوف رہائش پذیر تھے۔

مرحوم کو انگریزی اور اردو پر یکساں عبور تھا۔ ایک مرتبہ آڈیٹوریم، این آئی یو ایم، بنگلور میں کسی موضوع پر لکچر لے رہے تھے۔ سامعین ہمہ تن متوجہ تھے۔ این آئی یو ایم کے عقبی گوشہ میں ایک جگہ پر آگ لگی ہوئی تھی۔ اس وقت کے ڈائریکٹر، پروفیسر ایم اے جعفری صاحب آڈیٹوریم میں داخل ہوئے اور ان کے الفاظ تھے، ''ایک آگ اُدھر لگی ہوئی ہے اور ایک آگ اِدھر لگی ہوئی ہے۔'' بقول شخصے: ع

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

موصوف ان لوگوں میں تھے کہ جن کے لکچرز میں نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ بھی شرکت کے متمنی رہا کرتے تھے۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ مرحوم کے لکچر میں شعبۂ علم الادویہ کے چند اساتذہ بھی شرکت کرتے تھے۔

مرحوم ایک سال پہلے کشمیر آئے تھے۔ آر آر آئی یو ایم، سری نگر سے اساتذہ ان سے ملنے گئے تھے۔ مرحوم سے درخواست بھی کی تھی کہ آپ آر آر آئی یو ایم، سری نگر کے طلبہ کے درمیان ایک لکچر بھی لیں اور طلبہ کو مستفید فرمائیں۔ انتہائی سادگی سے وہ پیکر جفاکش تیار بھی ہوگیا، باوجودیکہ سفر کی تکان تھی۔ مگر یونانی کی نسل نو کو دور جدید کے تقاضوں سے آگاہ کرنے کے لیے انھوں نے اپنی تکان کی پرواہ نہیں کی۔ اگرچہ کہ بعض تکنیکی وجوہات کی بنا پر لکچر نہ ہوسکا مگر دریائے خلوص نے اپنی تہوں سے گہرا چھالنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

ایک طالب علم نے موصوف کا علمی مواد، جو انھوں نے کئی سال کی محنت کے بعد جمع کیا تھا، اور صیدلہ کی معلومات پر مبنی تھا، اپنے نام سے شائع کرلیا۔ استفسار پر اس نے کہا کہ میں نے مصادر و مراجع میں آپ کا نام شامل کیا ہے۔ موصوف نے بغیر کوئی شکایت زبان پر لائے ہوئے کہا کہ میرے پاس کچھ اور مواد ہے اسے بھی شامل کرلو، طلبہ کا فائدہ ہوجائے گا۔ یہ ان کی دریادلی تھی۔

ایک طالبہ کا بیان ہے کہ علی گڑھ میں ایک مرتبہ بارش ہورہی تھی۔ گھر جانے کے لیے سواری کا انتظام نہ تھا۔ غفران سر نے اپنی کار میں مجھے میرے گھر تک پہنچایا۔ یہ ان کی خاکساری اور بے نفسی تھی۔

علمی و تحقیقی خدمات

مرحوم کی دو کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:[۱]

۱-اوصاف ادویہ--ضمانت سے محاسبہ تک

۲-اصول دواسازی

اس کے علاوہ مرحوم نے دو معیاری کتابوں کے اسباق بھی لکھے ہیں، جو حسب ذیل ہیں:[۱]

۱-یونانی طب میں مذکور چڑھنے والی بیلوں کی افادیت، اسپرنجر، سویٹزرلینڈ (۶۵-۱۰۰)۔[۲]

۲-یونانی طب میں مذکور دوائی نباتات کے رائیزوم کی افادیت، اسپرنجر، سویٹزرلینڈ، ۲۰۱۹ء۔[۳]

موصوف کے طبی و تحقیقی مقالے جن کی تعداد ۸۰/ سے زیادہ ہے، ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن پر مفصل تبصرہ کیا جاسکتا ہے مگر اس کے لیے علیٰحدہ مضمون درکار ہے۔ یہاں چند اہم مقالوں کے عناوین کو درج کیا جاتا ہے:[۱]

۱-یونانی نسخہ جات پر مشتمل ایک حب کی اضطراب نفسانی میں تاثیرات، جرنل آف ایتھنو فارمیکولوجی، ایلزیویر، آئرلینڈ، ۱۹۹۸ء۔[۴]

۲-یونانی ادویات کی ارتقائی فعالیت میں تجرباتی تحقیق کا طریقۂ کار، پروسینڈنگ آف نیشنل سیمینار، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء۔[۵]

۳-امراض گردہ میں بنادق البزور کی تاثیرات، ہمدرد میڈیکس، کراچی، پاکستان، ۱۹۹۹ء۔[۶]

۴-جوارش زرعونی سادہ کی مسکن، محلل ورم اور اسٹیرائیڈل تاثیرات، بنگلہ دیش جرنل آف انٹیگر یٹیڈ میڈیسن، ڈھاکہ، بنگلہ دیش، ۲۰۰۲ء۔[۷]

۵-قشعی ورم جگر کے مریضوں میں غیر قرابادینی نسخہ کی تاثیرات: ایک مطالعہ، ہمدرد میڈیکس، کراچی، پاکستان، ۲۰۰۲ء۔[۸]

ان کی تدریسی اور تحقیقی خدمات ۲۰؍سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہیں۔ موصوف نے پروفیسر کنور محمد یوسف امین صاحب کے ساتھ مل کر بیشتر تحقیقی کاموں میں حصہ لیا۔ ایکسپیریمینٹل فارماکولوجی اور علم الصیدلہ، علم کشتہ سازی موصوف کے مضامین تھے۔ موصوف نے ادویہ کی تاثیرات معلوم کرنے کے طریقہ کار نیز ان کے معیارات مقرر کیے۔ ۳۸؍ایم ڈی کے طلبہ و طالبات نے موصوف کے زیرنگرانی رہ کر اپنے تحقیقی مقالات کی تکمیل کی ہے۔ بیشمار قومی و بین الاقوامی کانفرنسز و سیمینارس میں مندوب کی حیثیت سے شامل رہے۔ شعبۂ علم الادویہ کے وہ صدر رہے، فارماسیوٹیکل سوسائٹی کمیٹی جو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں یونانی شعبہ کو شروع کرنے کے لیے بنائی گئی تھی کے ممبر تھے۔ این آئی یو ایم کی اتھکس کمیٹی برائے حیوانات میں شامل تھے، علاوہ ازیں بین الاقوامی امراض کی درجہ بندی (آئی سی ڈی) کی کمیٹی، ٹی کے ڈی ایل، سی ایس آئی آر (نئی دہلی) اور ٹاسک فورس کمیٹی کے بھی ممبر تھے۔

خلاصہ

اعزازات کے اس دور میں جب کہ لوگ اپنی خدمات کا فوری صلہ چاہتے ہیں، واہ واہی اور ناموری چاہتے ہیں، شہرت و منصب کے طالب ہیں، موصوف ایک حجت تھے۔ خاموشی اور خلوص سے کام کرنے کو اپنا اصول قرار دیتے تھے۔ اپنی خدمات کا بدلہ اس جہاں کے لیے اٹھا رکھا تھا جہاں وہ اب ہیں۔ مرحوم کے انتقال سے حلقۂ علم و ادب میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کا پُر ہونا، بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مرحوم کے مشن کو آگے بڑھایا جائے، نیز ان کے ادھورے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔

مراجع و مصادر

۱- Ghufran Ahmad Biodata. [Internet]. cited on Aug 27, 2022. Available from.www.amu .ac.in/ faculty/ilmul-advia/ghufran-ahmad.

۲- غفران احمد۔ طب یونانی میں مذکور چڑھنے والی بیلوں کی افادیت۔ سویٹزرلینڈ: اسپرنجر۔۲۰۱۹ء: ۶۵-۱۰۰۔

۳- غفران احمد۔ طب یونانی میں مذکور دوائی نباتات کے رائیزوم کی افادیت۔ سویٹزرلینڈ: اسپرنجر۔۲۰۱۹ء۔

۴- غفران احمد۔ یونانی نسخہ جات پر مشتمل ایک حب کی اضطراب نفسانی میں تاثیرات۔ آئرلینڈ: جرنل آف ایتھنو فارمیکولوجی، ایلزیور۔۱۹۹۸ء۔

۵- غفران احمد۔ یونانی ادویات کی ارتقائی فعالیت میں تجرباتی تحقیق کا طریقۂ کار۔ نئی دہلی: پروسینڈنگ آف نیشنل سیمینار، جامعہ ہمدرد۔۱۹۹۸ء۔

۶- غفران احمد۔ امراض گردہ میں بنادق البزور کی تاثیرات۔ کراچی، پاکستان: ہمدرد میڈیکس۔۱۹۹۹ء۔

۷- غفران احمد۔ جوارش زرعونی سادہ کی مسکن، محلل ورم اور اسٹیرائیڈل تاثیرات۔ ڈھاکہ، بنگلہ دیش: بنگلہ دیش جرنل آف انٹیگر یٹیڈ میڈیسن۔ ۲۰۰۲ء۔

۸- غفران احمد۔ قشی ورم جگر کے مریضوں میں غیر قرابادینی نسخہ کی تاثیرات: ایک مطالعہ۔ کراچی، پاکستان: ہمدرد میڈیکس۔۲۰۰۲ء۔

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

کچھ پروفیسر غفران احمد کے بارے میں

ڈاکٹر محمد دانش غنی ☆

شخصیت انسان کے ذہنی، جسمانی، شخصی برتاؤ، رویوں، اوصاف اور کردار کے مجموعہ کا نام ہے۔ اگر آسان الفاظ میں شخصیت کی تعریف کی جائے تو یہ انسان کی ظاہری و باطنی صفات، نظریات، اخلاقی اقدار، افعال اور احساسات و جذبات سے منسوب ہے۔ ظاہری حسن و جمال وقتی طور پر کسی کی توجہ تو مبذول کرسکتا ہے لیکن تعمیر کردار میں فکر و نظریات کا کلیدی کردار ہوتا ہے۔ اس لیے شخصیت کا عموماً دارو مدار کسی کے ظاہر سے نہیں بلکہ اس کے باطن سے ہوتا ہے جو اس کی حقیقی فطرت اور اس کی طرزِ زندگی اور سوچ پر محمول ہوتا ہے۔ دائمی حسن ہی انسان کو زندہ جاوید بناتا ہے۔ پروفیسر غفران احمد کی شخصیت میں ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ دو خوبیاں بھی موجود تھیں جو انسان کی شخصیت سے ظاہر ہوتی ہیں یعنی حسنِ سلوک اور حسنِ عمل۔ غفران صاحب کی شخصیت کے یہ دو نمایاں پہلو جن سے ہم جیسے چھوٹے لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

پروفیسر غفران احمد ایک محترم، مشہور، کارگر، تجربہ کار اور قابلِ تعظیم شخصیت تھی جن کی ذاتِ گرامی سے یونانی طب کو بہت تقویت ملی۔ ان کا میدانِ عمل بظاہر اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور رہا ہے لیکن انھوں نے جن علمی و تحقیقی امور کو سرانجام دیا اس کے خوشگوار اثرات پوری طبی دنیا پر مرتب ہوئے ہیں۔ اپنی اسی ہمہ گیر افادیت کی بدولت وہ یونانی دنیا میں یاد کیے جاتے ہیں۔

میری ان سے پہلی ملاقات این آئی یو ایم، بنگلور میں ہوئی تھی جہاں میں لائبریری اٹینڈنٹ تھا اور وہ علم الادویہ کے پروفیسر۔ پہلی نظر میں بظاہر سیدھے سادے نظر آنے والے پروفیسر غفران صاحب رفتہ رفتہ پرت در پرت کھلتے گئے۔ دھیما لہجہ، چہرے پر سنجیدگی، آنکھوں میں چمک، پُراعتماد اندازِ گفتگو۔ وہ دلائل اور مثالوں کے ذریعہ اپنی گفتگو کو آگے بڑھانے کا فن جانتے تھے۔ ان کی پُراعتماد گفتگو سے ان کے وسیع مطالعے اور غور و فکر کا اندازہ ہوتا تھا۔ ان کی گفتگو کا اصل حسن اختصار، جامعیت اور مختلف ''حوالے'' ہوتا تھا۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ دوسروں کی بات دلچسپی سے سنتے تھے۔ مزید برآں ان کی وضعداری اور انکساری کا انداز بھی قائم و دائم رہتا تھا۔ انھوں نے مجھے یہ احساس کرادیا تھا کہ وہ صرف جسمانی علاج ہی نہیں کرتے، ذہنی اور روحانی اصلاح کی تدبیر بھی فرماتے ہیں۔ دورانِ ملازمت میں نے انھیں کسی کی دل آزاری کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بے حد ذہین، با مطالعہ، حاضر دماغ اور قوی حافظے کے مالک ہونے کی وجہ سے وہ طلبہ و طالبات کے پسندیدہ استاد رہے ہیں۔ پھر انھیں این آئی یو ایم کے ڈپٹی ڈائریکٹر کا اضافی چارج دیا گیا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر بننے کے بعد بھی وہ ایک درویش صفت، سنجیدہ مزاج اور خاموش طبیعت استاد ہی رہے۔ وہ ہمیشہ این آئی یو ایم میں زیرِ تعلیم طلبہ و طالبات اور اپنے شعبے کے برسرِ کار اساتذہ میں چُھپے ہوئے جوہر کی تلاش میں رہتے تھے۔ وہ بڑے مجلس ساز اور جانِ محفل بھی رہے ہیں۔ ایک عرصے تک اپنی علمی سرگرمیوں سے این آئی یو ایم کے تعلیمی ماحول کو متحرک رکھا۔ مجھے یاد ہے کہ اسٹوڈنٹس کی فریشر پارٹی میں انھوں نے دھیمے لہجے میں ایک جامع تقریر کی تھی جس میں میس، فارمیسی، ہسپتال اور مولانا کی کینٹین کی ایسی تصویر کشی کی کہ سارا ہال زعفران زار ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ سنجیدہ گفتگو بھی کی تھی جسے مجمع ہمہ تن گوش ہوکر سن رہا تھا، جملوں اور برمحل اشعار پر سر دھن رہا تھا اور ایک خوش گوار فضا بن گئی تھی۔ بقول شخصے:۔

اس کے لہجے میں کلیاں چٹکنے لگیں
اس کی آواز میں پھول کھلنے لگے

☆ اسسٹنٹ پروفیسر و صدر، شعبۂ اردو، گوگٹے جوگلے کر کالج، رتناگری۔ Mob.No:9372760471، E-mail:danish_gani@yahoo.co.in۔

ان کی یہ تقریر سن کر ایسا معلوم ہوا گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے لیکن وہ اپنی اس صلاحیت کا ہمیشہ ہی انکار کرتے رہے۔ ان کی گفتگو منطق سے معمور ہوتی تھی اور یہ منطق ہی دراصل زبان کے جادو کا نام ہے۔

بنگلور کی ملازمت کے دوران انھوں نے میری ہمیشہ ہمت افزائی کی۔ چنانچہ ان کی محبت، شفقت، حوصلہ افزائی اور جذبۂ قدر دانی سے میں بھی محروم نہیں رہا۔ میرا نام اور کام ہمیشہ ان کی نگاہ میں رہا اور انھوں نے ہمیشہ داد و دہش سے کام لیا۔ آج بھی ان کی ایک تحریر میرے پاس محفوظ ہے جو میرے لیے خراجِ تحسین ہے اور ایک اہم سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

غفران احمد سے پروفیسر غفران احمد بننے اور اس نام کو معتبر بنانے میں انھیں ایک عمر لگی۔ تعلیمی خاندان، علم و ادب کے گہوارے میں تربیت، اپنے عہد کے بہترین اساتذہ سے حصولِ علم اور سب سے بڑی چیز ان کی طبیعت میں موجزن مسابقت کا جذبہ اور ساتھ ہی موافق حالات، یہ سب وہ عناصر تھے جنھوں نے انھیں یونانی طب کی ایک ممتاز علمی شخصیت بنا دیا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور کی ملازمت انھیں ایسے شعبوں میں لے گئی جہاں ان کی تنظیمی صلاحیتیں خوب خوب نکھریں اور یہی نکھار یونانی طب کے دیگر اداروں کے لیے بھی تب و تاب ثابت ہوا۔ غفران صاحب نے اپنے علم، تجربے، رعب و دبدبہ، اثر و رسوخ نیز شہرت و مقبولیت سے بھی اپنے شاگردوں اور ماتحتوں کی زندگی میں نئی روح پھونکنے میں بڑا کام لیا۔ مقامی سطح پر بھی انھوں نے یونانی طب کے نظام میں بیداری کی فضا بنائی اور بیرونِ ملک جا کر بھی اس کی فضا کو نکھارنے اور سنوارنے کی سعیِ جمیل کرتے رہے۔

جب میرا تقرر مہاراشٹر کے ساحلی شہر رتناگری کے گوگٹے جوگلے کر کالج میں ہوا تو میرا ان سے رابطہ کم کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔ اکتوبر ۲۰۱۸ء میں، میں جب ریفریشر کورس کے لیے علی گڑھ گیا اور ان سے ملنے ان کے ڈپارمنٹ میں پہنچا تو انھوں نے میرا پُر تپاک استقبال کیا اور گوگٹے جوگلے کر کالج، رتناگری کے شعبۂ اردو میں میری تقرری پر خوشی کا اظہار بھی کیا۔ وہ ملاقات آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میرے خیال سے دسمبر ۲۰۲۰ء میں بھی ان سے ایک دو مرتبہ ٹیلی فونک گفتگو ہوئی تھی جس میں ''شعر کے پردے میں'' کو انھوں نے بے حد سراہا تھا اور انھوں نے مصنف کے خلوص اور دردمندی کے جذبے کی داد دی تھی۔ وہ خوبصورت الفاظ اور جملے آج بھی میرے ذہن میں موجود ہیں۔

کورونا کے دور میں جہاں بہت سی اہم شخصیات نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا ان میں سے ایک شخصیت پروفیسر غفران احمد صاحب کی بھی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کی نیکوکاری کا سلسلہ موقوف ہو رہا تھا۔ وہ اپنے حصے کا سارا کام مکمل کر چکے تھے۔ ان کا حسنِ سیرت تمام ہو چکا تھا اور اب قدرت انھیں اپنے حضور دیکھنے کی مشتاق تھی چنانچہ فرشتۂ اجل نے انھیں ذرا سی مہلت نہ دی اور دودھیا رنگ کے فرشتوں کے جھرمٹ میں ایک برگزیدہ اور نیک روح اس سرائے فانی سے کوچ کر گئی۔ ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء کو ان کا سانحۂ ارتحال میرے لیے بھی ایک نہایت سنگین اور اندوہناک حادثہ ہے اور میں اسے اپنے ذاتی غم والم اور خسارے سے تعبیر کرتا ہوں۔

آج پروفیسر غفران احمد صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ان کی شخصیت کے نقوشِ تاباں اور ان کی زندگی کے بے لوث کارنامے موجود ہیں۔ اگر ہم واقعی مرحوم کی دوستی، ایثارِ نفسی، خلوص و محبت، نیک نیتی، دردمندی اور علمی و تعلیمی خدمات کے قائل ہیں تو یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی یاد میں این آئی یو ایم، بنگلور میں ایک سالانہ لیکچر سریز شروع کریں جس کا موضوع ''ہندستان میں یونانی طب: سمت و رفتار'' سے تعلق رکھتا ہو۔ مرحوم پروفیسر غفران احمد کے لیے یہی اقدام صحیح معنوں میں خراجِ عقیدت ہوگا۔

یہ کون اپنے بیچ سے اٹھ کر چلا گیا　　لگتا ہے، سائبان نہیں، سر چلا گیا
رستہ چلا گیا ہے بہت دور تک کہیں　　پھر کوئی کارواں سے بچھڑ کر چلا گیا
بس انتظارِ صبح بہاراں ہوا تمام　　پنچھی بہت اداس تھا، اڑ کر چلا گیا
اب اور گردِ راہ سے امید کیا رکھیں　　آنکھوں سے رنگ و نور کا پیکر چلا گیا
زخموں سے کیسے جان چھڑاؤ گے دوستو　　ترسو گے بار بار کہ نشترؔ چلا گیا

(عبدالرحیم نشترؔ)

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

[غیر مطبوعہ کتاب 'اصول دواسازی' از پروفیسر غفران احمد سے ماخوذ]

مقدار خوراک/قدر شربت

پروفیسر غفران احمد ☆

دواؤں کی مقدار خوراک کا مسئلہ طب میں ہمیشہ موضوع بحث رہا ہے۔ کسی دوا کی مقدار خوراک کن بنیادوں پر طے کی جائے، یہ بات بھی مختلف فیہ رہی ہے۔ ایک بڑی بحث اس سلسلے میں یہ ہوتی رہی ہے کہ، اگر ہر دوا کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے جو اس کی تاثیر اور افعال کا ضامن ہے، تو کیا دوا کی مقدار کو بڑھانے سے اس کی مزاجی کیفیت اور تاثیر میں بھی اضافہ ہوتا ہے؟ مثلاً اگر دوسرے درجے کی دوا کی زیادہ مقدار دی جائے تو اس کی کیفیت اور نتیجتاً تاثیر تیسرے درجے کے برابر ہو جائے گی یا دوسرے درجے پر ہی برقرار رہے گی؟ اس سلسلے میں ایک اصولی رائے یہ ہے کہ اگر کمیت کے اضافے سے کیفیت میں اضافہ ہوتا ہے تو یقیناً دوا کی مقدار خوراک بڑھانے سے اس کی تاثیر میں اضافہ ہوگا۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر دوا کی کثیر و قلیل مقدار کا مزاج یکساں ہوتا ہے تو پھر دوا کی مقدار بڑھانے سے تاثیر ادویہ میں اضافہ کیوں کر ہوگا؟ ۱ر گرام اور ۵ر گرام دوا اگر ایک ہی مزاج کی حامل ہیں تو ان کے افعال میں تفاوت کی ظاہراً کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں دوسری رائے یہ ہے کہ دوا کی مقدار بڑھانے سے دوا کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ اضافہ تاثیر کو اس درجہ تک بڑھاتا ہے، جو اس دوا سے ایک درجہ اعلیٰ مزاج رکھنے والی دوا کا ہوتا ہے۔ طب میں دونوں نظریات کے حاملین موجود ہیں ایک وہ جو اس بات کے قائل ہیں کہ کمیت کے اضافے سے کیفیت اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ دوائی مادہ خواہ کم ہو یا زیادہ، اس کی مزاجی کیفیت، کمیت کے تابع نہیں ہوتی۔ پہلی جماعت کی دلیل یہ ہے کہ لوہے کو اگر کثیر آگ میں گرم کیا جائے تو جلد گرم ہوتا ہے بہ نسبت قلیل آگ کے، یا نمک کی زیادہ مقدار دیگر اشیاء کو جلد نمکین بناتی ہے، جب کہ نمک کی قلیل مقدار کو اسی کام کے لیے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ لیکن اس دلیل کو تسلیم کر لینے کے بعد لازم آتا ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ مزاج ادویہ متعین نہیں ہوتے، بلکہ مقدار دوا کے لحاظ سے ان کی کیفیت و تاثیر بدلتی رہتی ہے۔ جب ہم یہ بھی مان لیتے ہیں تو تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقدار کے تعلق سے کسی دوا کے مزاج کی تعیین کیسے ہوگی؟ اس سوال کا جواب اطباء نے یہ دیا ہے کہ کسی دوا کی جو مقدار تجربے سے طے ہو گئی اور ازالۂ مرض میں رائج و مستعمل ہے، اس مقدار کا جو مزاج ہوگا وہی مستند مزاج مانا جائے گا، مثلاً جدوار حار یابس دوسرے درجے میں اپنی مقدارِ مروج و مستعمل کے لحاظ سے ہے۔ مقدار کی زیادتی یا کمی سے اس کی کیفیت کم یا زیادہ ہوسکتی ہے، اسی مناسبت سے اس کی تاثیر میں بھی تبدیلی واقع ہوسکتی ہے۔ پھر یہ بھی کہا گیا کہ مزاج کے جو چار درجات اطباء نے متعین کیے ہیں، ان میں سے ہر درجے کا مزاج ناقابل تقسیم وحدت نہیں ہے، بلکہ ہر درجے کے مزید ذیلی تین درجات اول، اوسط اور آخر ہوتے ہیں جو اس دوا کی تدریجی شدتِ تاثیر کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان ذیلی درجات کا تعین اس طرح کیا جاتا ہے کہ اگر کسی دوا کی معروف مقدار خوراک کی ڈیڑھ گنا مقدار کھلانے سے وہ اثرات رونما ہوتے ہیں جو اس دوا کے مزاج سے ایک درجہ بالا مزاج رکھنے والی دوا سے پیدا ہوتے ہیں تو یہ سمجھا جائے گا کہ دوا اپنے آخری ذیلی درجہ کا مزاج رکھتی ہے اور اس میں تاثیر کی شدت زیادہ ہے۔ اگر یہی اثر دو چند دوا دینے سے پیدا ہو تو دوا کا مزاج اوسط ذیلی درجے میں ہوگا اور اگر چار گنا دوا دینے سے مذکورہ اثرات رونما ہوں تو دوا اپنے مزاج کے اول ذیلی درجے میں ہوگی۔ فرض کیجیے کسی دوا کا مزاج دوسرے درجے میں گرم وخشک ہے، تو دوسرا درجہ جامد اور غیر منقسم نہیں ہے بلکہ دوا کی مقدار خوراک بڑھنے سے اس کے درجۂ مزاج میں شدت آئے گی اور اس شدت کے مزید تین درجات ہوں گے؛ ابتدائی یا اول، درمیانی یا اوسط اور آخری یا انتہائی درجہ (اولیٰ، ثانیہ اور ثالثہ)، جنھیں ہم ذیلی درجات بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب اگر دوا کی مقدار خوراک ۴ر گرام مان لی جائے تو ذیلی درجات کا تعین یوں ہوگا کہ

☆ سابق صدر شعبۂ علم الادویہ، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش۔

اگر اس دوا کو ۶ رگرام کی مقدار میں کھلایا جائے اور اس سے وہ اثرات مرتب ہوں جو درجہ تین کی حار یابس دوا سے ہوتے ہیں تو سمجھا جائے گا کہ اس دوا کا مزاج درجہ دو کے آخری درجے میں حار یابس ہے۔ اور یہی اثر اگر ۸ رگرام دوا دینے سے پیدا ہو تو درجہ دو کے وسط میں اور ۱۶ رگرام دوا دینے سے تیسرے درجے کی دوا کے مساوی اثر پیدا ہو تو دوا دوسرے درجے کے اول ذیلی درجے میں حار یابس ہوگی۔ چوتھے درجے کے بعد چونکہ کوئی درجہ نہیں ہوتا اس لیے درجہ چہارم کا مزاج رکھنے والی دوا کے تینوں ذیلی درجات کا تعین اس طرح کیا جائے گا کہ دوا کی مقررہ مقدار خوراک سے جتنی دیر میں موت واقع ہوتی ہے، اگر ڈیڑھ گنی مقدار سے اس سے کم وقفے میں موت ہو جائے تو درجہ چار کا آخری ذیلی درجہ ہوگا اور اگر دوگنی اور چارگنی مقدار خوراک سے جلد موت واقع ہو تو بالترتیب اوسط اور اول ذیلی درجہ (یہ بات واضح رہے کہ درجہ چہارم کے درجات کی تعیین جسم انسانی پر نہیں بلکہ تجرباتی جانوروں پر کی جاتی ہے)۔ اس نظریہ کو ہمارے روزمرہ کے مشاہدات سے بھی تقویت ملتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ قلیل اور کثیر مقدار میں دوا کے استعمال سے تاثیر میں کمی و زیادتی واقع ہوتی ہے۔ کچلہ، سنکھیا افیون وغیرہ کم مقدار میں مفید جب کہ زیادہ مقدار میں مضر ہوتے ہیں۔ اگر مقدار میں مزید اضافہ کر دیا جائے تو مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ مدر اد و یہ کی کم مقدار سے ادرار بول ہوتا ہے لیکن اس دوا کی مقدار بڑھانے سے فعل ادرار میں زیادتی ہوتی اور جسم سے بول کی زیادہ مقدار کا اخراج ہوتا ہے۔

اطباء کا دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ دوا کی مقدار خوراک میں اضافہ سے اس کی کیفیت اور تاثیر میں اضافہ نہیں ہوتا۔ پانی کے ایک قطرہ کا جو مزاج ہے وہی مزاج ایک گلاس پانی کا بھی ہوتا ہے۔ ہر دوا کے اندر اجزاءِ حارہ اور باردہ ایک مخصوص تناسب اور ہیئت میں پائے جاتے ہیں، جب تک یہ تناسب برقرار رہتا ہے، اس دوا کی کیفیت اور درجۂ مزاج برقرار رہتے ہیں، مقدار خواہ کم ہو یا زیادہ۔ اگر کسی دوا کا مزاج چوتھے درجے میں حار ہے تو اس میں اجزاء حارہ پانچ اور جزء بارد ایک ہوگا، ایک حار جز، واحد جزوِ بارد کی تعدیل کر کے خود منسوخ ہو جائے گا اور باقی چار اجزاء اپنی اصل پر برقرار رہیں گے۔ اسی لیے بہت سے اکابر اطباء مقدار دوا میں اضافے کے قائل نہیں ہیں، کیونکہ کمیت میں اضافہ، کیفیت کے اضافے کا موجب نہیں ہے۔ لہٰذا مقدار کو بڑھانے کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ۔ ان کا ماننا ہے کہ دوا کی جو مقدار تجربے کی بنیاد پر طے ہوگئی وہی ازالۂ مرض کے لیے کافی ہے۔ مرض کی صحیح تشخیص اور مناسب دوا کا انتخاب زیادہ اہم امور ہیں بہ نسبت مقدار خوراک کے۔ اس سلسلے میں یہ فلسفہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کسی مادے کی صورتِ نوعیہ اس کی تاثیر کی ذمہ دار ہوتی ہے، کیفیات نہیں، کیفیات تو صرف واسطے کا کام کرتی ہیں۔ مادے کی صورت نوعیہ ابتداءً اپنے مادے میں کیفیتِ حرارت یا برودت پیدا کرتی ہے پھر جن دیگر مادوں یا اجسام سے ملاقی ہوتی ہے ان میں بھی وہی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے، جو اس کے اپنے مادے میں پائی جاتی ہے۔ اگر حالات سازگار ہیں تو مماثل کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اگر حالات ناسازگار ہیں تو مماثل کیفیت پیدا نہیں ہو پاتی۔ اس سلسلے میں دو امور کا پاس رکھنا ضروری ہے، ایک یہ کہ ایک مادے کا دوسرے مادے سے اتصال اور تعامل ضروری ہے، لہٰذا مادے جس قدر قریب ہوں گے، اسی قدر ان میں انتقالِ کیفیت کا امکان ہوگا۔ دونوں میں بُعد یا فصل زیادہ ہو گا تو کیفیات کم منتقل ہوں گی، اگر فصل کو مزید بڑھا دیا جائے تو کیفیت اور تاثیر بالکل ہی منتقل نہیں ہو پائیں گی۔ دوسرا امر یہ کہ دونوں مادوں کی مقدار میں جس قدر یکسانیت ہوگی، انتقالِ کیفیت کا عمل اسی قدر آسانی سے ہوگا، کیونکہ ایک مادہ دوسرے مساوی حجم والے مادے سے اچھی طرح تعامل کر سکتا ہے۔ اگر مقدار میں تفاوت ہوگا تو کیفیات یکساں طور پر منتقل نہیں ہو پائیں گی۔ یعنی دوا کی مقدار (حجم) اگر زیادہ ہوگی، مقامِ مرض یا مقامِ کارکردگی (Site of action) سے، تو دوا کی اثر پذیری زیادہ ہوگی اور اگر معاملہ اس کے برعکس رہا تو اثر پذیری کم ہوگی۔

دواؤں کے تعلق سے اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ نظام جسمانی کی کیفیت، شدت مرض اور مقام مرض بھی ان کی اثر پذیری میں حائل یا معاون ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوا کے اجزائے ترکیبی اور ان کی نوعیتِ ترکیبی کا بھی ان کی اثر پذیری میں اہم رول ہوتا ہے، اسی لیے ایک ہی مزاج رکھنے والی دو دوائیں بالعموم یکساں تاثیر نہیں رکھتی ہیں۔ غالباً اسی بنا پر ابن رشد کا ماننا ہے کہ دو دوائیں اگر یکساں مزاج رکھتی ہیں تو ان کا مزاجی اشتراک حقیقی نہیں ہوتا بلکہ نام کا اشتراک ہوتا ہے، کیونکہ ان کے افعال کی نوعیت مقام مرض کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔

مزاج اور صورت نوعیہ کے علاوہ دیگر عوامل بھی ان کی کیفیت اور تاثیر کی تعیین میں معاون ہوتے ہیں۔ دوا کی مقدار کے تعین کے لیے جن دیگر امور کو اہمیت دی جاتی ہے وہ درج ذیل ہیں:

جنس (مرد وعورت)، عمر (بچہ، نوجوان یا بوڑھا)، عادات (نشہ وغیرہ کی عادت)، موسم، وقت، ملک اور نسل وغیرہ، پیشہ (جسمانی یا ذہنی کام کرنے والا)، قویٰ (قوی ہے یا نحیف وناتواں)، مزاج (دموی، صفراوی، سوداوی یا بلغمی)، سحنہ (ڈیل وڈول کیسا ہے، قوی الجثہ ہے، فربہ ہے یا لاغر)، ہوا (ٹھنڈی، معتدل یا گرم)، سابقہ تدابیر (علاج وغیرہ کے سلسلے میں کس قسم کی تدابیر اپنائی جا چکی ہیں)، وقت مرض (اپنے درجے کے اعتبار سے کس درجے میں ہے، درجہ حاد، درجہ کمال یا درجہ انحطاط)، بحران (بحرانی امراض میں کیفیتِ بحران کے طاری ہونے میں کتنا وقت باقی ہے)، اعتقاد واعتماد (دوا کے سلسلے میں مریض کے خیالات وعقائد، مثلاً اسے طب یونانی پر اعتماد ہے یا نہیں)، معدہ کا امتلا وخلو (دوا کے استعمال کے وقت معدہ خالی ہے یا پُر)، دیگر امراض (مریض اگر کسی اور مرض میں بھی مبتلا ہے تو اس کی تفصیل) وغیرہ۔ ان امور کو 'امور ملائمہ' کہتے ہیں، ان کے پیش نظر ہی دوا کی مقدار کا تعین کیا جاتا ہے۔

عام اصول یہ ہے کہ مزاج ادویہ کے درجات کے لحاظ سے دواؤں کی مقدار خوراک متعین کی جاتی ہے، حالانکہ دواؤں کی کوئی حتمی مقدار خوراک نہیں ہوتی، بلکہ کم اور زیادہ مقدار (قلیل ترین وکثیر ترین) کی تحدید یا نشاندہی کی جاتی ہے۔ قلیل ترین سے کم مقدار دوائی تاثیرات سے عاری ہوتی ہے اور کثیر ترین سے زیادہ مقدار، موجب مضرت۔ طبیب اپنے علم وعرفان، تجربے اور وقتی ضرورت کی بنیاد پر ایک خاص مقدار متعین کر لیتا ہے جو ان حدود کے مابین ہوتی ہے۔ عام طور سے ہم دواؤں کی مقدار کے حدود درج ذیل طریقے سے متعین کرتے ہیں۔

درجہ اول ۷-۱۲ رگرام
درجہ دوم ۵-۹ رگرام
درجہ سوم ۵۰۰ رملی گرام-۲ رگرام
درجہ چہارم ۱۵ رملی گرام-۱۲۵ رملی گرام

مفردات کی مختلف کتب میں دواؤں کی جو مقدار تحریر ہے، ان میں اس قدر تفاوت ہے کہ کسی ایک مقدار خوراک کا ذکر کرنا یا مذکورہ مقدار کی بنیاد پر کوئی واضح اصول وضع کرنا مشکل ہے۔ حنظل اور حلتیت کا مزاج ایک ہے لیکن اول الذکر کی مقدار خوراک ۵۰۰ رملی گرام-۱ رگرام تک بیان کی گئی ہے، جب کہ ثانی الذکر کی مقدار دو چند ہے یعنی ۱-۲ رگرام۔ خارخسک اور حب کا کنج ایک جیسے افعال کی حامل ادویہ ہیں اور دونوں کی مقدار خوراک ۵-۷ رگرام بیان کی جاتی ہے، لیکن خارخسک کا مزاج حار یابس ہے اور حب کا کنج بارد یابس، درجہ دو کی دوا ہے۔ اس طرح کا اختلاف بھی کتابوں میں اکثر دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک دوا کی مقدار مثلاً کسی کتاب میں ۳ رگرام لکھی ہے تو دوسری کتاب میں اس کی دو چند۔ اس طرح کے اختلاف کی دیگر وجوہات کے علاوہ سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ، کسی بھی دوا کی کوئی متعین مقدار نہیں ہوتی، بلکہ یہ شخصی ہوتی ہے اور فرد کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے، یعنی اس کی جسمانی ساخت، احوال بدن اور نوعیت مرض وغیرہ کے لحاظ سے۔

جب ہم مقدار خوراک کہتے ہیں تو اس سے عام طور سے ایک متعین مقدار سمجھی جاتی ہے اور بیشتر اطباء، معالجین اور دواساز اس سے یہی مراد لیتے ہیں، مثلاً ۲ رگرام، ۵ رگرام، ۱۰ رگرام وغیرہ۔ معالجات کی بعض اہم کتابوں میں تو مقدار خوراک پر اس قدر تیقن کا مظاہرہ کیا گیا ہے کہ صاحب کتاب جب نسخہ لکھتے ہیں تو دواؤں کی مقدار نہیں لکھتے کیونکہ ان کے دور میں دوا کی مقدار اس قدر معروف تھی کہ اطباء اور طبقۂ عطار کو کسی نسخے کے اجزائے ترکیبی کو جاننا کافی تھا، وہ دوا کی معروف مقدار ہی نسخے میں شامل کرتے تھے۔ حالانکہ یہ بات اصولاً درست نہیں ہے کیونکہ مریض کی کیفیت، عمر، جسمانی ساخت، وزن اور دیگر امورِ ملائمہ کے پیش نظر ہی کسی مریض کے لیے قدرِ شربت کا تعین کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر اطباء نے دواؤں کی مقدار کی ایک حد متعین کر دی ہے کہ فلاں دوا کی مقدار مثلاً ۵-۷ رگرام ہے یا ۷-۱۰ رگرام ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ ایک انسان جو سن بلوغ اور سن شیخوخت کے درمیانی عمر میں ہوگا، اس کو دوا کی مقدار کی دو حدود کے درمیان سے کوئی مقدار دی جائے گی۔ مقدار میں معمولی تصرف (Fine tuning) معالج کے صواب دید پر ہوگا۔

دواؤں کی مقدار میں اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک دوا ہمیشہ ایک ہی مرض میں استعمال نہیں ہوتی، بلکہ ایک سے زیادہ امراض میں اس کا استعمال کیا جاتا

ہے اور مختلف امراض میں اس کی مختلف مقدار کارگر ہوتی ہے، مثلاً اذراقی کو جب اعصابی امراض میں استعمال کرتے ہیں تب ۶۰ رملی گرام دوا کافی ہوتی ہے لیکن وجع المفاصل میں اس کی مقدار ۱۲۵ رملی گرام تک بڑھائی جاسکتی ہے۔ شربت دینار کم مقدار میں ملین جب کہ زیادہ مقدار میں مسہل ہوتا ہے۔ اسی طرح مدت استعمال کی بنا پر بھی دوا کی مقدار تبدیل ہوجاتی ہے۔ اگر مرض متقاضی ہے کہ دوا کو کئی ہفتوں تک استعمال کیا جائے تو دوا کی مقدار نسبتاً کم ہوگی اور اگر صرف چند خوراک ہی استعمال کی جانی ہیں تو اس کی مقدار زیادہ ہوسکتی ہے۔

کسی دوا کی مقدار خوراک طے کرتے وقت ابتداءً اس کی قلیل ترین مقدار کا تعین کرنا ہوتا ہے، ایسی قلیل مقدار جو ادنیٰ تاثیر پیدا کرسکتی ہو، دوسرے وہ کثیر مقدار خوراک جس سے جانبی اثرات رونما ہونے کی ابتداء ہونے لگے۔ تیسری مقدار جو ان دونوں کے درمیان ہوگی، خود بخود طے ہوجائے گی۔ اس درمیانی مقدار کو بنیاد بنا کر اطباء مقدارِ دوا کے حدود متعین کرتے ہیں۔ مثلاً کسی دوا کی قلیل ترین مقدار ۲ رگرام اور کثیر ترین مقدار ۱۰ رگرام ہے تو اس کی اوسط مقدار ۶ رگرام ہوئی، ایسی صورت میں اطباء اس کی حد ۵-۷ رگرام متعین کریں گے، جو بالغ شخص کی مقدار ہوگی۔ البتہ جب دوا بچوں، بزرگوں، خواتین یا مخصوص مرضی کیفیت میں دینی ہوگی تو پھر ابتدائی دونوں حدود (۲-۱۰ رگرام) کا خیال رکھنا ہوگا۔ معالج کو آزادی ہوگی کہ مرض کی شدت وخفت کے پیش نظر وہ قلیل وکثیر کے درمیان کوئی بھی مقدار مریض کو استعمال کرائے، البتہ حدود کو تجاوز کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ تخم خیارین کی مقدار کے سلسلے میں ایک طبیب کا درج ذیل بیان اس مسئلے کی بہتر وضاحت کرتا ہے:

> ''اس کا کامل وزن ۲۰ رگرام ہے اور یہ اس شخص کے لیے ہے کہ جس کا سحنہ (ڈیل ڈول) کامل ہوگیا ہو، پس وہ شخص جس کی عمر ابھی ۱۵-۱۶ رسال ہی ہو لیکن اس کا سحنہ کامل ہوگیا ہو، اس کے لیے مقدار خوراک کامل ہے۔ وہ شخص جو ۱۹ رسالہ ہوا ور سحنہ کامل نہ رکھتا ہو اس کے لیے سُدس یا سُبع کم کرکے دیتے ہیں۔ اطفال کے لیے وقت سے دودھ چھڑانے پر ۳ رگرام ۵ رسال تک، اور کبھی چار گرام بھی دیتے ہیں۔ اس وقت سے ۱۲ رسال تک ۱۰ رگرام تک پہنچاتے ہیں۔ درمیان میں ۱، ۲، ۳، ۶ رگرام تک زیادہ کرتے ہیں یہاں تک کہ ۱۰ رگرام تک پہنچ جائے اور اس وقت سے ۶، ۷ رسال تک اسی دستور کے مطابق پہنچاتے ہیں۔ اگر اس کے مغز کو استعمال کرائیں تو مقشر کرکے نصف دیں۔''

کبھی درمیانی مقدار خوراک اس قدر اثر پیدا کرتی ہے کہ یہ جانبی اثر شمار کیا جاتا ہے اور کبھی اتنا کم اثر پیدا کرتی ہے کہ یہ معالجے کے لیے ناکافی ہوتا ہے، لہٰذا مریض کی عمومی اور مرضی کیفیت کا صحیح اندازہ لگانا اور مناسب مقدارِ دوا کا تعین کرنا انتہائی ضروری ہے۔ دیگر امور کے علاوہ مقدارِ دوا کی دو انتہاؤں سے صحیح مقدار خوراک کو طے کرنے میں طبیب کے تجربے اور اس کی ذہانت کا رول زیادہ اہم ہوتا ہے۔

وہ سارے امور جو دوا کی تاثیر میں ترمیم کرسکتے ہیں، دوا کی مقدار کو طے کرنے میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ ان امور کا تعلق جہاں دوا کے خواص، اس کی شکل وصورت اور مسالک وغیرہ سے ہے، وہیں مریض کی عمر، جسمانی ساخت ومنافع الاعضائی کیفیت، مرض کی نوعیت، دیگر امراض کی موجودگی اور ایک ساتھ متعدد ادویہ کے استعمال پر بھی ہے۔ دیگر خارجی عوامل جیسے موسم، خطے اور رہائشی علاقے بھی دوا کی تاثیر میں کمی اور بیشی کا سبب بن سکتے ہیں، لہٰذا دوا کی قلیل وکثیر مقدار کے حدود کا تعین محققین اور تشکیل دوا (Drug Development) سے وابستہ ریسرچرس کا کام ہے، لیکن مقداری حدود (Dose range) کے اندر مناسب مقدار کو طے کرنا بنیادی طور پر طبیب کا کام ہے، لہٰذا اس کو مذکورہ سارے امور کا پاس رکھنا ضروری ہے تاکہ مرض کی مناسبت سے دوا کی صحیح مقدار متعین ہوسکے۔

قدرِ شربت کے تعین میں ایک مسئلہ یہ بھی زیر بحث رہتا ہے کہ 'کامل مقدار خوراک' کس کو دی جائے گی؟ اس کا تعین عمر کی بنیاد پر ہوگا یا وزن وسحنہ کی بنیاد پر؟ بیشتر اطباء نے کامل مقدار کے لیے عمر کو بنیاد بنایا ہے، البتہ تعیین عمر میں اختلاف ہے۔ بعض اطباء ۱۶-۷۰ رسال کی عمر کو کامل مقدار خوراک کے لیے موزوں سمجھتے ہیں، جب کہ دوسرے ۲۱-۶۰ رسال کی درمیانی عمر کو۔ اس عمر سے پہلے اور بعد کے سالوں میں دوا کی مقدار کو کم کرکے استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے تو درمیانی عمر (۱۶-۷۰) کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا ہے (۱۶-۳۴، ۳۵-۵۹، ۶۰-۷۰)، ان اعمار میں بھی دوا کی قدر کو کم وبیش کیا جاتا ہے۔

بچوں میں مقدار خوراک کا تعین بہت ہوشیاری اور احتیاط سے کیا جاتا ہے ورنہ زیادہ مقدار کے سبب جانبی اثرات پیدا ہوتے ہیں اور کم مقدار کے استعمال سے بہت کم تاثیر پیدا ہوتی ہے، جو دفع مرض کے لیے ناکافی ہوتی ہے اور بسااوقات Resistance کا سبب بنتی ہے۔ بچوں اور بزرگوں میں دوا کا انجذاب واستحالہ اور نتیجتاً دوائی تاثیر کا میزانیہ بڑوں سے قدرے مختلف ہوتا ہے، لہٰذا ان کی مقدار خوراک اس بنیاد پر طے نہیں کی جاسکتی کہ بچے کو ایک کم عمر نوجوان تسلیم کرلیا جائے۔ یونانی طب اور دیگر روایتی طبوں، مثلاً آیورویدا وغیرہ میں مقدار خوراک کا تعین زیادہ تر عمر کے پیش نظر ہی کیا جاتا رہا ہے۔ عمر کی مناسبت سے انسان کی زندگی کو چند ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے پھر ہر دور کے لیے ایک مخصوص مقدار خوراک طے کردی جاتی ہے یا ان کا دائرہ اور حدود بتادی جات ہیں۔ پھر اطباء کو اس بات کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ اس دائرے کے اندر رہ کر مختلف امراض کی نوعیت، مزاجِ ادویہ کی رعایت اور اپنی تجرباتی بصیرت کی روشنی میں مناسب مقدار طے کرلیں۔

عام طور سے دو سال سے کم کے بچوں کو بڑوں کی مقدار کا ایک چوتھائی (¼)، ۶/سال تک کے بچوں کو ایک تہائی (⅓)، ۹/سال تک کے بچوں کو نصف (½)، اور ۱۵/سال تک کے بچوں کو تین چوتھائی (¾)، مقدار دی جاتی ہے۔ بعض اطباء نے ۱۶/سال تک کی عمر کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے، ۱/سال تک کے بچے، ۱-۴/سال تک کے بچے اور ۴-۱۶/سال تک کے بچے۔ ان اعمار کے بچوں کے لیے دوا کی مخصوص مقدار کامل مقدار کے تناسب میں طے کردی گئی ہے۔ مقدار کے تعین کی ایک آسان ترکیب یہ پیش کی گئی کہ ۱/ماہ کے بچوں کو ۱۲۰/ملی گرام دوا دی جائے پھر ہر ماہ اسی مقدار کا اضافہ کیا جائے، اس طرح ۱/سال کے بچے کی مقدار ۴۴۰/گرام ہوجائے گی۔ ۱/سال کے بعد ہر سال مقدار میں ۵۰/ملی گرام کا اضافہ کریں، اس طرح ۱۶/سال کی عمر کے لیے دوا کی مقدار کم وبیش ۱۲/گرام ہوجائے گی۔ یہ مقدار درجۂ اول کی دوا کی ہوگی، باقی درجات کی ادویہ کے لیے ان کی کم مقدار کے تناسب سے Calculation کیا جائے گا۔ لیکن ان اصولوں کو حتمی نہیں کہا جاسکتا، ضرورت کے لحاظ سے ان میں کمی وزیادتی کی جاسکتی ہے۔ بعض صورتیں تو ایسی ہیں جن پر عام اصول کا اطلاق ہی نہیں ہوتا بلکہ جو مقدار مذکورہ اصولوں کے مطابق طے ہوتی ہے اس میں کمی وزیادتی کردی جاتی ہے۔ بچے نشہ آور ادویہ، مثلاً افیون اور بھنگ وغیرہ سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں، لہٰذا ان کی مقدار کے تناسب کو کم کردیتے ہیں۔ اس کے برعکس ان میں سنکھیا اور لفاح وغیرہ کو برداشت کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، ان ادویہ کی مقدار کو کچھ بڑھا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بچوں میں مقدار دوا کے تعین کے مذکورہ طریقے جو عمر پر منحصر ہیں، بظاہر غیر معروضی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ایک ہی عمر کے دو بچوں کی ساخت اور وزن میں واضح فرق ہوسکتا ہے، اس صورت میں دوا کی ایک مقدار خوراک دونوں میں یکساں اثر پیدا نہیں کرے گی۔ مغربی طب میں بھی دواؤں کی مقدار کو متعین کرنے کے لیے عمر کی بنیاد پر بعض اصول وضع کیے گئے ہیں جن کو مختلف فارمولوں کی مدد سے Calculate کیا جاتا ہے، چند کا تذکرہ ذیل میں پیش ہے:

1. Young's Rule

$$\frac{\text{Age in years}}{\text{Age in years} + 12} = \textit{Proportion of adult dose}$$

e.g. for a child of 6

$$\frac{6}{6+12} = \frac{1}{3} \textit{ of adult dose}$$

2. Dilling's Rule

$$\frac{\text{Age in years}}{20} = \textit{Proportion of adult dose}$$

e.g. for a child of 6 years

$$\frac{6}{20} = \frac{3}{10} \textit{ of adult dose}$$

3. Fried's Rule

$$\frac{\text{Age in months}}{150} = \textit{Proportion of adult dose}$$

e.g. for a child of 6 months

$$\frac{6}{150} = \frac{1}{25} \textit{ of adult dose}$$

دواؤں کی قدرِ شربت کے تعین کے مندرجہ بالا طریقے خواہ یونانی طب کے معمولات سے ماخوذ ہوں یا جدید دواسازی کے ریاضیاتی اصولِ اوزان سے، دونوں میں خامی یہ ہے کہ دوا کے وزن/مقدار کا تعین مریض کی عمر پر کیا جاتا ہے، اس کی جسمانی ساخت، وزن اور منافع الاعضائی کیفیت جس میں ہضم واستحالہ اور انجذاب واخراج جیسے اہم امور شامل ہیں یکسر نظر انداز ہوجاتے ہیں۔ ایک ہی عمر

کے دو بچوں میں یہ امور ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے، لہٰذا صحیح مقدار کا تعین ہمیشہ ممکن نہیں ہو پاتا۔ اس خامی کو دور کرنے کے لیے دو اور تجربات کیے گئے ہیں۔ ایک تو جسمانی وزن کی مناسبت سے مقدار خوراک کا تعین کیا گیا اور دوسرے جسم کے سطحی رقبے کی بنیاد پر۔ وزن کے لحاظ سے دوا کی مقدار کو طے کیے جانے کے پیچھے یہ اصول کارفرما ہے کہ اپنی جائے کار پر دوا کا ارتکاز جسمانی ساخت کی مناسبت سے (کم یا زیادہ) ہوتا ہے، لہٰذا وہ افراد جو قوی الجثہ ہیں ان کو دوا کی زیادہ ضرورت درپیش ہوگی بہ نسبت ان کے جو دبلے پتلے اور کم وزن ہیں۔ اسی اصول کے پیش نظر بوڑھوں، بچوں، خواتین اور صحتمند لوگوں کے لیے دوا کی مقدار خوراک طے کی جائے گی۔ اگر ایک دوا کی مقدار خوراک ۵۰ر ملی گرام فی کلوگرام ہے تو ۶۰ر کلو کے آدمی کی مقدار ۳ر گرام ہوگی، ۲۰ر کلو کے بچے کی ۱ر گرام اور ۵ر کلو وزن کے بچے کی ۲۵۰ر ملی گرام۔ مقدار خوراک کے تعین کا یہ طریقہ زیادہ مستعمل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی مدد سے مقدار خوراک کا Calculation نسبتاً آسان ہوتا ہے۔

لیکن جسم کے سطحی رقبے کی بنیاد پر مقدار دوا کے تعین کے طریقے کو زیادہ معقول تسلیم کیا گیا ہے، کیونکہ متعدد جسمانی امور مثلاً استحالہ، افعال کلیہ اور بیرون خلوی رطوبات کے توازن وغیرہ کا تعلق سطحی رقبے سے زیادہ ہے، بہ نسبت عمر یا وزن کے، لہٰذا جو مقدار سطحی رقبے کی مناسبت سے طے کی جائے گی وہ جسمانی ضرورتوں کے لحاظ سے زیادہ موزوں ہوگی۔ بچوں اور بزرگوں میں بالخصوص اس طریقے کا زیادہ اہم رول ہے۔ اسے مندرجہ ذیل فارمولے سے Calculate کیا جاتا ہے:

$$\frac{\text{Body surface area of child}}{\text{Body surface area of adult}} \times \textit{Adult dose} = \textit{Child dose}$$

بالغ انسان کے جسم کا اوسط سطحی رقبہ بالعموم ۱٫۷۳ اسکوئر میٹر تسلیم کیا جاتا ہے، لہٰذا بچے کے سطحی رقبہ (اسکوائر میٹر) کو بالغ انسان کے رقبہ سے تقسیم کردیں اور حاصل قسمت کو بالغ شخص کی مقدار خوراک سے ضرب دے دیں تو حاصلِ ضرب بچے کی مقدار خوراک ہوگی۔ اس طریقۂ کار میں یہ دشواری ہے کہ بچوں کا سطحی رقبہ معلوم کرنا ایک مشکل کام ہے اور طبیب کے لیے شاید ممکن نہ ہو کہ وہ ہر فرد کا سطحی رقبہ معلوم کرسکے۔ اس کام کو یوں آسان بنایا گیا کہ بچے کی عمر اور وزن کی مناسبت سے جو سطحی رقبہ تخمیناً طے پاتا ہے، اس کی رعایت سے دوا کی مقدار کی فیصد، بڑوں کے مقابلہ میں متعین کردی گئی ہے۔

درج ذیل جدول سے بچوں کی مقدار آسانی سے معلوم کی جاسکتی ہے:

بالغ مقدار خوراک کا فیصد (% of adult dose)	اوسط متعلقہ عمر (Average corresponding Age)	وزن [کلوگرام میں] (Weight [in kg])
۱۲٫۵	وقت پیدائش (نومولود)	۳٫۲
۱۵	۲/ماہ	۴٫۵
۲۰	۴/ماہ	۶٫۵
۲۵	۱۲/ماہ	۱۰
۳۰	۱۸/ماہ	۱۱
۳۳	۳	۱۵
۴۰	۵	۱۸
۵۰	۷	۲۳
۶۰	۱۰	۳۰
۷۰	۱۱	۳۶
۷۵	۱۲	۴۰
۸۰	۱۴	۴۵
۹۰	۱۶	۵۴
۱۰۰	۲۰	۶۵

خلاصہ یہ کہ دواؤں کی مقدار کے سلسلے میں اطباء ہمیشہ حساس رہے ہیں اور اس اہمیت سے واقف کہ ان کے افعال کی معروضیت اور مختلف امراض اور ماہیت المرضی کیفیات میں ان کا استعمال، اکثر مقدار کے تابع ہوتا ہے۔ اس بنا پر مفرد اور مرکب دواؤں کے تذکرے کے وقت ان کی مقدار کو پورے اہتمام کے ساتھ طبی کتابوں میں درج کیا گیا ہے۔ مختلف مصری بردی نوشتوں (Papyri) میں تو دوا کی مقدار اور اوزان کو سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے جب کہ ان کا باقی حصہ سیاہ روشنائی سے رقم ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوا کی مقدار کو ابتدائی دور سے ہی غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اطباء نے ان احوال کا ذکر اہتمام سے کیا ہے جن میں دوا کے افعال میں خارجی اور ماحولیاتی عوامل کے تحت تغیر واقع ہوتا ہے، اور ان داخلی یا جسمانی احوال کا تذکرہ بھی کیا ہے جو دوا کے خواص یا ان کے افعال میں تغیر کا سبب بنتے ہیں۔ انھیں دونوں وجوہات کی بنا پر مختلف مواقع پر دوا کی مختلف مقدار کا استعمال کیا جاتا ہے۔ خارجی عوامل جیسے ماحول، آب و ہوا، علاقہ، مٹی کی کیفیات، موسم، کاشت کے طریقے، حصول کے ذرائع و ذخیرہ اندوزی اور اعمال تدبیر و تصفیہ وغیرہ دوا کے خواص اور ان کی مقدار کو متعین کرتے ہیں۔ اسی طرح داخلی یا جسمانی عوامل جیسے مزاج، عمر، جنس، استحالہ، امراض کی شدت و خفت، متعدد امراض کی موجودگی، عادات و اطوار اور ایک ساتھ کئی دواؤں کا استعمال وغیرہ بھی دوا کی تاثیر اور اس کی مقدار کو متعین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی دوا کی مختلف مقدار طبی کتب میں درج کی گئی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ اور تجربہ کار معالج اپنے علم و عرفان اور تجربہ و حذاقت کی روشنی میں صحیح مقدار کا تعین کرلیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

[غیر مطبوعہ کتاب 'اصول دواسازی' از پروفیسر غفران احمد سے ماخوذ]

ماءالشعیر (جوکا پانی)

[Barley water]

پروفیسر غفران احمد ☆

جَو کے پانی کو ماءالشعیر کہتے ہیں، یہ بہ ترکیب خاص تیار کیا جاتا ہے۔ اس کو شعیرہ، آب جوافشردہ، آب جوجوشانیدہ (جَو کا جوشاندہ)، کشکاب، یوہ گو (ہندی) بھی کہتے ہیں۔ یہ مغذی ہوتا ہے اور مریضوں، ضعیفوں اور ناتواں لوگوں کو تغذیہ فراہم کرنے کے لیے بطور خاص استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض مزمن امراض مثلاً دق وسل اور سرطان وغیرہ میں اس کی خصوصی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ بزرگوں اور بچوں میں اس کا استعمال غیر مرضی کیفیت میں بھی کیا جاتا ہے تاکہ بچوں کی اچھی نشوونما ہوسکے اور بزرگوں کو مطلوبہ اضافی غذائیت مل سکے اور ان کے نظام ہضم واستحالہ پر زیادہ بار نہ پڑے۔ مریضوں میں اس کا استعمال بطور بدرقہ یا بطور غذائی تکملہ (Dietic supplement) عام ہے۔ اسی طرح جب اسہال وپیچش وغیرہ کی صورت میں جسم میں پانی، نمکیات اور غذائی مادوں کی کمی ہوجاتی ہے تو اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں وٹامن، نمکیات، کاربوہائیڈریٹ کے مختلف مرکبات اور پروٹین وغیرہ وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں، اس بنا پر اس کو حسب ضرورت تغذیہ ومعالجہ دونوں اغراض سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس بات پر اطباء کا اتفاق ہے کہ کوئی دوائے غذائی آش جو جیسی کثیر المنافع نہیں ہے۔ اس میں دس خواص کی نشاندہی کی گئی ہے: (۱) سرد ہے، (۲) نضج پیدا کرتا ہے، (۳) مواد محترقہ کو نکالتا ہے، (۴) معدے کا تنقیہ کرتا ہے، (۵) بدن میں جلد نفوذ کرتا ہے، (۶) لذیذ ہوتا ہے، (۷) معتدل الغذاء ہے، (۸) اخلاط فاسدہ میں ہیجان پیدا نہیں کرتا، (۹) معدے میں پھولتا نہیں، (۱۰) پیاس بجھاتا ہے۔ انھیں خواص کی بنا پر اس کا استعمال زمانۂ قدیم سے رائج ہے۔ ابن ماسَوَیہ نے نویں صدی کے آغاز میں ماءالشعیر پر ایک رسالہ تحریر کیا تھا جس میں اس کے طریقۂ تیاری اور معالجاتی استعمالات کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ یہ حارامراض میں مفید ہے اور برودت و رطوبت پیدا کرتا ہے، نضج وتنقیہ کرتا ہے، پیاس کی شدت کو بجھاتا ہے، دبلے پتلے اور سل ودق کے مریضوں کے لیے خاص طور سے مفید ہے۔

طریقۂ تیاری

جو کے اچھے اور قدرے موٹے دانے لے کر پانی میں بھگودیں۔ جب یہ پھول جائیں تو پانی سے نکال کر کسی مسطح فرش پر مرطوب اور نسبتاً گرم مقام پر پھیلا دیں تاکہ ان میں انکھوا نکل سکے۔ انکھوا نکلنے کے بعد ان کو ہلکی آنچ پر بھون لیں تاکہ انکھوے کی افزائش موقوف ہوجائے اور دانے خشک ہوجائیں۔ اب جَو کو ہاون دستے یا اوکھلی میں کوٹ لیں اور بھوسی اور انکھوے کو صاف کرلیں۔ اس مقشر اور صاف ستھرے جَو کو شعیرہ بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مقشر جو کی مقررہ مقدار برتن میں رکھ کر اس میں پانچ گنا پانی شامل کریں اور کسی گرم جگہ، مثلاً چولھے کے پیچھے یا گرم راکھ پر رکھ دیں، البتہ خیال رہے کہ اس کا درجۂ حرارت ۵۰/اور ۶۰/ڈگری کے درمیان رہے۔ اس طرح دو گھنٹے تک رکھنے کے بعد پانی کو نتھار لیں اور جو میں پھر اسی مقدار میں پانی شامل کریں اور دوبارہ دو گھنٹے رکھ کر پانی کو نتھار لیں۔ اس طرح دو قسطوں میں جو کے وزن کا دس گنا پانی شامل کرتے ہیں۔

☆ سابق صدر شعبۂ علم الادویہ، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش۔

اس عمل کے بعد جو پانی حاصل ہوتا ہے اس کو کم پریشر پر کسی Vacuum pan میں رکھ کر گرم کرتے ہیں تا کہ اس کی تبخیر ہو سکے، البتہ درجۂ حرارت کو ۵۵ڈگری سے زیادہ نہیں بڑھاتے۔ جب مطلوبہ ارتکاز کا آشِ جو تیار ہو جاتا ہے تو تبخیر کے عمل کو موقوف کر دیتے ہیں اور اس کو استعمال کے لیے محفوظ کر لیتے ہیں۔ چونکہ جو کو بھگونے کے بعد اس کا پانی دو بار میں اور دو گھنٹے کے وقفے سے حاصل کیا جاتا ہے، لہٰذا چاہیں تو دونوں کی الگ الگ کم پریشر پر تبخیر کر لیں یا بعد میں حاصل ہونے والے پانی کو اسی Vacuum pan میں ڈال دیں جس میں پہلے والے پانی کی تبخیر کی جا رہی ہو اور مناسب وقت تک گرم کر کے گاڑھا کر لیں۔

ایک کلوگرام جو سے ۷۵۰ملی لیٹر آش جو حاصل کیا جاتا ہے، جس میں نمکیات، حیاتین اور شحمین کے علاوہ وافر مقدار میں ڈکسٹروز، مالٹوز، سوکروز اور ڈکسٹرین وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ یہ ایک طرف تو فوری غذائیت اور ضروری حراروں کی رسد کرتے ہیں اور دوسری جانب جسم میں ہونے والے مستقل کون و فساد میں توازن قائم رکھتے ہیں تا کہ جسمانی نظام اپنی کارکردگی اچھی طرح انجام دے سکے۔ انہیں اجزائے غذائی اور منافعِ دوائی کی وجہ سے ماء الشعیر کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔

حالانکہ آش جو ایک طرح کا عصارہ ہے، جو جَو کو بھگو کر اس سے کشید کیا جاتا ہے اور جس طرح عام نباتی ادویہ سے عصارہ حاصل کرتے ہیں اسی طرح اس سے بھی حاصل کیا جاتا ہے، لیکن دیگر عصاروں سے جو چیز آش جو کو ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ آش جَو کے اندر جو اجزاء پائے جاتے ہیں وہ بنیادی طور پر جَو کے اندر موجود نہیں ہوتے ہیں۔ آش کی تیاری کے دوران مختلف اعمال کیمیاوی کے زیر اثر اس میں کچھ نئے اجزاء کی تکوین ہوتی ہے جس کے سبب یہ عام عصارے سے مختلف ہو جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ آش جو کے خواص، جو یا عصارۂ جو کے خواص سے مختلف ہوتے ہیں، اس میں غذائیت زیادہ ہوتی ہے اور بعض دوائی خواص بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مذکورہ اعمال جو آش جَو کے حصول کے لیے کیے جاتے ہیں، ان کے دوران بعض کیمیاوی تصرفات ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں جَو کے اندر موجود بعض غیر حل پذیر مادے، حل پذیر مادوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو غذائی اور دوائی افادیت کے حامل ہوتے ہیں، اسی بنا پر آش جَو کے خواص جَو کے خواص سے یکسر مختلف ہو جاتے ہیں۔ جَو میں نشاستہ (Starch) وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ جب جَو کو کوٹ کر پانی میں بھگوتے اور گرم مقام پر رکھتے ہیں تو دو گھنٹے کے اندر ہی اسٹارچ اور ایک خامرہ/انزائم Diastase جو جَو کے اندر ہی پایا جاتا ہے میں تعامل ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اسٹارچ جو غیر حل پذیر ہوتی ہے متعدد حل پذیر اجزاء مثلاً مالٹوز، ڈکسٹروز اور ڈکسٹرین وغیرہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چونکہ Diastase میں عام طور سے ۵۵ڈگری درجۂ حرارت سے زیادہ پر کسر واقع ہونے لگتا ہے، لہٰذا اس کو بھگونے، بھوننے اور اس پر تبخیر کے عمل کو نسبتاً کم درجۂ حرارت پر ہی انجام دیتے ہیں تا کہ یہ اپنی طبعی حالت پر قائم رہے اور کیمیاوی عمل انجام دے سکے۔

ماء الشعیر بنانے کا جو طریقہ دواسازی اور طب کی کتب میں مذکور ہے اور جو اطباء کے معمولات میں بھی شامل ہے وہ اس طریقے سے قدرے مختلف ہے جس کی تفصیل اوپر بیان کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ اختلاف معمولی نوعیت کا ہے لیکن صیدلی اعمال کے معمولی اختلاف کے باوجود دونوں طریقوں سے بنائے جانے والے ماء الشعیر کے خواص اور افادیت میں غیر معمولی اور نمایاں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ ماء الشعیر کی تیاری کے وقت اگر اس فرق کو مدنظر رکھا جائے تو زیادہ بہتر ماء الشعیر حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کی تیاری کا جو طریقہ مروج ہے اور بیشتر کتابوں میں رقم ہے، اس کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

عمدہ قسم کے جَو لے کر پانی میں بھگو دیں۔ جب وہ پھول جائیں تو پانی سے نکال کر دھوپ میں رکھ کر یا توے پر ہلکی آنچ پر بھون کر خشک کر لیں اور خشک شدہ جو کو اوکھلی میں کوٹ کر اس کے قشر کو علاحدہ کر لیں۔ حاصل شدہ مقشر جَو کو پانی میں ڈال کر جوش دیں، جب یہ پھٹ جائیں اور پانی کا قوام غلیظ اور رنگت سرخی مائل ہو جائے تو پانی کو چھان کر علاحدہ کر لیں، یہی آشِ جو ہے۔

آشِ جو کی دونوں تراکیب تیاری میں دو بنیادی فرق بہت واضح ہیں۔

طریقۂ اول میں جَو کو بھگونے کے بعد ایک خاص ماحول میں اس وقت تک رکھتے ہیں کہ اس میں انکھوا نکل سکے۔ انکھوا نکلنے کے وقت اسٹارچ کی سب سے زیادہ مقدار بیجوں میں پائی جاتی ہے اور انزائم کی بھی زیادہ مقدار اسی وقت موجود ہوتی ہے۔ جب کہ طریقۂ ثانی میں جَو کو بھگونے کے بعد اس کو خشک کر لیتے ہیں، اس میں انکھوا نکلنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ اس طرح طریقۂ ثانی میں طریقۂ اول کی بہ نسبت انزائم اور اسٹارچ، جن کے تعامل سے مختلف غیر حل پذیر مادوں کو حل پذیر مادوں میں تبدیل ہونا ہوتا ہے، کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ طریقۂ ثانی میں جَو کو پانی کے ساتھ جوش دے کر عصارہ حاصل کیا جاتا ہے جب کہ طریقۂ اول میں جو کو پانی کے ساتھ جوش نہ دے کر صرف اس کو گرم مقام پر رکھتے ہیں تا کہ ایک مخصوص درجۂ حرارت پر انزائم کے زیر اثر اسٹارچ حل پذیر مرکبات میں تبدیل ہو سکے۔ پھر حاصل شدہ پانی کی کم پریشر پر تبخیر کی جاتی ہے تا کہ مخصوص ارتکاز کا آش جَو تیار ہو سکے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ڈائسٹیز جو نشاستہ کو گلوکوز اور فرکٹوز وغیرہ میں تبدیل کرتا ہے ۵۵/ڈگری سینٹی گریڈ درجۂ حرارت سے زیادہ پر ضائع ہونے لگتا ہے، لہٰذا جَو کو پانی کے ساتھ جوش دینے سے یہ انزائم ضائع ہو جاتا ہے اور نشاستہ حل پذیر غذائی اجزاء میں تبدیل نہیں ہو پاتا، نتیجتاً حاصل شدہ آش جو میں غیر حل پذیر اجزاء زیادہ ہوتے ہیں اور اس میں وہ خواص پیدا نہیں ہو پاتے جو غذائی اور دوائی اوصاف کی بنا پر مطلوب ہیں اور جن کے سبب اسے ایک اہم غذا اور غذائے دوائی کا مقام حاصل ہے۔

ماء الشعیر محمص (بھنے ہوئے جَو کا پانی)

ماء الشعیر محمص تو دراصل وہی ہے جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے کہ جَو میں جب انکھوا نکل آئے تو اس کو بھون لیں تا کہ اس کا پانی خشک ہو جائے اور انکھوا نکلنے کا عمل موقوف ہو جائے۔ پھر کوٹ کر اس کا قشر علاحدہ کر لیں اور باقی عمل مذکورہ طریقے سے کریں۔ لیکن بیشتر طبی کتب میں یہ ترکیب لکھی ہے کہ جَو کو جب کوٹ کر بھوسی علاحدہ کر لی جائے تو مغز کو پہلے توے یا کڑاہی میں بھون کر باقی عمل کیا جائے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بشرطیکہ جو کو ہلکی آنچ پر بھونا جائے اس لیے کہ زیادہ حرارت پر اس انزائم کا بطلان ہونے لگتا ہے جو آشِ جو میں نئے اوصاف پیدا کرنے کا محرک ہوتا ہے۔

کشک الشعیر

کشک الشعیر ماء الشعیر کی زیادہ غلیظ شکل ہے جس میں شعیر کے اجزاءِ لطیفہ کے علاوہ اس کے غیر حل پذیر اجزاء بھی شامل ہوتے ہیں۔ غیر حل پذیر اجزاء میں بھی غذائیت ہوتی ہے لیکن ماء الشعیر کے اجزاء سے کم۔ جَو کو مقشر کر کے جب اسے پانی میں جوش دیتے ہیں اور آش جو تیار ہو جاتا ہے تو اسے چھان کر علاحدہ نہیں کرتے بلکہ اس کو خوب گھونٹتے ہیں جس سے جو کے غیر حل پذیر اجزاء بھی پانی میں شامل ہو جاتے ہیں اور غلیظ آمیزہ تیار ہوتا ہے جس کو 'کشک الشعیر' کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ اس غرض سے تیار کیا جاتا ہے کہ اس میں زیادہ غذائی اجزاء شامل ہوں گے اور یہ زیادہ مقوی ہوگا، لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے، کہ اس میں ماء الشعیر والی خوبی پیدا نہیں ہو پاتی، البتہ ایک زود ہضم اور لطیف غذا ضرور تیار ہو جاتی ہے۔ ان مریضوں کے لیے جن کو لطیف اور زود ہضم غذا کی ضرورت ہوتی ہے یہ ایک اچھا غذائی بدل ہے۔ اس میں اضافی وصف یہ ہوتا ہے کہ اس کے استعمال سے نفخ، قبض، گرانی شکم جیسے عوارضات پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ جَو کو جب پانی کے ساتھ جوش دیا جاتا ہے تو اس میں خامراتی عمل نہیں ہو پاتا اور نئے غذائی عناصر نہیں بن پاتے جو ماء الشعیر کا جزو لازم ہیں۔ کشک الشعیر ان لوگوں کو استعمال کرایا جاتا ہے جن کو زود ہضم غذا کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ خون صالح جلد بن سکے اور کمزور جسم پر کارِ ہضم و عمل استحالہ کا زیادہ بار بھی نہ پڑے۔ سرطان، دق اور دیگر ایسے امراض جو مزمن ہونے کے سبب غیر معمولی ضعف کا سبب ہوتے ہیں، ان امراض میں کشک الشعیر مفید ثابت ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

[غیر مطبوعہ کتاب 'اصول دواسازی' از پروفیسر غفران احمد سے ماخوذ]

ماءاللحم (گوشت کا پانی)

پروفیسر غفران احمد ☆

گوشت میں قدرتی طور پر ایک آبی جز پایا جاتا ہے جو جرم گوشت کا تکوینی حصہ ہوتا ہے، اسی جز کو ماءاللحم کہتے ہیں۔ لیکن طب اور دواسازی میں ماءاللحم ایک مستقل اصطلاح ہے، جس کا اطلاق اس عرق پر ہوتا ہے جو گوشت سے حاصل شدہ پانی سے بذریعہ تعریق حاصل کیا جاتا ہے۔ کبھی اس پانی کو بھی ماءاللحم کہا جاتا ہے جو گوشت کو پکا کر بغیر تعریق کے صرف چھان کر حاصل کیا جاتا ہے، لیکن اطباء اسے ماءاللحم نہیں بلکہ یخنی مانتے ہیں۔ جب گوشت کو کاٹ کر پکایا جاتا ہے تو حرارت کی وجہ سے اس کا آبی جز گوشت سے علاحدہ ہوجاتا ہے۔ اگر برتن کو بند کر کے دیر تک پکایا جائے تو گوشت اسی پانی میں گل جاتا ہے۔ گوشت سے نکلنے والے پانی کو علاحدہ کر کے صاف کر لیتے ہیں اور بطور دوائے غذائی استعمال کرتے ہیں۔ گوشت ایک مستقل غذا ہے لیکن اس کے پانی کے اندر دوائی عنصر غالب ہوتا ہے، اس بنا پر اس کا استعمال مختلف امراض میں کیا جاتا ہے۔ ابن سینا کے مطابق گوشت اگرچہ محض ایک غذا ہے لیکن اس کا پانی ضعف قلب کے لیے اکسیر ہے۔ ماءاللحم حاصل کرنے کی مندرجہ ذیل تراکیب بیان کی گئی ہیں:

(۱): بکری کے بچے یا پرندوں کا صاف ستھرا گوشت جس سے ہڈی اور چربی کو نکال دیا گیا ہو، لے کر اس کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بنائیں یا قیمہ تیار کر لیں اور اسے ایک دیگ میں رکھ کر اس کے منہ کو اچھی طرح بند کر دیں۔ دیگ کو کوئلے کی آنچ پر رکھ کر پکائیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس کو ہلاتے رہیں تاکہ گوشت جلنے نہ پائے۔ جب اندازہ ہو کہ گوشت کا سارا پانی علاحدہ ہوگیا ہے تو حرارت دینا بند کر دیں اور چھان کر پانی کو علاحدہ کر لیں۔ اس پانی سے قرع انبیق کی مدد سے عرق حاصل کر لیں۔

(۲): فربہ گوشت لے کر اس سے چربی کو جدا کر لیں، پھر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے میٹھے پانی میں پکائیں تاکہ اچھی طرح گل جائے اور پانی گاڑھا ہوجائے۔ پورے مرکب کو قرع انبیق میں ڈال کر عرق کشید کر لیں۔

(۳): گوشت کو چربی اور سفیدی سے پاک کر کے کباب کریں پھر کسی پتیلے میں رکھ کر اس پر گلاب چھڑکیں اور برتن کا منہ بند کر کے آگ پر پکائیں تاکہ پانی گوشت سے جدا ہوجائے، لیکن گوشت ابھی پوری طرح پکا نہ ہو، اس کا پانی نچوڑیں تاکہ تری نکل آئے۔ تری کو ایک بار پھر جوش دیں تاکہ خوب پک جائے (تپ و دق کے مریضوں کے لیے مفید ہے، اسے بطور غذائے لطیف استعمال کرتے ہیں)۔ اسی تری کو قرع انبیق سے کشید کر کے پانی کو الگ کر لیتے ہیں جس کو بطور دوا استعمال کرتے ہیں۔

(۴): گوشت میں نمک شامل کر کے دیگ میں رکھیں اور اس کا منہ بند کر کے اچھی طرح پکائیں اور چھان لیں (یہ ماءاللحم نہیں یخنی ہے)۔

گوشت کے پانی کو بذریعہ تعریق حاصل کیا جاتا ہے۔ آلۂ تعریق کی مدد سے حاصل شدہ ماءاللحم کو عرق ماءاللحم کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں اطباء کا خیال ہے کہ یہ زیادہ سریع النفوذ اور لطیف ہوتا ہے، لہٰذا اس کی دوائی اور غذائی افادیت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ ماءاللحم جو آلۂ تعریق سے کشید نہ کیا گیا ہو اس کو اطباء ماءاللحم نہیں مانتے بلکہ یخنی تسلیم کرتے ہیں۔ یخنی غذائیت سے بھرپور ہوتی ہے لیکن اس میں دوائی عنصر کم ہوتا ہے، جب کہ ماءاللحم میں دوائیت زیادہ ہوتی ہے۔

گوشت میں کم وبیش ۷۵ر فیصد پانی ہوتا ہے، اس کے علاوہ ۱۹ر فیصد پروٹین، ۲٫۵ر فیصد شحم اور باقی امینوایسڈس، کاربوہائیڈریٹس، حیاتین اور منرلس

☆ سابق صدر شعبۂ علم الادویہ، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش۔

ہوتے ہیں۔ حیاتین دونوں طرح کی پائی جاتی ہیں، وہ جو پانی میں حل پذیر ہوتی ہے اور وہ بھی جو شحمی مادوں میں حل ہوتی ہے۔ گوشت میں جو پانی پایا جاتا ہے اس کی زیادہ مقدار گوشت کی ساخت اور خلیہ میں پائی جاتی ہے، کچھ حصہ Myofibril میں اور کچھ Myofibril کے درمیان اور باقی حصہ Myofibril اور Cell membrane کے درمیان پایا جاتا ہے۔ گوشت میں پانی کی کچھ مقدار آزاد شکل میں پائی جاتی ہے جو آزادانہ طور پر ایک حصے سے دوسرے حصے میں منتقل ہوتی رہتی ہے، جب کہ پانی کا کچھ حصہ مرکوز ہوتا ہے، یہ گوشت کے غیر آبی حصوں کے آس پاس ہی موجود ہوتا ہے جب کہ باقی حصہ محبوس ہوتا ہے جو اس کی ساختوں میں مقید رہتا ہے اور آسانی سے جدا نہیں ہوتا۔ گوشت کو جب حرارت دی جاتی ہے تو اس کا کچھ حصہ آسانی سے گوشت سے علاحدہ ہوجاتا ہے لیکن زیادہ حصہ جلد علاحدہ نہیں ہو پاتا، اس کے لیے مزید حرارت دینی ہوتی ہے۔ گوشت کے پانی کے ساتھ بہت سے اجزاء جو حل پذیر ہوتے ہیں آسانی سے پانی کے ساتھ گوشت سے نکل جاتے ہیں۔ گوشت کو جب پکایا جاتا ہے اور اس سے آبی اجزاء علاحدہ ہوتے ہیں تو ساتھ میں وٹامن، امینوایسڈ اور منرل کے اجزاء بھی آجاتے ہیں، اسی طرح کچھ مقدار لحمی اور شحمی مادوں کی بھی شامل ہوجاتی ہے۔ اگر اس کو چھان کر استعمال کیا جائے تو یہ نہ صرف غذائیت سے پُر ہوگا بلکہ بعض امراض وعوارضات میں بھی مفید ثابت ہوگا۔ لیکن اطباء نے ماء اللحم کو بذریعہ تعریق حاصل کرنے کی ہدایت کی ہے، اس صورت میں لحمین اور شحمین کی تو یقیناً تبخیر نہیں ہوگی اور نہ ہی وہ عرقِ ماء اللحم کا حصہ بنیں گے، لیکن عمل تعریق کے نتیجے میں گوشت کے آبی اجزاء اور وہ اجزاء جو حل پذیر ہوں گے عرق ماء اللحم کی شکل میں حاصل ہوں گے اور ان کی دوائی افادیت زیادہ ہوگی۔ ماء اللحم سے مراد اطباء کے یہاں یہی پانی ہے۔

بعد کے دور کے اطباء نے ماء اللحم یا گوشت کے پانی کو یخنی یا گوشت کا محلول گردانا جس میں گوشت کے پانی کے علاوہ لحمی اور شحمی اجزاء وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں، جو ہماری روزمرہ کی غذائیت کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس کو تیار کرنے کے لیے اسی روایتی طریقے کا استعمال کیا گیا جس سے ہم عام اوقات میں گوشت کی ڈش تیار کرتے ہیں۔ چنانچہ مسالہ جات اور دیگر خوشبودار اشیاء وافر مقدار میں شامل کی جانے لگیں اور اس میں بعض دواؤں کا بھی اضافہ ہونے لگا۔ عمل تعریق کو اس لیے مسترد کیا گیا کہ لحمی اور شحمی مادوں کی تبخیر اس درجۂ حرارت پر نہیں ہوتی جس پر عرق کشید کیا جاتا ہے۔ غالباً اطباء کے ذہن میں یہ بات جاگزیں ہوگئی تھی کہ ماء اللحم کے نام پر جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے وہ دراصل گوشت کے لحمی، شحمی یا دوسرے جامد اجزاء ہوتے ہیں جو اس پانی میں معصور ہوتے ہیں جس کو ہم گوشت کو پکاتے وقت الگ سے شامل کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں غالباً یہ بات نہیں آسکی کہ گوشت میں وافر مقدار میں پانی ہوتا ہے جس کو گوشت سے الگ کیا جاسکتا ہے اور جس کی غذائی یا دوائی منفعت ہوسکتی ہے۔ جب گوشت کے آبی اجزاء کی حقیقت اور ان کی غیر معمولی غذائی اور دوائی افادیت حاشیۂ خیال میں نہ ہو تو پھر ماء اللحم کے نام پر یخنی اور شوربہ ہی تیار کیا جاسکتا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف اول سے یونانی طب میں نام ونہاد جدید تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا جس کا سہرا حکیم اجمل خان کے سر ہے۔ طب کے اصول ومبادی اور متعلقہ اساسی علوم، اور ان کی بنیادوں پر وضع ہونے والے تحقیقی اصولوں کو ایک حد تک نظر انداز کر کے جدید سائنسی مناہج پر طب میں تحقیق وتدوین کا آغاز ہوا۔ کوشش اس بات کی کی جانے لگی کہ طبی حقائق کا جدید سائنس کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے اور جن حقائق کی سائنسی توثیق ہوجائے ان کی تعمیم کی جائے۔ اس سے یونانی طب کو قبول عام حاصل ہوگا اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اسے آسانی سے قبول کرلے گا۔ اصولاً یہ ایسی ہمالیائی غلطی تھی جو یونانی طب کے بیڑے کو غرق کرسکتی تھی، لیکن بھلا ہو بعض ان اطباء کا جنھوں نے اس غلطی کو بروقت بھانپ لیا اور یونانی طب کا احیاء اس کے بنیادی اصولوں پر کرنے کی کوشش کی اور تحقیق کے ایسے اصول وضع کیے جو طبی مبادیات سے ہم آہنگ تھے۔ دوسری بڑی غلطی یہ ہوئی کہ جو لوگ تحقیقی کاموں پر مامور کیے گئے تھے وہ یا تو یونانی طب سے واقف تھے یا مغربی طب اور سائنس سے، اس اجتماعِ ضدین کے جو خوفناک نتائج برآمد ہوسکتے تھے، اس کا اندازہ خود ماء اللحم پر کیے گئے تحقیقی کام سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس کام کے روحِ رواں ایک معروف ماہر کیمیا تھے، جو تحقیق کے جدید اصولوں سے تو واقف تھے لیکن یونانی طب کے مبادی سے نابلد تھے۔ اسی طرح جو حضرات یونانی طب کی نمائندگی

کررہے تھے وہ غالباً تحقیقی کاموں کے لیے جس بنیادی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے ناآشنا تھے، انھوں نے اس تحقیقی کام کے لیے جو بنیادی معلومات فراہم کیں اس سے نہ یہ کہ نفس مسئلہ واضح نہیں ہوا بلکہ اس کی غلط تصویر کشی ہوئی، نتیجتاً تحقیقی کام کے لیے جو منصوبہ تیار ہوا، اس میں منطقی اور تکنیکی سقم جگہ پا گیا اور اس ریسرچ سے جو نتائج نکلے وہ یونانی نظریات واعمال سے مغائر تھے۔

تحقیق کا بنیادی اصول ہے کہ نفس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے محقق ایک خیالی منصوبہ (Hypothesis) قیاسی بنیادوں پر وضع کرتا ہے۔ اس منصوبے کو بنانے کے لیے وہ نفس مضمون سے متعلق سارے علمی سرمائے کی ورق گردانی کرتا ہے، آراء کے اختلافات کو باریک بینی سے پرکھتا ہے، فن کے ماہرین سے تبادلۂ خیال کرتا ہے، اپنے علم، فہم اور وجدان کا استعمال کر کے وہ حاصل شدہ معلومات کا باریک بینی سے تجزیہ کرتا ہے اور ایک نتیجے پر پہنچتا ہے کہ نفس مسئلہ کا ممکنہ حل یہ ہے۔ اپنے قیاس کا جواز وہ موجودہ علوم، نئی تحقیقات اور عقل سلیم سے فراہم کرتا ہے۔ اس کے بعد کا سارا تحقیقی کام اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس سے ایسے شواہد حاصل ہوں جو Hypothesis کی تصدیق یا تکذیب کرسکیں۔ دونوں ہی صورتوں میں حقیقت تک رہنمائی ہوتی ہے اور علم میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اگر Hypothesis صحیح خطوط پر نہیں وضع کی گئی ہے تو تحقیقی کاموں سے کبھی ایسے نتائج نہیں نکل سکتے جو معرفتِ حق میں معاون ہوں۔

ماء اللحم کی تحقیق میں بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ اس کے لیے موزوں Hypothesis ہی وضع نہیں کی گئی۔ اطباء نے ماء اللحم اس پانی کو بیان کیا ہے جو گوشت میں طبعی طور پر پایا جاتا ہے، جس کو بذریعہ حرارت گوشت سے الگ کیا جاتا ہے اور بذریعہ تبخیر عرق کی شکل میں حاصل کرلیا جاتا ہے، لیکن تحقیق کے وقت Hypothesis یہ بنائی گئی کہ ماء اللحم سے مراد گوشت کا محلول ہے اور اس محلول میں وہ سارے اجزاء یقیناً موجود ہوں گے جو گوشت کے اجزائے ترکیبی کا حصہ ہیں۔ چنانچہ گوشت کی یخنی تیار کی گئی، پھر اس سے عرق کشید کیا گیا اور عرق میں لحمین وشحمین کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، ظاہر ہے یہ کوشش مشکور نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ لحمین وشحمین کی تبخیر اس درجۂ حرارت پر نہیں ہوسکتی جس پر آبی اجزاء کی ہوتی ہے۔ پھر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ماء اللحم لطیف غذائی اور دوائی اجزاء سے عاری ہے۔ اب اگر ماء اللحم کو استعمال کرنا ہے تو اس کی یخنی، محلول یا (Extract) بنا کر ہی استعمال کرنا مناسب ہوگا، عرق حاصل کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس طرح ماء اللحم سے متعلق یونانی طب کے گراں قدر سرمائے اور اس کے استعمال کی قدیم روایت پر چند ماہ کی بے ربط تحقیق اور چند صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ نے سوالیہ نشان کھڑا کردیا۔ مختصراً یہ کہ ع

کام اچھا نہ تھا انجام بھی اچھا نہ ہوا

لیکن افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ بعض اطباء جن میں سے ایک صاحب تو طب کے معروف مصنف ہیں، اس تحقیقی کام سے ایسے متأثر ہوئے کہ یونانی نظریات اور اس کی برسوں کی روایات کو بالائے طاق رکھ کر اس بات کی وکالت شروع کردی کہ گوشت کا محلول ہی دراصل ماء اللحم ہے۔ ان کی تحریروں کا اثر یہ ہوا کہ آج تک سادہ لوح اطباء اسے یخنی اور گوشت کا محلول ہی سمجھتے ہیں۔ ہماری درسی کتابوں میں ماء اللحم کی اصطلاح عرق ماء اللحم کے ساتھ ساتھ یخنی کے لیے بھی استعمال ہونے لگی ہے، جب کہ دونوں جداگانہ خواص رکھنے والی اغذیہ ہیں۔ ذیل میں یخنی اور ماء اللحم کا طریقۂ تیاری مختصراً پیش کیا جارہا ہے۔

عرق ماء اللحم (گوشت کا عرق)

عرق ماء اللحم حاصل کرنے کے لیے کسی بھی جانور جیسے اونٹ، بھینس، گائے، بکری اور دنبہ وغیرہ کا گوشت استعمال کیا جاسکتا ہے، لیکن زیادہ بہتر گوشت بکری کے ایک سالہ بچے (حلوان) اور طیور خاص طور سے مرغ، تیتر، بٹیر اور کبوتر وغیرہ کا تصور کیا جاتا ہے۔ عام طور سے دو طرح کے گوشت کی آمیزش نہیں کی جاتی لیکن کبھی بکری کے گوشت کے ساتھ پرندوں کے سینے اور ران کے گوشت کی آمیزش کرلیتے ہیں۔ گوشت سے ہڈی اور چربی کو نکال دیتے ہیں اور صاف ستھری بوٹیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ بوٹیاں چھوٹی چھوٹی اور ایک سائز کی استعمال کی جاتی ہیں۔ جب عرق ماء اللحم بنانا ہو تو بوٹیوں کو کسی بڑے برتن میں رکھ کر اس میں

خوشبودار مسالے اور ادویہ کی آمیزش کریں مثلاً الائچی خورد و کلاں، لونگ، جائفل، جاوتری، زیرہ، بالچھڑ، دروَنج عقربی، گاؤزباں، آبریشم، گلاب، عاقرقرحا، ثعلب مصری، اسطوخودوس اور ناگرموتھا وغیرہ اور برتن کا منہ بند کر کے اچھی طرح پکائیں تاکہ گوشت گل کر پانی پانی ہوجائے۔ پھر پورے مرکب کو قرع انبیق میں منتقل کر دیں اور خوشبودار ادویہ وعرقیات کا اضافہ کریں مثلاً عرق گلاب، عرق بید مشک، عرق گاؤزباں وغیرہ۔ عنبر، مشک اور زعفران کو پوٹلی میں باندھ کر اس نلی میں لٹکا دیں جس سے عرق خارج ہوتا ہے۔ پھر قرع کے نیچے آگ جلائیں اور معتدل درجے کی آنچ پر پکا کر عرق حاصل کریں۔

عرق ماءاللحم ایک لطیف غذا کے ساتھ ایک زود اثر دوا کے طور پر بھی مستعمل ہے، اسی بنا پر اس میں متعدد خوشبودار ادویہ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ استفراغ کے بعد پیدا ہونے والی کمزوری، امراض مزمنہ اور متعدد دیگر امراض سے پیدا ہونے والے عوارضات کے لیے عرق ماءاللحم بے نظیر سمجھا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ تقویتِ قلب و اعضائے رئیسہ اور تحریک حرارتِ غریزیہ وروح کے لیے اس کا استعمال زمانۂ قدیم سے رائج ہے۔

عرق ماءاللحم کی تیاری اب اوپر بتائے گئے طریقے سے نہیں کی جاتی۔ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ گوشت کے اجزائے ترکیبی میں لحمین، شحمین اور نمکیات پائے جاتے ہیں اور ان کی تبخیر وتعریق آلۂ تعریق کی مدد سے نہیں ہو پاتی، چنانچہ عرق ماء اللحم کے نام سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اس میں گوشت کے اجزاء تقریباً معدوم ہوتے ہیں اور عرق ماءاللحم کی تاثیرات صرف ان ادویہ مشمومہ کی مرہون منت ہوتی ہیں جن کو گوشت کے ساتھ شامل کر کے عرق کشید کیا جاتا ہے۔ اب ماءاللحم کے دوائی اجزاء کا عرق الگ کشید کیا جاتا ہے اور گوشت سے یخنی علاحدہ تیار کی جاتی ہے، پھر دونوں کی آپس میں اچھی طرح آمیزش کر کے محفوظ کر لیتے ہیں۔ اس طریقۂ تیاری کی وجوہات کا تذکرہ اوپر کیا جاچکا ہے کہ بعض اطباء نے عرق ماءاللحم کو عرق کے بجائے لحم کا محلول بیان کیا ہے اور جب سائنسدانوں نے اس محلول کو تحقیقِ جدید کی سان پر چڑھایا تو اس محلول میں گوشت کے اجزاء معدوم پائے گئے، لہٰذا یہ فتویٰ صادر ہوا کہ ماءاللحم میں چونکہ گوشت کے اجزاء نہیں پائے جاتے اس لیے اس میں غذائیت رتی برابر بھی نہیں پائی جاتی۔ اس طرح عرق ماءاللحم کی جگہ یخنی اور شوربے کے استعمال کا راستہ صاف ہوگیا۔

ہمدرد دواخانہ نے اس سلسلے میں ایک اور جدت یہ کی کہ بجائے روایتی یخنی تیار کرنے کے وہ گوشت سے ایکسٹریٹ تیار کرنے لگا جس کو خلاصۃ اللحم کہتے ہیں۔ اس خلاصۃ اللحم کو دوسری ادویہ کے عرق میں شامل کر کے ماءاللحم تیار کر لیتے ہیں (ایں چہ بوالعجبی است!)۔

خلاصۃ اللحم تیار کرنے کا طریقہ

اجزاء: بکری کے گوشت کا قیمہ ۵/کلو، ست پیپتہ ۱۲/گرام، ست لوبان ۱۰۰/گرام اور آبِ مقطر ۸/لیٹر۔

کسی قلعی دار برتن میں قیمہ اور ۷/لیٹر پانی ڈالیں، ایک لیٹر پانی کو الگ سے گرم کریں اور اس میں ست پیپتہ کو حل کر کے گوشت میں شامل کر دیں۔ برتن کو آگ پر رکھ کر ۶/گھنٹے تک پکائیں اور مسلسل چلاتے رہیں۔ اس کے درجۂ حرارت کو ۵۸/ڈگری پر قائم رکھیں۔ جب درجۂ حرارت بڑھنے لگے تو حرارت دینا بند کر دیں اور جب حرارت کم ہونے لگے تو آنچ تیز کر دیں، چھ گھنٹے کے بعد قیمہ بالکل گل جائے گا۔ اب اسے تیز آنچ دے کر ۱۰/منٹ تک پکائیں اور حرارت دینا موقوف کر دیں۔ ٹھنڈا ہوکر جب مرکب کا درجۂ حرارت ۶۰/ڈگری ہوجائے تو ست لوبان شامل کر کے اچھی طرح ملا لیں۔ اب برتن کا منہ بند کر کے ۸/گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں، بعد میں اسے نفاست سے چھان لیں۔ یہی خلاصۃ اللحم ہے، اس کو ماءاللحم کے دیگر اجزائے دوائیہ کے عرق میں ملا کر ماءاللحم تیار کر لیتے ہیں۔

عرق ماءاللحم حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ

ماءاللحم بنانے کا ایک دیگر طریقہ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ایک ایسا آلہ بنایا جائے جس میں ایک بڑی دیگ (Boiler) استعمال کی جائے۔ اس میں پانی اور ادویہ کو رکھا جائے۔ اس کے منہ سے ایک نلی کو جوڑا جائے جس کے ذریعہ بخارات

دیگ سے خارج ہوسکیں۔شیشے کا ایک بیضوی (Oval) ظرف تیار کیا جائے جس کے دونوں سروں پر Opening ہو۔اس کے ایک سرے سے بخارات والی نلی جس کا ایک سرا دیگ سے ملا ہے منسلک کر دیا جائے اور دوسرا سرا ایک کنڈنسر سے جوڑ دیا جائے۔اس ظرف میں گوشت کا باریک قیمہ رکھا جائے۔کنڈنسر کا دوسرا سرا قابلہ سے جوڑ دیا جائے۔درزوں اور جوڑوں کو اچھی طرح بند کر دیا جائے تا کہ بخارات کا اخراج باہر کی جانب نہ ہوسکے۔دیگ کے نیچے آگ جلائی جائے جس سے پانی کی تبخیر ہوگی اور پانی کے بخارات کے ساتھ دوا کے فراری اجزاء اوپر آئیں گے اور دیگ سے متصل نلی سے ہوتے ہوئے اس ظرف میں جائیں گے جس میں گوشت رکھا گیا ہے۔بخارات کے زیر اثر گوشت کے حل پذیر اور غیر حل پذیر دونوں طرح کے اجزاء جدا ہوکر بخارات کے ساتھ کنڈنسر میں آجائیں گے، یہاں ان کی تبرید ہوگی تو عرق حاصل ہوگا۔اس عرق میں گوشت کے اجزاء شامل ہوں گے اور وہ اجزاء بھی جن کی آلۂ تعریق سے تبخیر نہیں کی جاسکتی۔اس میں پروٹین، بخاری اور غیر بخاری اجزاء اور حل پذیر و غیر حل پذیر ہر طرح کے اجزاء شامل ہوں گے، حاصل شدہ ماء اللحم کا تجزیاتی مطالعہ کر کے ان اجزاء کی مقدار معلوم کی جاسکتی ہے۔اس ترکیب تیاری کا ابتدائی تجربہ شعبۂ علم الادویہ، علی گڑھ میں کیا گیا ہے۔بظاہر اس طریقے میں بھی وہی قبح موجود ہے جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔یہ مرکب بھی عرق نہیں تسلیم کیا جائے گا، کیونکہ یہ عرق (Distillate) اور عصارے (Extract) کا مرکب ہے، جب کہ یونانی طب میں ماء اللحم کے نام سے جو چیز مطلوب ہے وہ خالص عرق ہے، آمیزہ یا محلول نہیں۔پھر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ گوشت میں پانی مختلف تہوں میں ہوتا ہے اور سارا پانی آسانی سے جدا نہیں ہو پاتا۔زیرِ نظر طریقۂ تیاری میں یہ بات محل نظر ہے کہ کیا اس سے گوشت کا سارا پانی الگ ہوکر دوسری ادویہ کے عرق کے ساتھ شامل ہوگا؟ پھر بھی اس آلے اور طریقۂ عمل کو Standardize کیا جاسکتا ہے تا کہ اگر محلول ہی تیار کرنا ہے تو وہ ایک ہی آلے کی مدد سے حاصل کر لیا جائے، لحمی اور نباتی ادویہ پر الگ الگ محنت نہ کرنی پڑے۔

ماء اللحم (یخنی)

یخنی کی تیاری کے درج ذیل دو طریقے معروف ہیں:

(۱): گوشت کی صاف ستھری اور سلیقے سے کٹی بوٹیاں ایک دیگچے میں رکھیں اور اس میں نمک اور مصطگی شامل کریں۔گرم مسالہ حسب روایت و ذوق اور پیاز و لہسن بقدر ضرورت، پوٹلی میں باندھ کر دیگچے میں ڈالیں اور اور اس کے منہ کو گندھے ہوئے آٹے سے اچھی طرح بند کر کے ہلکی آنچ پر پکائیں۔دیگچے کو وقتاً فوقتاً حرکت دیتے رہیں تا کہ گوشت جلنے نہ پائے۔جب گوشت گل جائے تو اس کو اچھی طرح نچوڑ کر سارا پانی چھان لیں اور گھی سے بگھار دے کر استعمال کریں۔کبھی گوشت کو بھوننے (Roast) کے بعد دیگچے میں ڈال کر مسالہ وغیرہ شامل کرتے ہیں اور تھوڑی مقدار میں پانی شامل کر کے پکاتے ہیں اور چھان کر محفوظ کر لیتے ہیں۔

(۲): گوشت میں حسب ذائقہ نمک ملا کر آتشی مرتبان میں رکھیں اور اس کے منہ کو اچھی طرح بند کر دیں تا کہ بخارات باہر نکل کر ضائع نہ ہونے پائیں۔ایک بڑا اور کشادہ برتن لے کر اس میں پانی بھریں اور اس کو چولھے پر رکھیں۔مرتبان کو پانی والے برتن میں کھڑا کر کے آگ روشن کر دیں۔حرارت پا کر پانی میں ابال آئے گا اور اس کی حرارت سے مرتبان میں رکھا ہوا گوشت گلنا شروع ہوگا اور آہستہ آہستہ اپنے اندر کا سارا پانی چھوڑ دے گا۔دو سے تین گھنٹے کے بعد حرارت دینا بند کر دیں۔جب کشادہ برتن کا پانی قدرے ٹھنڈا ہو جائے تو مرتبان کو نکال کر گوشت کو چھان لیں۔جو سیال حاصل ہوگا وہ ماء اللحم کہلائے گا۔اس پانی کو گھی سے بگھار لیں اور کٹی ہوئی دھنیا اور ادرک وغیرہ چھڑک کر استعمال کریں۔یخنی ایک مقوی غذا تصور کی جاتی ہے اور بعض امراض و عوارضات میں اس کا استعمال ماء اللحم کے بدل کے طور پر کیا جاتا ہے۔اب تو بعض لوگ اسی کو ماء اللحم سمجھنے لگے ہیں، لیکن یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اس کے منافع عرق ماء اللحم سے کم ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

اطباء کی سوانح نگاری
فنی ضرورت اور اہم اصول

ڈاکٹر محمد یاسر☆

اختصاریہ

ہر دور میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اطباء کے حالات مرتب کرکے اس شعبے کے افراد کے سامنے پیش کیے جائیں اور ان سے استفادے کی طرف انھیں مائل کیا جائے۔ادب کی یہ صنف سوانح نگاری کہلاتی ہے۔اس سے متعلق قدیم طرز اسلوب، جدید تحقیقی طریقہ کار اور اردو زبان وادب میں معروف اصولوں کا ماحصل یہاں پیش خدمت ہے۔ اس مضمون میں سوانح نگاری کی ضرورت وخصوصیات، فن تاریخ سے تعلق، محرکات وذرائع معلومات اور اسلوب نگارش کی اہمیت کا بیان ہے اور اسی کے ساتھ خودنوشت سوانح نگاری پر بھی مختصر کلام ہے جو شخصیت سے متعلق مستند معلومات کا ذریعہ اور اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱-سوانح کی ضرورت وتعارف

مثل مشہور ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔علم وفن کے حصول کے لیے جہاں تحریر شدہ علمی ذخیرہ کی ضرورت ہے وہیں ماہر وباکمال افراد سے استفادہ بھی لازمی ہے۔کتابیں افراد ہی کے علوم وتجربات سے تیار ہوتی ہیں اور ان کی تالیفات کا اصل مقصد ایسے افراد ہی تیار کرنا ہوتا ہے جو ان علوم میں مہارت حاصل کریں۔ابتداء میں علوم سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے تھے بعد میں تحریری طریقہ ایجاد ہوا لیکن کتابوں کے باوجود اس ترقی یافتہ دور میں بھی عموماً یہ ممکن نہیں کہ ماہر اشخاص سے سیکھے بغیر کمال حاصل ہوجائے۔رجال فن سے نہ صرف ان کے معاصر افراد مستفید ہوتے ہیں بلکہ بعد کے زمانے میں آنے والے طالبین بھی منتفع ہوتے ہیں جس کے ذرائع ان کے تلامذہ اور کتابیں ہوتی ہیں۔جن اطباء کی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں ان کے زمانے اور حالات زندگی سے واقفیت، ان کی بیان کردہ معلومات ومجربات کی تفہیم میں معاون ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی سند وصحت پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔علم وفن کی تحصیل وتحقیق اور معالجانہ جدوجہد کے واقعات پڑھنے سے طالب علم کے دل میں شوق وذوق اور محنت وجستجو کی چنگاری پیدا ہوتی ہے جو طب میں مہارت اور ترقی کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے۔طب ایسا علم ہے جس کی اہم بنیاد تجربات ہیں جو مسلسل کیے جاتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ کامیاب طبیب وہ ہے جو اسلاف اطباء کے تجربات سے فائدہ اٹھائے۔تاریخ سے یونانی طب کے عروج وزوال کے اسباب میں کارفرما نظریاتی، سیاسی، سماجی، اقتصادی اور فنی عوامل کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔انہیں وجوہات سے تاریخ طب کا مضمون نصاب طب میں شامل ہے۔ماضی کے اطباء کے حالات وواقعات یعنی سوانح حیات کے مجموعہ کا نام ہی تاریخ طب ہے۔اس مضمون (تاریخ طب) میں تحقیق کا ایک خلاء پیدا ہوتا جارہا ہے جسے پر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔سوانح سے بعض اوقات ان غلطیوں اور ان کے تدارک کا علم ہوجاتا ہے جن کے اسی شعبے اور فن کے افراد کے ذریعے دہرائے جانے کا خطرہ ہو۔جن اداروں جماعتوں اور تحریکوں کا تذکرہ بعد کی تعارفی کتابوں میں ملتا ہے یا زبانی سنا جاتا ہے اس عہد کے اشخاص کی مستند سوانحات، ان کی زندہ بولتی تصویریں بن جاتی ہیں جن سے انھیں سمجھنا زیادہ آسان اور حقیقت سے قریب تر ہوجاتا ہے۔سوانح کا ایک لطیف فائدہ

☆اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ علم الامراض، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اجمل خان طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اتر پردیش۔E-mail:yasirm7@gmail.com،Mob.No:7829810471۔

یہ ہے کہ یہ صاحبِ سوانح (جس کی سوانح لکھی جائے) سے بعد از مرگ اتنا قریب کر دیتی ہے جیسے ملاقات ہوگئی ہو۔ قاری اسے محسوس کرتا ہے اور مستفید ہوتا ہے۔ اس دور میں جب کہ وقت نہایت سرعت سے گزر رہا ہے اور برسوں کی تبدیلیاں گھنٹوں میں آرہی ہیں، سلف سے رابطہ کمزور پڑتا جارہا ہے، طب کی اصل روح کے سمجھنے والے جدت سے حد درجہ مرعوب ہیں، یہ بہت ضروری ہے کہ ذی علم، صاحب فہم، باکمال اطباء کے حالات نئی نسل کے سامنے پیش کیے جائیں اور ان سے استفادے کی طرف مائل کیا جائے۔ یہ ایک مستقل کام ہے جسے سوانح نگاری یا سیرت نگاری کہا جاتا ہے۔

لغوی اعتبار سے لفظ سوانح اصلاً عربی لفظ سنح سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پیش آنا۔[۱] اردو لغت کے مطابق لفظ 'سانحہ' کی جمع سوانح ہے جس کے معنی ہیں واقعات، حالات، روداد۔[۲] اس طرح سوانح سے مراد پیش آنے والے حادثات و واقعات کا بیان اور سرگزشت ہے۔ اس کے لیے متبادل لفظ سیرت بھی استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاحاً سوانح عمری یا سوانح حیات کسی انسان کی زندگی کے ایک تفصیلی بیان کو کہا جاتا ہے جس میں انسان کی ابتدائی زندگی، تعلیم، کام، رشتوں، معاشرتی زندگی اور موت تک کے تمام پہلو بیان ہوتے ہیں۔ اس میں وہ حالات اور واقعات بھی شامل ہوتے ہیں جن سے دیگر انسان سبق سیکھتے ہیں۔[۳،۴]

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں سوانح نگاری (Biography) کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"Biography, form of literature, commonly considered nonfictional, the subject of which is the life of an individual. One of the oldest forms of literary expression, it seeks to re-create in words the life of a human being—as understood from the historical or personal perspective of the author—by drawing upon all available evidence, including that retained in memory as well as written, oral, and pictorial material.[۵]

ترجمہ ''سوانح نگاری ادب کی ایک صنف ہے جو عموماً غیر افسانوی مانی جاتی ہے جس کا موضوع کسی فرد کی زندگی ہوتا ہے۔ ادبی اظہار کی یہ قدیم ترین صنف انسان کی زندگی کو گویا دوبارہ لفظوں سے تخلیق کرتی ہے جیسا کہ سوانح نگار نے تاریخی یا ذاتی حیثیت سے سمجھا ہو اور جس کی بنیاد تمام دستیاب شواہد ہوں جن میں یادداشت میں محفوظ، تحریری، زبانی اور تصویری مواد شامل ہیں۔''

۲-سوانح نگاری کا طریقہ کار

سوانح نگاری سے متعلق قدیم طرز اسلوب، جدید تحقیقی طریقہ کار اور اردو زبان و ادب میں معروف سوانح نگاروں نے جو اصول بیان کیے ہیں ان کے مطالعے کا ماحصل یہاں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ طبی شخصیات کی سوانح حیات میں کن امتیازی خصوصیات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہیں۔

سوانح نگاری ایک فن ہے جس میں کمال کی بہت سی جہتیں ہوسکتی ہیں۔ یہ اتنا ہی کثیر الجہت فن ہے جتنا انسانی بدن اور انسانی نفسیات کا مطالعہ۔[۶] انسانی فضیلتوں کی انواع مختلف ہوتی ہیں۔ خواہ صاحب سوانح ہو یا سوانح نگار (سوانح لکھنے والا)، دونوں حیثیتوں سے سوانح حیات کا رنگ مختلف ہوسکتا ہے۔ فن طب میں کوئی حاذق طبیب ہوسکتا ہے کوئی بہتر استاد، کوئی اچھا محقق ہوسکتا ہے تو کوئی مایہ ناز مصنف۔ ہر شخص مختلف حیثیتوں سے مختلف استعداد کا مالک ہوتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ساری خصوصیات میں اسے کمال حاصل ہوجائے اگرچہ بعض ہر فن مولا شخصیات بھی گزری ہیں۔ اسی طرح سوانح نگار کی قلمی لیاقت و اسلوب، علم و ہنر، وسعت نظر، قوت فکر، مشاہدات سے نتائج کے استخراج کی صلاحیت، مزاج و ذوق اور محرکِ تحریر مختلف ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے ایک سوانح نگار شخصیت کی مکمل تصویر نہ پیش کر سکے اس لیے صاحبِ سوانح کی مکمل خصوصیات کے ادراک کے لیے ایک سے

زیادہ سوانح سے استفادہ بہتر ہوتا ہے۔ واقعات وحالات اور زمانہ کی تبدیلیوں کی وجہ سے بھی ہر سوانح مختلف ہوتی ہے۔ اکثر یہی اختلاف قارئین کے لیے دلچسپی کا سبب بن جاتا ہے۔

موضوع کا انتخاب

سوانح کے لیے موضوع یعنی شخصیت کا انتخاب بھی مختلف جہتوں سے ہوسکتا ہے۔ مشہور ومقبول افراد کے کارہائے نمایاں سے لے کر غیر معروف ہستیوں کے اچھوتے کردار تک اس کے لیے وسیع میدان ہے۔ بعض شخصیات اپنے دائرہ کار کے اعتبار سے اتنی اہم اور وسعت والی ہوتی ہیں کہ ان کی سوانح صرف سوانح نہیں بلکہ ایک عہد کی تاریخ ہوتی ہے۔ بعض شخصیات اتنی اہم ہوتی ہیں کہ ان کی سوانح نہ لکھنا یا ان کی زندگی کے حالات نئی نسل کے سامنے نہ لانا علمی کوتاہی شمار ہوسکتی ہے۔ لیکن بسا اوقات معاصر یا عہد قریب کی غیر معروف شخصیات کے کارناموں کو پڑھ کر اتباع کا ایسا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو ماضی کی نامور شخصیتوں کی سوانح عمریوں سے نہیں ہوتا اس لیے کہ اس سے مقصد کے حصول میں کامیابی کی امید زیادہ ہوتی ہے اور زمانہ کے تفاوت کا عذر باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایسی شخصیات کی زندگی کے بھی قابل تقلید پہلوؤں کو سامنے لایا جائے۔ یے شخصیت کے ساتھ سوانح کے مقاصد اور ضرورتوں کا استحضار سوانح نگار کے لیے لازمی ہے۔ سوانح بحیثیت مجموعی فن طب اور متعلقین طب کے لیے نافع ہو، اخلاق وکردار، جستجو وتحقیق، حکمت وطبابت، تصنیف وتالیف کی صلاحیت جیسی اہم صفات جو طبیب کے لیے ضروری ہیں انہیں مدنظر رکھا جائے جس سے پڑھنے والوں کے دل میں ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کا داعیہ پیدا ہو۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ سوانح کے قارئین کا مقصد زندگی سے سبق لینا، عبرت وموعظت اور بڑی شخصیات کے اچھے کاموں کی اتباع ہوتا ہے نہ کہ محض کہانی پڑھنا اور انداز بیان کی دلکشی وتخیلاتی رعنائی۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی اپنے خاص اسلوب میں یوں رقمطراز ہیں:

''علوم وفنون کی صف میں سیرت (بائیوگرافی) کا ایک خاص درجہ ہے۔ ادنی سے ادنی آدمی کے حالات زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لیے دلیل راہ ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرہ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے، غرض سعی وعمل، جد وجہد، ہمت وغیرت کی جو عجیب وغریب نیرنگیاں سکندرِ اعظم کے کارنامہ زندگی میں موجود ہیں، بعینہٖ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصہ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔ اس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو 'شخص' کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے۔ صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں وہ کس وسعت اور استقصاء تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں، تاکہ مراحل زندگی کی تمام راہیں اور ان کے پیچ وخم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آجائیں۔ لیکن اگر خوش قسمتی سے فرد کامل اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہوسکتی ہے؟''[۸]

فن سوانح نگاری میں فن تاریخ سے استفادہ

چونکہ سوانح عام طور سے وفات کے بعد لکھی جاتی ہے اس لیے تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے لہٰذا فن تاریخ کے اصولوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ معروف مؤرخ علامہ ابن خلدون نے تاریخ میں غلطیوں کے چند اہم اسباب بیان کیے ہیں جن سے اجتناب کرنا صحت بیان کے لیے ضروری ہے۔ ان میں رائے یا مذہب کا اختلاف، خبر بیان کرنے والوں کی تصدیق وتحقیق نہ کرنا، جھوٹی تعریف ومبالغہ آرائی اور اس زمانے کے معاشرے کے طبعی حالات وپس منظر سے ناواقفیت شامل ہیں۔[۹] واقعات کے نقل میں تحقیق واستناد کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ اس طرف بے توجہی سے اکثر ایک واقعہ کئی لوگوں سے منسوب ہو جاتا ہے اور اس کا اثر اس واقعے سے نتائج کے استخراج کی صحت پر بھی پڑتا ہے۔ محیر العقول اور غیر معمولی واقعات کا مشہور شخصیات سے انتساب بہت عام ہے۔ کئی واقعات حکیم اجمل خان سے یونہی منسوب ہوگئے ہیں۔ شخصیت کی مکمل مداحی کے بجائے طبی پہلوؤں پر

واقعہ کی ترجمانی کرنی چاہیے جس سے یہ احساس ہو کہ ہر شخص محنت سے یہاں تک پہنچنے کی کوشش کرسکتا ہے۔ ورنہ مبالغہ آمیزی سے شخصیت اتنی بلند ہوجاتی ہے کہ اس کی برابری کرنا فطرت سے بالاتر معلوم ہونے لگتا ہے۔ حسن ظن کی بنیاد پر لوگ تعریف میں مبالغہ کرتے ہیں اور کبھی بدظنی کی وجہ سے کمالات پر پردے ڈال دیتے ہیں بلکہ خرابیوں کو بھی منسوب کردیتے ہیں جیسا کہ بعض یورپی مورخین نے عرب حکماء کی تحقیقات کو نہ صرف تاریخ سے محو کرنے کی کوشش کی بلکہ الزام بھی دیا کہ انھوں نے یونانی حکماء کے علوم میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔

علامہ شبلی نعمانی نے واقعات کے جانچنے کے دو طریقے بتائے ہیں، روایت اور درایت۔ روایت سے مراد یہ دیکھنا ہے کہ واقعہ بیان کرنے والا شخص خود اس واقعہ میں موجود تھا یا جن سے وہ واقعہ نقل کیا گیا ہے وہ سچے تھے۔ درایت سے مراد یہ ہے کہ عقلی اصول سے وہ واقعہ صحیح ثابت ہو۔ ابن خلدون کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ دوسرے طریقے یعنی درایت پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے جس میں چند اہم سوالات یہ ہیں: وہ بات یا واقعہ عادت کے اصول سے ممکن بھی ہے یا نہیں؟ اس زمانے کے لوگوں کا رجحان اس واقعے کے موافق تھا یا مخالف؟ اگر غیر معمولی واقعہ ہے تو کیا اس کا اتنا ہی قوی ثبوت موجود ہے؟ راوی جس بات کو بیان کرتا ہے اس میں اس کی رائے کا کتنا حصہ شامل ہے؟ راوی نے واقعے کی پوری تفصیل بیان کی ہے یا کوئی پہلو اس کی نظر سے رہ گیا ہے؟ اگر پرانا واقعہ ہے تو زمانہ گزرنے کے ساتھ مختلف لوگوں کے ذریعے اس واقعے کے بیان میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں؟[10] یہ ساری تفصیلات اس وقت زیادہ مفید ہیں جب صاحب سوانح اور سوانح نگار کے درمیان زیادہ عرصہ گزر چکا ہو۔

شخصیت سے تعلق اور سوانح کی تحریک

انتخاب موضوع میں فنی یا نظریاتی مطابقت بھی لازمی ہے جس کے نہ ہونے سے سوانح نگار صاحب سوانح کو سمجھ نہیں پاتا یا اپنے نظریے سے سمجھنے اور لکھنے کی بے جا کوشش کرتا ہے، نتیجتاً شخصیت کے محاسن بھی معائب میں بدل جاتے ہیں یا غیر ضروری مبالغہ ہوتا ہے یا فنی اور نظریاتی غلطیاں صادر ہوتی ہیں۔ کسی طبیب کی پیشہ ورانہ زندگی سے بہتر واقفیت اسی شعبہ سے متعلق شخص کو ہوسکتی ہے جو واقعات کو سمجھ سکے اور ان کی وجوہات کا صحیح اندازہ کرسکے۔ صاحب سوانح کی زندگی سے مکمل واقفیت کے لیے اور شخصیت کے کما حقہ ادراک کے لیے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ ایک عرصہ دراز معیت وصحبت کا گزرا ہو اور اس دور کے نشیب وفراز کو دیکھا ہو۔ سوانح نگار اکثر ایسی شخصیات پر قلم اٹھاتا ہے جسے وہ جانتا پہچانتا ہے یا جن سے عقیدت رکھتا ہے۔ مثلاً باپ، بیٹا، استاد، شاگرد۔ لیکن کبھی کبھی مذہبی (یا نظریاتی) تعلق یا جاہ وشہرت کی خواہش بھی اس کا سبب بنتی ہے۔ بعض قومی، مذہبی یا سیاسی شخصیات کی سوانح عمریاں تاجرانہ مقصد سے لکھی جاتی ہیں۔ ان میں اکثر تحقیق کا خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ نقل در نقل پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ کسی کے حکم یا فرمائش پر لکھی جانے والی سوانح عمریوں کا دائرہ اکثر محدود ہوتا ہے لیکن جب اس میں کسی قابل، مستند، غیر جانبدار، ہمدرد اور صاحب فن قلمکار کی دلچسپی کا دخل رہتا ہے تو مفید ثابت ہوتی ہیں۔[11]

سوانح کے ذرائع معلومات

صاحب سوانح کی تحریریں، روزنامچے، مکاتیب، ای میلس اور میسیجز، ویڈیوز، اہم تصویریں، بائیو ڈیٹا، انٹرویوز، اخبارات و رسائل، احباب، اعزہ، معاصرین اور شاگرد (جن کے ساتھ معتد بہ وقت گزرا ہو) وغیرہ سوانح کے اہم ذرائع معلومات ہیں۔ کسی مصنف یا محقق کی سوانح لکھنے کے لیے اس کی تصنیفات یا شائع شدہ تحقیقات اور مضامین سے خاصا مواد حاصل ہوسکتا ہے۔ پہلے دور میں جب آپسی رابطے کا ذریعہ خطوط ہوا کرتے تھے اس وقت ان سے شخصیت کی فطرت، عملی مصروفیات اور نظریات کے سمجھنے میں کافی مدد ملتی تھی اس لیے کہ اس میں افراد سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنا ہر حال و خیال بے پس و پیش حوالہ قلم کرجاتے ہیں اور اس آئینہ میں انسان ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا کہ وہ حقیقت میں ہے۔[12] اب اس کی جگہ ای میل، میسیج اور وہاٹس ایپ پیغامات جیسی الیکٹرونک سہولیات نے لے لی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے اس دور میں لمحات زندگی قید کرنا زیادہ آسان ہوگیا ہے۔ ویڈیوز اور تصویروں سے بھی بہت سے حقائق واضح

ہوجاتے ہیں۔ اس زمانے میں خصوصاً ملازمت پیشہ افراد اپنے نمایاں کام اور پروفیشنل زندگی کے اہم گوشے اپنے بائیو ڈیٹا میں لکھ دیتے ہیں جس سے ان کے مستند حالات بہ آسانی معلوم ہو جاتے ہیں۔ اخبارات و رسائل میں یا آن لائن دستیاب صاحب سوانح کے انٹرویوز بھی حالات زندگی کی معلومات کے لیے مستند ذرائع ہیں۔ اس شخص کے احباب و اعزہ، معاصرین و تلامذہ سے کئی مرتبہ نادر معلومات مل جاتی ہیں اور یہ شخصیت کے افکار و نظریات کے سمجھنے کا معتبر واسطہ ہوتی ہیں۔ حالات زندگی میں نشیب و فراز کی واقفیت احباب و اعزہ کو ہوتی ہے۔ ان تمام ذرائع سے صحیح استفادہ اور تفہیم کے لیے ایک ذریعہ دوسرے ذریعے کا معاون ہوتا ہے۔ ان سب کی مدد سے محققانہ طریق سے لکھی جانے والی سوانح کو Biography research کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔[۱۳]

سوانح لکھنے سے قبل مطلوبہ مواد کی فراہمی کے بغیر سوانح مکمل نہیں ہوسکتی۔ تمام زندگی کے حالات کی تحقیق اور مکمل مواد جمع کرنے کے بعد اسے اس طرح ترتیب دینا چاہیے کہ پیدائش سے لے کر موت تک تمام واقعات اور کارنامے قاری کی نظروں کے سامنے آجائیں۔ فرد پر گزرے ہوئے اہم حالات اور واقعات کا انتخاب بھی ایک ضروری نکتہ ہے۔ شخص کے قول و عمل سے اس کی فکر و نفسیات تک پہنچنا اور پھر اسے دیانت داری، بے باکی، احترام اور ادبیت کے ساتھ منصفانہ انداز میں بیان کرنا چاہیے۔[۱۴]

اسلوب نگارش کی اہمیت

دوسری تحقیقی تحریروں کے برخلاف سوانح نگاری میں اسلوب کی بڑی اہمیت ہے۔ قارئین شخصیت سے دلچسپی اس وقت لیتے ہیں جب اسلوب میں شگفتگی اور چاشنی ہو۔ اسلوب کے روکھے پن سے عظیم شخصیات مجروح ہوتی ہیں اور نہ صرف پڑھنے والوں میں سوانح سے اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے بلکہ سوانح نگار کے تعلق سے بھی بدگمانی ہوتی ہے۔[۱۱] سوانح میں تمام معلومات کو موسوعی طرز پر محض جمع کر دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ ان معلومات اور واقعات کو حقیقی زندگی کی شکل میں پیش کرنا اور اس کے لیے حسن ترتیب اور عمدہ ربط بھی ضروری ہوتا ہے۔ طرز بیان نہ ایسا خشک ہو جیسے آرکیٹیکٹ مکان کا نقشہ بناتا ہے جس میں صرف لکیریں نظر آتی ہیں۔ اور نہ ایسا پرتکلف ہو جیسا مصور مکان کی تصویر بناتا ہے جسے دیکھنے والے اس کی خوشنمائی کی تعریف تو کرتے ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔[۱۰] اسلوب میں شائستگی، روانی، فصاحت، بلاغت، صراحت، وضاحت، جامعیت اور واقعات کی بلاتصنع فطری عکاسی سوانح نگاری کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ یہ سوانح نگار کی خوبی ہے کہ وہ اصولوں سے سمجھوتہ کیے بغیر اپنی تحریر کو دلچسپ اور مفید بنادے۔[۶] ایک ادیب اور صاحب قلم کا یہ امتیاز ہے کہ وہ مردہ تصویروں میں جان ڈال دے اور تحریری نقوش کو متحرک بنادے۔ سادہ، بے ساختہ احساسات و جذبات کی ترجمانی کرے، واقعات و مناظر کی صحیح تصویر کشی کرے۔ پڑھنے والے کہیں تحریک پائیں، کہیں موعظت حاصل کریں، کہیں جوش پیدا ہو، کہیں ہوش کی باتیں ہوں۔[۱۵]

منصفانہ طرز بیان

سوانح نگار کے صاحب سوانح سے علاقائی، مذہبی، مسلکی، فکری اور جذباتی تعلق کے اعتبار سے بھی تحریر پر اثر پڑتا ہے۔ ایسے تعلقات شخصیت کے سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں اور سوانح میں اس کا عکس نظر بھی آتا ہے لیکن ان علائق کے باوجود شخصیت سے متعلق حقائق کے اظہار میں توازن برقرار رکھنا چاہیے۔ تحریر میں صاحب قلم کے مزاج و نفسیات کا اثر بھی ہوتا ہے۔ رقیق قلم سے تعریف اور تنقیص دونوں میں افراط کا خدشہ رہتا ہے اسی طرح کثیف قلم کے بیان میں دونوں صورتوں میں کچھ جمود چھایا رہتا ہے۔ اکثر قاری راہ اعتدال پر قائم قلمکار پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ قلمکار کے لیے درجۂ کمال یہ ہے کہ وہ سوانح لکھتے وقت عقیدت و نفرت کے جذبات سے بلند ہوجائے۔ شخصیت کا صحیح احاطہ اس طرح کرنا کہ مفہوم بعینہ قارئین تک پہنچ جائے یہ سوانح نگار کے لیے بڑا امتحان ہوتا ہے۔ جس طرح محققین تجربات کے مشاہدات (Observations) پر تبصرے (Discussions) کرتے ہیں سوانح نگار شخصیت کے کردار و عمل، اقوال و فکر کا مشاہدہ کرتا ہے پھر اسے اپنے بساط کے مطابق سمجھ کر پیش کرتا ہے کہیں کہیں نقد و تعریف کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر شخص سے کوئی فکری و علمی غلطی ہوئی جس

سے طب کے اصولوں میں نقصان کا خدشہ ہے یا کچھ ایسی شخصی صفات ہوں جو ان غلطیوں کا سبب قرار پاتی ہوں تو اسے بھی مناسب علمی انداز میں بیان کرنا چاہیے تاکہ آئندہ اطباء اس سے احتیاط برتیں۔ مثلاً شخصیت میں کمال کی حذاقت تو تھی لیکن مزاج کی سختی طلبہ کے لیے استفادہ سے مانع تھی یا کسی استاد طب کو مضامین کی تعلیم کا بڑا اچھا ملکہ حاصل تھا لیکن عملی تجربات سے زیادہ ربط نہ تھا۔ مزید برآں جس طرح طبی تحقیقات میں کسی دوا یا علاج کی افادیت کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کے مضر اثرات کا بیان بھی ضروری سمجھا جاتا ہے تبھی اس دوا یا علاج کی صحیح و مکمل تصویر سامنے آتی ہے اسی طرح شخصیات کے فضائل و مناقب کے بیان کے ساتھ اسلوب میں مناسب فنی تنقید سے تصویر کشی میں کمال پیدا ہوتا ہے اور قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان بھی۔

خودنوشت سوانح نگاری کی اہمیت

خودنوشت سوانح نگاری (Autobiography) بڑی اہم معلومات اور ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے شرط یہ ہے کہ اس میں احتیاط اور غیر جانبداری سے کام لیا جائے۔ اس بارے میں عام خیال ہے کہ اس میں مبالغہ یا کسر نفسی کی وجہ سے شخصیت کی صحیح تصویر سامنے نہیں آتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خودنوشت سوانح میں جو افکار، نفسیات و احساسات نظر آتے ہیں ان کی بعینہٖ عکاسی کسی دوسرے کے ذریعے کم ہو پاتی ہے۔ شیخ الرئیس ابن سینا کی آئینہ سرگزشت خودنوشت سوانح حیات کی ایک مشہور مثال ہے۔ عظیم شخصیات کی تحریریں عموماً حقیقت پسندانہ ہوتی ہیں۔ مکاتیب شبلی کے دیباچہ میں علامہ سید سلیمان ندوی خوب لکھتے ہیں۔

''تاریخی انسانوں کے حالات اور سوانح زندگی جاننے کا ایک ذریعہ ان کی بائیوگرافی اور سوانح عمریاں ہیں لیکن درحقیقت سوانح نگار کا قلم اپنے ہیرو کی زندگی کا جو مرقع کھینچتا ہے وہ صرف اس کے ظاہری خط و خال کی نقاشی ہوتی ہے، عمق قلب کے اندر جو رموز اور اسرار ہیں اور جن سے اصل میں 'انسانیت' عبارت ہے، ان کی تصویر کشی کے لیے جو رنگ درکار ہے وہ دوسروں کو میسر نہیں آسکتا۔ انسانوں کی خودنوشت سوانح عمریاں ایک حد تک اس کی تلافی کرتی ہیں۔''[۱۲]

آگے انھوں نے اس کے کچھ نقائص بھی بیان کیے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کو سمجھنے کا سب سے مستند ذریعہ اس کے مکاتیب ہیں جو اس نے اپنے احباب واعزہ کو لکھے ہوں جس کا تذکرہ سطور بالا میں آچکا ہے۔

۳-خلاصہ

یونانی طب کے جدید دور کی تاریخ محفوظ کرنا اس وقت اہل طب کی ذمہ داری ہے۔ اس کام کے لیے سوانح نگاری اہم مرحلہ ہے۔ سوانح کے مقاصد، ذرائع، اسلوب اور طرز تحریر وغیرہ کے سلسلے میں امید ہے یہ مضمون معاون ثابت ہوگا۔ کم از کم ماضی قریب میں جو ماہر اطباء و حکماء گزرے ہیں ان کی سوانح حیات ان سے واقفیت رکھنے والے احباب کو ضرور مرتب کرنا چاہیے۔ کیا ہی بہتر ہو کہ موجودہ اکابرین و اساطین طب کی روداد زندگی ان کی حیات ہی میں قلمبند ہو جائے کہ اس سے ایک عہد کی معلومات کا وقیع اور مستند ذخیرہ تیار ہو جائے گا۔ اس کی روشنی میں نئی نسل کو راہ عمل اور دعوت فکر نصیب ہوگی۔ اسلاف کے شروع کیے ہوئے کام نئے شوق کے ساتھ آگے بڑھائے جاسکیں گے۔ بقول علامہ اقبال:

خروش آموز بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کر دے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے باد بہاری ہے

حوالہ جات

۱- لویس معلوف۔ المنجد عربی اردو (مترجم مولانا ابوالفضل بلیاوی) لاہور: خزینۂ علم وادب۔۷۹۳۔

۲- فیروزالدین۔ فیروز اللغات۔ اشاعت اول۔ لاہور: فیروز سنس؛ ۲۰۱۰ء۔ ۷۱۸۔

۳- نامعلوم۔ ویکیپیڈیا (آزاد دائرۃ المعارف)۔ باب: سوانح حیات۔/ https://ur.wikipedia.org.wiki۔

۴- Kendall PM. biography | Definition & Examples | Britannica. [Internet]. cited on

Sep 25, 2022. Available from. https://www.britannica.com/art/biography-narrative-genre

۵- نامعلوم۔ شبلی کی سوانح نگاری، اہم سوانحی تصانیف کی روشنی میں FikroKhabar [Internet]. cited on Sep 25, 2022. Available from: http://www.fikrokhabar.com/ur/content-details/6470/essays/shibli-ki-sawane-nigari-aham-sawanihi-tasaneef-ki-roshni-news.html

۶- ندوی، ابوالحسن علی حسنی۔ کاروان زندگی۔ اشاعت سوم۔ لکھنؤ: مکتبہ اسلام؛ ۲۰۰۰ء: ۷-۱۴۔

۷- نعمانی، شبلی، ندوی، سید سلیمان۔ مقدمہ سیرت النبی ﷺ۔ اشاعت اول۔ لاہور: ادارہ اسلامیات؛ ۲۰۰۲ء۔

۸- عبدالرحمٰن ابن خلدون۔ مقدمہ ابن خلدون (اردو ترجمہ)۔ اشاعت یازدہم۔ کراچی: نفیس اکیڈمی؛ ۲۰۰۱ء: ۵۳، ۱۴۵-۱۴۸۔

۹- نعمانی، شبلی۔ الفاروق۔ اشاعت اول۔ کراچی: دارالاشاعت؛ ۱۹۹۱ء: ۳۰-۳۶۔

۱۰- ممتاز ف۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء۔ دہلی: رونق پبلشنگ ہاؤس؛ ۱۹۸۴ء: ۳۰-۶۰۔

۱۱- ندوی، سید سلیمان۔ دیباچہ، مکاتیب شبلی۔ اشاعت چہارم۔ اعظم گڑھ: مطبع معارف؛ ۱۹۶۲ء: ۱-۲، ۵۲-۶۲۔

۱۲- Anonymous. Biographical research - Wikipedia [Internet]. cited on Oct 1, 2022]. Available from: https://en.wikipedia.org/wiki/Biographical_research#cite_note-1

۱۳- Roznama Dunya: اسپیشل فیچرز، سوانح نگاری کا فن۔ [Internet]. cited on Oct 1, 2022]. Available from: https://dunya.com.pk/index.php/special-feature/2019-02-27/23039

۱۴- دریا آبادی، عبدالماجد۔ آپ بیتی۔ کراچی: مجلس نشریات اسلام؛ ۱۹۹۶ء: ۵-۱۱۔

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

پروفیسر غفران احمدؒ

نقوشِ حیات

ادارہ

نام	غفران احمد
ولدیت	والد: مسعود احمد　　والدہ: مسعودہ خاتون
تاریخ پیدائش	۲۵/دسمبر ۱۹۶۴ء
آبائی وطن	چھپیہیں نزد نصیر پور، اعظم گڑھ آبائی وطن تھا، بعد ازاں محمد آباد گوہنہ، ضلع مئو، اتر پردیش سکونت اختیار کر لی
ننہال	بصیر پور (بلریا گنج، ضلع اعظم گڑھ کے پاس ایک گاؤں)
برادر	۱-منصور احمد، ۲-محمود احمد، ۳-عرفان احمد، ۴-غفران احمد
ہم شیرہ	۱-محفوظہ خاتون، ۲-صالحہ تبسم
شادی	۲۷/اکتوبر ۱۹۹۵ء
شریک حیات	محترمہ صوفیہ خاتون
اولاد	دو بیٹے-فارض امان (نصران)، ریان احمد ایک بیٹی-ہبہ رمّان
ابتدائی تعلیم وتربیت	دینی ماحول میں گھر پر ہی ہوئی۔
باقاعدہ تعلیم	جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ۔
درجۂ چہارم (ابتدائی)	۲۵/نومبر ۱۹۷۴ء، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ میں داخلہ ہوا۔
ثانوی (مولوی)	۱۹۸۱ء، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، فرسٹ ڈویژن کے ساتھ مکمل کیا۔
عالمیت	۲۳/فروری ۱۹۸۳ء، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچی۔

قابل ذکر اساتذہ (جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ)	مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ، مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ، مولانا صغیر حسن اصلاحیؒ، مولانا نظام الدین اصلاحیؒ، ماسٹر عبداللہ وغیرہم۔
بی اے (معاشیات)	۱۹۸۳ء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں داخلہ ہوا۔ ۱۹۸۵ء میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ کورس مکمل ہوا۔
پری طب (بی یو ایم ایس)	۱۹۸۵ء، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں داخلہ ہوا۔ ۱۹۹۲ء میں بی یو ایم ایس فرسٹ ڈویژن کے ساتھ مکمل ہوا۔
ایم ڈی علم الادویہ	۱۹۹۲ء، شعبۂ علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں داخلہ ہوا۔ ۱۹۹۵ء میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ کورس مکمل ہوا۔
لیکچرر	۲۷/جنوری ۱۹۹۷ء تا ۲۶/نومبر ۲۰۰۶ء، شعبۂ علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ریڈر	۲۷/جنوری ۲۰۰۶ء، تا ۲۶/جنوری ۲۰۰۹ء، شعبۂ علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
اسوشئیٹ پروفیسر	۲۷/جنوری ۲۰۰۹ء، تا ۲۶/جنوری ۲۰۱۲ء، شعبۂ علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
پروفیسر	۲۶/نومبر ۲۰۰۷ء تا ۲۹/نومبر ۲۰۰۹ء نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور
پروفیسر	۲۷/جنوری ۲۰۱۲ء، تا ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء (تاحیات)، شعبۂ علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دوران طالب علمی قیام	جوبلی ہوسٹل، وقار الملک (وی ایم) ہال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
دوست واحباب	پروفیسر محمد سمیع اختر فلاحی، ڈاکٹر مجاہد الاسلام، محمد احمد، محی الدین ساجد، ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی، ڈاکٹر مظفر الاسلام، پروفیسر بدرالدجیٰ خان، پروفیسر تنزیل احمد، پروفیسر تفسیر علی، پروفیسر جلیس احمد، ڈاکٹر شعیب احمد، ڈاکٹر ظفر الحق، ڈاکٹر حافظ صباح الدین، ڈاکٹر محمد عارف اصلاحی، ڈاکٹر مرغوب احمد انصاری، پروفیسر عابد علی انصاری، پروفیسر اشہر قدیر، ڈاکٹر حافظ ارشاد (سابق ایم ایل اے) وغیرہم
رفقاء درس	پروفیسر طارق احسن، پروفیسر جلیس احمد، ڈاکٹر محمد تقی۔ (شعبۂ علم الادویہ)
اساتذہ (طبی تعلیم)	حکیم سید ظل الرحمٰن، حکیم سید ایوب علی قاسمی، پروفیسر محمد آصف، پروفیسر سعد الحسن آفاق، پروفیسر کنور محمد یوسف امین، پروفیسر حکیم نعیم احمد خاں، وغیرہم۔
تدریسی مصروفیات	☆ بی یو ایم ایس کی سطح پر صیدلہ (یونانی فارمیسی) کی تدریس ☆ ایم ڈی کی سطح پر ریسرچ میتھڈولوجی اور صیدلہ و تکلیس کے ساتھ ادویہ مفردہ مع جدید اضافات کی تدریس
تدریسی وتحقیقی تجربات	۲۴ رسال
طلبہ کے تحقیقی کام	۳۸ (طلبہ تھیسس ورک میں بطور سپروائزر و کوگائیڈ)
کتب	۱- اوصافِ ادویہ-ضمانت سے محاسبہ تک، شریف پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ ۲-اصول دواسازی (غیر مطبوع)
کتابی ابواب (چیپٹرس)	1- Medicinal Importance of Climbers Used in Unani Medicine. In Biotechnological strategies for the conservation of medicinal and ornamental climbers, Springer, Switzerland. (65-100). 2- Therapeutic potential of Rhizomatous Medicinal plants used in Unani Medicare System. In Bio-active Compounds, September 2019, Springer (DOI 10.1007/978-981-13-7205-6_17)

تحقیقی مقالے	۱۰۰ سے زائد
شعبہ کی صدارت	☆ شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۲۰۲۱ء تاوفات) ☆ شعبۂ علم الادویہ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۷ء-۲۰۰۹ء)
پروجیکٹ	Development of Pharmacopoeal Standard of ISM Drugs (Both single and compound drugs). Under Central Scheme of APC Govt. of India, Ministry of Health & Family Welfare, Dept. of ISM & H, New Delhi.
پروجیکٹ کو آرڈینیٹر	ڈی آر ایس۔۲ (DRS-II)، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) (۲۰۱۷ء-۲۰۲۲ء)
صدر کمیٹی	☆ ادارہ جاتی تحقیقی اخلاقیات کمیٹی، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۷ء-۲۰۰۹ء) ☆ حیوانی تحقیق کی اخلاقیات کمیٹی، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۷ء-تاحال)
اکیڈمک انچارج	نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۷ء-۲۰۰۹ء)
ڈپٹی ڈائریکٹر (انچارج)	نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۸ء-۲۰۰۹ء)
نوڈل آفیسر	برائے نیک (NAAC) فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
جوائنٹ ڈائریکٹر	مرکز برائے ترقی سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (جولائی، ۲۰۱۹ء)
صدر	انوویشن اینڈ پیٹینٹ سیل، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۲۰۲۱ء) اِنکوبیشن سینٹر، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۲۰۲۱ء)
ایکسپرٹ ممبر	ڈرافٹ کمیٹی برائے اشاعت طبی اصطلاحات، تشکیل شدہ بذریعہ عالمی ادارۂ صحت (WHO)۔ جنوری ۲۰۰۹ء

اعزازات	۱- **حکیم احمد اشرف میموریل نیشنل ایوارڈ:** منجانب حکیم احمد اشرف میموریل سوسائٹی، حیدرآباد۔ ۹/اگست ۲۰۰۹ء ۲-**انسٹی ٹیوشنل ایوارڈ:** انٹرنیشنل کانفرنس آن ملٹی ڈسپلنری ہیلتھ کیئر، آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (ایمس)، نئی دہلی۔ ۴/جنوری ۲۰۱۴ء ۳-**بیسٹ یونانی اسکالر ایوارڈ:** منجانب آئی ایچ ایف، بمقام جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۱۹/فروری ۲۰۱۶ء ۴-**بیسٹ ٹیچر ایوارڈ (ڈرگ ریسرچ زمرہ، یونانی طب):** وزارتِ آیوش، حکومت ہند، نئی دہلی، بمقام حیدرآباد۔ ۱۱/فروری ۲۰۱۷ء ۵-**لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ (بیسٹ ریسرچ) (ریسرچ و تحقیق زمرہ، یونانی ادویہ):** وزارتِ آیوش، حکومت ہند، نئی دہلی، بمقام پوسا کیمپس، نئی دہلی۔ ۱۱/فروری ۲۰۱۸ء
کمیٹیوں کی ممبرشپ	☆ فارماکوپیا کمیٹی، وزارت آیوش، حکومت ہند، نئی دہلی ☆ انڈین فارماکولوجیکل سوسائٹی ☆ یونانی میڈیسن کی ابتداء کیے جانے سے متعلق کمیٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ☆ بورڈ آف ریسرچ اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی ☆ ادارہ جاتی تحقیقی اخلاقیات کمیٹی، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور ☆ حیوانی تحقیق کی اخلاقیات کمیٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ☆ آیورویداور یونانی امراض کی اصطلاحات کو امراض کی بین الاقوامی درجہ بندی (IDC-11) میں شامل کیے جانے سے متعلق کمیٹی (برائے روایتی طب)، وزارت آیوش، حکومت ہند، نئی دہلی ☆ ٹاسک فورس، ٹی کے ڈی ایل، سی ایس آئی آر، نئی دہلی، ۲۰۱۷ء تاوفات ☆ ریسرچ کوآرڈینیشن کمیٹی، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو کا دورہ	سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو میں ۲۶-۲۹/اکتوبر ۲۰۱۷ء میں آیورویدا، یونانی، سدھا اور دیگر روایتی طب کی ترویج وترقی اور عالمی سطح پر روایتی طبوں کی اہمیت اور مقبولیت سے عوام کو روشناس کرانے کے لیے منعقد عالمی کانفرنس میں یونانی طب اور دیگر روایتی طبوں کی اہمیت اور ان کے محفوظ اور کارگر طریقۂ علاج پر کلیدی خطبہ۔
موریشس کا دورہ	یونانی طب کو متعارف کرنے، اس کے فروغ کے امکانات کا جائزہ لینے اور اسے عملی شکل میں لانے کے لیے جامع لائحۂ عمل پیش کرنے کے لیے ۱۰-۱۷/فروری ۲۰۱۹ء موریشس کا ہفت روزہ دورہ۔ (اس کا اہتمام امریکی ادارہ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ (IIIT,USA) کے تعاون سے مشترکہ طور پر موریشس کی دو معروف سماجی تنظیموں ہیومن ویلفیر لیگ (HWL) اور اسلامک میڈیکل اینڈ الائیڈ ہیلتھ پروفیشنل ایسوسی ایشن (IMAHPA) نے کیا تھا۔) ۷/لکچرس، ۳/راؤنڈ ٹیبل ٹاک، ۴/اسکولوں میں خطاب، میڈیا اور مختلف اخبارات کو انٹرویوز
البلاغ اکیڈمی، لندن، آن لائن لکچر سیریز	۲۰۲۱ء میں البلاغ اکیڈمی، لندن کے ذریعہ یونانی میڈیسن کو عالمی سطح پر متعارف کرنے کے لیے ایک آن لائن سرٹیفکیٹ کورس کا انعقاد کیا گیا تھا اس میں یونانی طب پر متعدد لکچرس دیے۔
وفات	۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء بروز جمعہ بمطابق ۱۷/رمضان ۱۴۴۲ھ

☆☆☆☆☆

ISSN:2454-4507

ظلمتِ شب میں تاروں کا پیکر تھا وہ

پروفیسر عابد علی انصاری عابدؔ☆

بام پر طب کے ماہِ منوّر تھا وہ
ظلمتِ شب میں تاروں کا پیکر تھا وہ

اس کے جانے سے کتنا خسارہ ہوا
اہلِ فن کا بھی دل پارہ پارہ ہوا
اس کا طرزِ تکلم بہت خوب تھا
بات جو بھی کرے اس سے مرعوب تھا
ادویہ کا درخشندہ شہپر تھا وہ
ظلمتِ شب میں تاروں کا پیکر تھا وہ

اس کے شاگردوں میں اس کی پرچھائی ہے
اس نے جاکر بھی اک زندگی پائی ہے
مطمئن اپنی تصنیف سے جب ہوا
بس اسی وقت رب کا بلاوا مِلا
اپنے فن کے تعلق سے مضطر تھا وہ
ظلمتِ شب میں تاروں کا پیکر تھا وہ

کیسا ماہر تھا وہ اپنے مضمون کا
اس کی تحریر نشہّ تھی افیون کا
محفلوں کی وہ رونق تھا وہ جان تھا
سب سے ملتا تھا وہ نیک انسان تھا
حسن تخلیق کا کیسا مظہر تھا وہ
ظلمتِ شب میں تاروں کا پیکر تھا وہ

مجھ کو مغموم کرتی ہیں یادیں تری
خوں رلاتی ہیں ہر آن باتیں تری
آنکھ ہوتی ہے پُرنم ترے ذِکر سے
فون مجھ کو کرے کون اُس فکر سے
میرا ایمن تھا وہ میرا ایسر تھا وہ
ظلمتِ شب میں تاروں کا پیکر تھا وہ

مغفرت ہو تری رب سے ہے یہ دعا
تجھ کو جنت میں اعلیٰ جگہ ہو عطا
تیرے گھر پہ ہو رحمت یوں سایہ فگن
تیرے بچے ترقی کے چھوئیں گگن
سب کی عابدؔ نگاہوں کا محور تھا وہ
ظلمتِ شب میں تاروں کا پیکر تھا وہ

☆ پروفیسر وصدر، شعبۂ ماہیت الامراض، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور، کرناٹک۔ Mob.No:8088122328، E-mail:abidalialig96@gmail.com۔

پروفیسر غفران احمد کی کچھ اہم ایوارڈس حاصل کرتے ہوئے چند یادگار تصاویر

۱۱/فروری۲۰۱۸ء یوم یونانی طب کے موقع پر مرکزی کونسل برائے تحقیقات طب یونانی، وزارتِ آیوش، حکومت ہند، نئی دہلی
کے ذریعہ یونانی ادویہ میں ریسرچ اور تحقیق کے لیے بطور بیسٹ ریسرچر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے

۱۱/فروری۲۰۱۷ء یوم یونانی طب کے موقعہ پر مرکزی کونسل برائے تحقیقات طب یونانی، وزارتِ آیوش، حکومت ہند، نئی دہلی
کے ذریعہ یونانی طب میں ڈرگ ریسرچ زمرہ میں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے

۲۰۰۹ء میں حکیم احمد اشرف میموریل سوسائٹی، حیدر آباد کی جانب سے
حکیم احمد اشرف میموریل نیشنل ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے

مختلف مواقع پر لی گئی چند یادگار تصاویر

مختلف مواقع پر لی گئی چند یادگار تصاویر

Volume 8, Issue 1-2 January-December 2021 ISSN: 2454-4507

Tarjuman-e-Tib

(A peer reviewed bi-annual Urdu journal of Unani Medicine)

Special Issue

Prof. Ghufran Ahmad
(25.12.1964-30.04.2021)

Published by
NATIONAL INSTITUTE OF UNANI MEDICINE
(An autonomous organization under Ministry of AYUSH, Govt. of India)
Kottigepalya, Magadi Main Road, Bengaluru - 560 091
Phone: 080-23584260, E-mail: tarjumanetibnium@gmail.com
Website: www.nium.in